منتخب ایشیائی اردو سفرناموں میں تاریخی عناصر: تحقیق تنقید

(آغاز تا ۲۰۱۵ء)

Historical Elements in Asian Selective Urdu Travelogues: Research and Criticism

(From Beginning To 2015)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو

محقق

نجابت حسین

رجسٹریشن نمبر: 49FLL/PHDURD/F-14

نگران

صدرِ شعبۂ اردو

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ستمبر ۲۰۲۲ء

International Islamic Univ...
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD.

Accession No TH25367

PhD
915
ن ج م

اردو ادب - سفرنامہ

" - " - ایشیا

" - " - " - " - تحقیق و تنقید

اقرار نامہ

میں، نجابت حسین، رجسٹریشن نمبر 49/FLL/PHDURD/F14 میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ مقالہ "منتخب ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر: تحقیق و تنقید" میں پیش کیا گیا کام ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے پی ایچ۔ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر سید کامران کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں سے ڈگری کے حصول کے لیے نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔ نیز یہ کہ مقالہ ہذا سرقہ سے پاک ہے۔

نجابت حسین (پی ایچ ڈی سکالر)
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ نجابت حسین ، رجسٹریشن نمبر 49/FLL/PHDURD/F14 سکالر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد اپنا مقالہ بعنوان "منتخب ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر: تحقیق وتنقید" برائے پی ایچ۔ ڈی اردو، میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس موضوع پر کہیں اس طرح کا کام نہیں ہوا اور یہ سرقے سے پاک ہے۔

صدرِ شعبۂ اردو، ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور پی ایچ ڈی اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"منتخب ایشیائی اردو سفرناموں میں تاریخی عناصر، آغاز تا ۲۰۱۵ء: تحقیق و تنقید"**

مقالہ نگار: نجابت حسین

رجسٹریشن نمبر: 49-FLL/PHDURDU/F14

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر عابد سیال
ایسوسی ایٹ پروفیسر
نمل، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر شیر علی
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی ایم سی بی، ایف۔۱۰/۴
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
چیئر پرسن، شعبہ اردو/فارسی

اگست، 2022ء

فہرستِ موضوعات

نمبر شمار	موضوعات	صفحہ نمبر
1-	پیش لفظ	1
2-	**باب اوّل:**	4
	اردو سفرنامہ تعارف وروایت، ایشیا کی تاریخ وجغرافیہ کے مباحث	4
	الف: سفرنامہ نگار، تاریخ نویسی: تعریف وتوضیح	4
	ب: ایشیا کا جغرافیہ، وجہ تسمیہ اور اہم حصے تعارف	24
	ج: سفرنامہ نگاری اور تاریخ نویسی کے فنی، فکری اور اسلوبی مباحث	33
	د: منتخب ایشیائی اردو سفرنامے: تعارف، روایت اور تاریخی عناصر کی اہمیت	47
3-	**باب دوم:**	88
	انیسویں صدی کے منتخب ایشیائی اردو سفرناموں میں سیاسی وسماجی تاریخی عناصر (آغاز تا 1900ء)	88
الف:	اردو سفرنامے اور نوآبادیات کا آغاز تاریخ کے تناظر میں: پس منظری مطالبہ	88
ب:	اردو سفرنامے جنگِ آزادی کے بعد، سامرانی حکومتیں: سیاسی وسماجی تاریخ کا تقابلی مطالعہ	114
ج:	جنوبی ایشیا کے ممالک کی عملی وادبی صورتِ حال، اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر	128
د:	منتخب ایشیائی اردو سفرنامے میں سیاسی اور سماجی تاریخ کے عناصر اور مضمرات	132
4-	**باب سوم:**	144
	بیسویں صدی کا آغاز اور ایشیائی اردو سفرناموں میں تاریخی عناصر (1901ء1947ء)	144
الف:	بیسویں صدی کا آغاز اور تاریخی شعور: اردو سفرنامے کے تناظر میں	144
ب :	ایشیائی ممالک میں قومیت پرستی کا شعور، آزادی کی تحریکیں اور سامراج کے خاتمے کے آثا	148
ج:	ایشیائی ممالک میں معاشی صورتِ حال نوآبادیات کے زیرِ اثر: تاریخی عناصر کا تقابلی مطالعہ	192
د:	ایشیائی ممالک کی آزادی تحریک: منتخب ایشیائی سفرناموں کے تناصر میں مجموعی جائزہ	201

5- **باب چہارم:** 206

ایشیائی ممالک میں آزادی کے مرحل اردو اردو سفر ناموں میں تاریخی عناصر (1947ء2015ء) 206

الف: جنوبی ایشیائی ممالک کی مرحلہ وار آزادی واسباب وواقعات، تاریخی عناصر 208

ب: دیگر ایشیائی ممالک پر ممالک آزادی کی تحریکوں کے اثرات ونتائج: اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر 217

ج: برصغیر کی آزادی، تقسیم، سیاسی وسماجی صورتِ حال: اردو سفر نامے کے تاریخی عناصر 226

مذکورہ دور کے منتخب ایشیائی سفر ناموں میں تاریخی عناصر کا تفصیلی جائزہ 263

6- باب پنجم 285

ماحصل: 285

الف: منتخب ایشیائی اردو سفر ناموں میں تاریخی عناصر کا مجموعی جائزہ 285

ب: نتائج اور سفارشات 292

7- کتابات

پیش لفظ

اردو سفرنامے پر یوں تو کئی موضاعات پر تحقیقی کام ہو چکا ہے اور کئی ایک موضوعات زیرِ تحقیق ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ: ''منتخب ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر: تحقیق وتنقید'' اپنی نوعیت کا ایک منفرد تحقیقی مقام ومرتبہ رکھتا ہے۔ مقالہ ہذا کی تحقیق میں جہاں اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر زیرِ بحث ہیں۔ وہاں پر براعظم ایشیا کی تاریخ میں تحقیق کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ اردو سفرنامے میں تاریخی واقعات سفرنامے کی روشنی میں پرکھنے سے تاریخ کے ایسے دریچوں سے پردہ اُٹھا ہے جن سے اس سے پہلے آگاہی نہیں تھی۔ مقالہ ہذا کے باب اوّل میں سفرنامے کے معنٰی، مفہوم اور تعارف؛ تاریخ، تاریخیت کے بیانیے اور تاریخی واقعات، جغرافیہ، برِاعظم ایشیا کا تعارف اور ایشیائی اردو سفرنامے کی روایت تاریخی عناصر کے لحاظ سے ترتیب کے ساتھ زیرِ مطالعہ لائے گئے ہیں۔ آخر پر سفرنامے کی روایت دی گئی ہے جس میں ایشیائی تاریخی عناصر موجود ہیں۔ باب دوم میں سفرنامے کی ابتدا سے انیسویں صدی کے اختتام تک تفصیلات مہیا کی گئی ہیں۔ ان تفصیلات کے ساتھ نوآبادیاتی عہد کا پس منظر بھی زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے۔ پھر ابتدائی دور کے سفرناموں کے تاریخی عناصر کو ایشیا کی تاریخ کے حوالے سے پرکھا گیا ہے۔ باب سوم میں بیسویں صدی تا برِصغیر کی آزادی سے پہلے تک کے سفرناموں کا تجزیہ تاریخی واقعات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر باب میں خاص طور پر تقسیمِ بنگال، مسلم لیگ کا قیام، ریشمی رومال تحریک، تحریک خلافت، آر ایس ایس، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے واقعات سفرنامے کی روشنی میں زیرِ بحث ہیں۔ باب چہارم میں ایشیائی ممالک کی آزادی سے لے کر موجودہ دور یعنی ۲۰۱۵ء تک کے اردو سفرناموں کو تاریخی حوالے سے زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے مراحل کا پس منظر، جاپان کی اجارہ داری کا خاتمہ، پاک وبھارت جنگ ۱۹۶۵ء کی جنگ، بھارت چین جنگ، مکتی باہنی، سقوطِ ڈھاکہ، افغانستان کا جہاد، روس کی طاقت کا خاتمہ اور طالبانائزیشن جیسے تاریخی عناصر سفرنامے کی رو سے زیرِ بحث آئے ہیں۔ نیز مقالہ ہذا کے آخر میں تحقیق کے ماحصل دیے گئے ہیں جن کے بعد محققین اور قارئین کی خدمت میں چند سفارشات وگزارشات پیش کی گئی ہیں۔

مقالہ ہذا لکھنے کے دوران میں جن مشکلات اور مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ ایسی مشکلات تحقیق کا اہم حصہ ہوتی ہیں۔ تحقیقی مواد کی تلاش اور تحقیقی کام کی ترتیب وتنظیم کے دوران متعدد اعلیٰ رتبہ ادبی اور عملی شخصیات نے نہ صرف رہنمائی فرمائی، بلکہ مقالہ کی تسوید کے دوران مفید مشورے بھی دیے، متعلقہ مواد کی کتب کی نشاندہی کی اور نادر قسم کی معلومات بھی باہم پہنچائیں۔ ایسی شخصیات ہر چند تحسین وتعریف اور بے حد شکریے کی مستحق ہیں۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تکمیل صدرِ شعبۂ اُردو، ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی صاحب کی زیرِ نگرانی میں عمل میں آئی ہے۔ اس سلسلے میں راقم ان کا دل کی گہرائیوں سے احسان مند ہے کہ انھوں نے ہر مرحلے پر رہنمائی اور دل جوئی فرمائی کی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ندیم اسلم (روش ندیم) کا بے حد شکریہ

کہ انھوں نے نہ صرف بہترین مشورے دیے بلکہ مقالہ ہذا کی تسوید و تنظیم کے لیے تیکنیکی رہنمائی بھی کی۔ڈاکٹر سہیل عباس کا انتہائی شکریہ کہ انھوں نے آزادی سے پہلے کی کتب پی ڈی ایف میں ارسال کیں۔ جب انھوں نے کتب ارسال کیں تو وہ جاپان میں موجود تھے۔ ڈاکٹر، پروفیسر بلال سہیل، صدرِ شعبۂ اُردو، ایف جی پوسٹ گریجویٹ سرسید کالج مال روڈ، راول پنڈی کے سربراہ، کالج ہذا کے وائس پرنسپل صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ناچیز کو نہ صرف املا سازی کی معلوم میں لسانی بنیادوں پر مشورے دیے بلکہ انھوں نے راقم کی سست روی کو ختم کر کے مقالہ کی تسوید کے مراحل کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ ان کے اہم اور ناقابلِ فراموش کردار پر ان کا بے حد ممنونِ احسان ہوں۔ اظہار تشکر اور ڈھیروں دعائیں، اللہ انھیں غریقِ رحمت فرمائے، ڈاکٹر طیب منیر صاحب جن کی شفقت سے مقالہ نگار محروم رہ گیا کہ رحلت سے پہلے وہی مقالہ نگار کے نگران تھے۔ یہاں اس بات کا ضرور ذکر کروں گا کہ مقالہ نگار نے بورڈ آف سٹیڈی کے لیے ان کی نگرانی میں یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کا خاکہ جمع کرایا تو اس کے صرف آٹھ دن بعد ایک حادثہ میں ان کی وفات ہوگئی۔ میں ان کی شفقتِ اساتذی سے محروم رہ گیا۔ تاہم صدرِ شعبۂ اردو، ڈاکٹر، سید کامران کاظمی عباس صاحب نے اس ناچیز کی رہنمائی کا ذمہ لیا اور مقالہ ہذا انھی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم جماعت سکالر ادریس دورانی کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ہر مرحلے پر حوصلہ افزائی بھی کی اور اہم معلومات بھی باہم پہنچائیں۔ اسحاق صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے نہ صرف مقالہ کی تسوید میں تکنیکی رہنمائی کی بلکہ ہمیشہ ناچیز کے لیے ہمدردی کے بول بولے۔

مقالہ نگار اپنے بڑے بھائی صاحب، جاوید اختر کا ایک بار پھر شکر گزار ہے کہ اگر وہ تعلیمی میدان میں میری معاونت نہ کرتے تو آج میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہوتا اور پی ایچ ڈی کے بارے میں سوچنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جناب پروفیسر محمد شناذر صاحب، انگریزی زبان و ادب کے شاعر اور ادیب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے بھی اسی زمانے میں میری بھرپور تعلیمی سرپرستی کی۔ جناب پرویز اختر کا شکریہ کہ انھوں نے مشکل حالات میں اُس وقت مدد کی جب راقم کو معاشی معاملات اور تعلیمی واجبات کی مشکلات کو درپیش تھیں۔ میں محمد ایوب ظفر صاحب اور محترمہ مسز ایوب ظفر کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے پی ایچ ڈی سکالر کو نہ صرف پہلے ہی سے ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا بلکہ مقالہ نگار کی کامیابی کے لیے تہہِ دل سے دعائیں بھی کیں۔ جناب انوار الحق اشرف صاحب کے بھی زیرِ احسان ہوں کہ انھوں بھی حسب سابق خطاب دیا اور مقالہ نگار کے لیے حتیٰ القبول دعائیں بھی کیں۔ جناب دیدار علی صاحب کا بے حد ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے میری کامیابی کے لیے ہزاروں لاکھوں دعائیں کیں۔ جب مقالہ نگار نے جامعہ میں مقالہ جمع کرایا تو ان کی بھرپور اخلاقی معاوت میرے ساتھ تھی۔ لیکن وہ دل کے مریض تھے، بہت جلد مجھ سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر تاحدِ نظر روشن فرمائے اور قبر کی منزلیں آسان فرمائے۔ میں اپنے ایسے احباب کا بھر شکرگزار ہوں جنھوں نے میری کسی نہ کسی طرح رہنمائی اور معاونت کی۔

آخر پر میں اپنے گھر کے افراد کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مقالہ ہذا کی تسوید کے دوران مقالہ نگار کو ہر قسم کی پریشانی اور بے چینی سے دور رکھا، شدید معاشی دباؤ کی پیشِ نظر بھی بھر پور تعاون کیا۔ میرے اہل خانہ تحقیقی کام کی مصروفیات کے پیشِ نظر زندگی کی بے شمار آسائشوں سے محروم رہے۔ اس دوران میری والدہ شدید علالت کی صورت حال سے دوچار رہی راقم انھیں وہ توجہ نہ دے سکا جتنی توجہ کے اہل خانہ مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ والدہ کے درجات بلند کرے انھیں غریقِ رحمت کرے اور قبر تا حدِ نظر منور فرمائے۔ اپنے والد صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جن کی دعاؤں کی وجہ سے میں آج اس مقام تک پہنچا ہوں۔ مرحومہ پھوپی جان، زرینہ بی کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ ہر لمحہ میری کامیابی کے لیے دستِ دعا بلند رکھتی تھیں۔ حاجی محمد اقبال، اپنے سسر جان کے لیے ہزاروں دعائیں کہ آج وہ زندہ ہوتے تو مجھے کامیابی سے ہم کنار دیکھ کر ان کی خوشی اور مسرت کی انتہا نہ رہتی۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ مقالہ نگار اپنی بیوی اور بچوں کا بھی ممنونِ احسان اور شکر گزار ہے کہ انھوں نے مقالہ کی تسوید کے دوران جن نا قابلِ فراموش مشکلات کا سامنا کیا۔ بیگم عمرانہ کوثر نے آسائشوں سے محرومیوں کا شکوہ کیے بغیر اپنے فرائض نبا ہے۔ دختر وھیبہ نجابت کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے راقم کی خدمات کے لیے بھی وقت نکالتی رہی اور اپنے تعلیمی معاملات کو بھی بھر انداز میں جاری رکھا۔ میری بیٹی صالحہ نجابت مقالہ کی تسوید کے دوران لیپ ٹاپ کو تیار کرتی، کتابیں ترتیب دے کر میرے لیے کام کو مزید آسان بنا دیتی، میں اس کا بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ میر بیٹا سعد عبداللہ چغتائی، اگر چہ ابھی کم سن ہے مگر اُس نے بھی اس دوران میری خدمت میں کمی نہ چھوڑی، میں اس کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ اور میں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی ماہ نور فاطمہ کا اس لیے شکر گزار ہوں کہ اسے میری دقتوں کی جب سمجھ آ گئی تو اُس نے مجھ سے کبھی بھی اپنی معصوم تمناؤں کی تکمیل کے لیے زد نہ کی۔ حالاں کہ راقم اس کے کھلونوں اور گڑھیوں کے سلسلے میں ابھی تک اس کا مقروض ہے اور اسے تسلیاں اور بھروسے دیتا رہتا ہے، راقم اس ننی پری کا ڈھیروں محبتوں اور شفقوں کے ساتھ ممنونِ احسان ہے۔

نجابت حسین (پی ایچ ڈی سکالر)
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

باب اوّل

اردو سفرنامہ تعارف و روایت، ایشیا کی تاریخ و جغرافیہ کے مباحث

الف: سفرنامہ نگاری، تاریخ نویسی: تعریف و توضیح

سفرنامہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ قدرتی مناظر کی پیش کش، تہذیب و ثقافت کے رنگ، تاریخی مقامات کی سیاحت کا ذکر، سیاسی اور سماجی تاریخ کی معلومات ملتی ہے۔ سفرنامہ کسی سیاح کی سفر کے حوالے سے لکھی ہوئی تحریری تفصیل ہے جو سفرنامہ نگار کی آپ بیتی یا سفر کی روداد کے انداز میں ہوسکتی ہے۔ ادبی حیثیت سے آپ بیتی بذاتِ خود الگ سے ایک صنف ہے۔ سفرنامے کی تحریر میں آپ بیتی کا کسی قدر اثر ہوسکتا ہے۔ ایک سفرنامہ نگار، سفرنامے میں اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو تحریر کرتا ہے۔ جب وہ حالات و واقعات لکھ رہا ہوتا ہے تو وہ بذاتِ خود شاملِ حال ہوتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں بھی لاشعوری طور پر لکھ رہا ہوتا ہے۔ یوں کسی مصنف کی آپ بیتی اُس کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے۔ خاص طور پر سفرنامے میں آپ بیتی کا انداز بھی عمل پیرا ہوتا ہے۔ اگر آپ بیتی کو سفرنامے کی تحریر سے لگ پرکھا جائے تو جائے تو آپ بیتی: ''سوانح کی وہ قسم ہے جس میں کوئی خود اپنی سوانح کہتا ہے اس کی ابتدائی مثالیں وہ ہیں جن میں کوئی اہل قلم ایک آدھ صفحے میں اپنی سوانح کے کسی جزو کو بیان کر دیتا تھا مثلاً باغ و بہار میں امیر امن کے حالات۔''(۱) سفرنامہ میں سفرنامہ نگار کی زندگی کا ایک پہلو ہوتا ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے ایک وسیع تجربے اور مشاہدے کو بیان کرتا ہے۔ سفرنامہ خالص آپ بیتی نہیں ہے بلکہ سفرنامہ، آپ بیتی سے الگ ایک تحریر ہے جس میں مصنف کی زندگی کے کچھ حالات واقعات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ گیان چند جین کی رائے کو دیکھا جائے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے بیان کی تائید کرتے ہیں کہ: ''سفرنامہ کو آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ سفرنامہ آپ بیتی سے جدا کی گئی ایک قاش کے مماثل تو ہے لیکن نری آپ بیتی نہیں۔''(۲) ناقدین کے یہاں آپ بیتی اور سوانح کے بارے میں

الگ الگ آرا ہیں، جو اپنی جگہ مستند ہے۔ ڈاکٹر سہل خان آپ بیتی کو ہی سوانح قرار دیتے ہیں ان کے مطابق Autobiography:''اپنی زندگی کا احوال آپ قلم بند کرنے کا عمل خود سوانح ہے۔ سیدھے لفظوں میں اسے آپ بیتی کہہ لیجیے۔''(۳) حقیقت میں آپ بیتی کا الگ سے اپنا ایک وجود ہوتا ہے جس میں کسی شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مکمل احاطہ ہوتا ہے۔ سفر نامے میں زندگی کے کچھ پہلوؤں کا ذکر ہونے کا امکان ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی مصنف آپ بیتی لکھتے وقت اپنے سفر کے کچھ واقعات کو آپ بیتی میں شامل کر لیتا ہے۔ اس طرح سفر نامے کو آپ بیتی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ آپ بیتی کی فنی نقطۂ نظر سے تعریف کرتے ہوئے عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ:''خود پر بیتے ہوئے حالات کے ذکر کو آپ بیتی کہتے ہیں۔ بن باس کی زندگی۔ قید کے حالات، نظر بندی کے دور کے حالات اور واقعات کا ذکر بھی آپ بیتی کے ذریعے ممکن ہے۔ فنی اعتبار سے آپ بیتی ایک ایسی تحریر ہے جس میں خود پر گزرے ہوئے اچھے اور بُرے حالات، صدمات اور تاثرات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔''(۴) یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ بیتی کا ادب میں الگ مقام و مرتبہ ہے اور سفر نامے کی الگ اپنی ایک حیثیت ہے۔ سفر نامہ آپ بیتی کے زیادہ قریب نہیں ہے بلکہ روداد کے اثرات سفر نامے پر زیادہ ہیں۔ اس لیے سفر نامے کو روداد یا رودادِ سفر کہنا ایک طرح سے درست ہے کیوں کہ رودادِ سفر میں:

> دوسرے مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اس میں تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، معاشیات سبھی کی پٹ ہوتی ہے۔ اس میں دوسروں کی ادبی تقریبوں اور ہنگاموں کا بیان عام ہو گیا ہے۔ چوں کہ آج کے اردو والوں کو بڑی تعداد میں باہر جانے کے مواقع مل رہے ہیں اس لیے اب سفر نامے بیرونی ممالک سے مخصوص ہو گئے ہیں۔ ویسے یہ صنف انیسویں صدی ہی سے ملتی ہے۔(۵)

سفر نامے اور روداد کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ:''کسی تقریب کی کاروائی کا قرار واقعی ادبی جذباتی بیان روداد کہلاتا ہے۔ ایک انشائیہ نگار اسے بیان کرے تو ایک افسانوی، شخصی، ادبی رنگ سے بیان کرے گا۔ یہ رپورٹ ہے جو تخلیقی ادب پارہ ہوتا ہے۔ یہ کسی تقریب، تقریب سے متعلق سفر، کسی واقعے کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے۔''(٦) یہاں یہ دیکھنا بھی مقصود ہے کہ روداد کا سفر نامے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ یوں تو سفر نامہ خود اپنے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ روداد، سفر نامے پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ مگر نہ ہی تو سفر نامہ روداد ہے اور نہ روداد سفر نامہ ہے۔ عبدالرحمٰن نوری نے روداد کی تعریف یوں کی ہے کہ:''کسی جلسہ، محفل، کانفرنس، سمپوزیم، مشاعرہ یا اس نوعیت کی دیگر تقاریب کی مکمل کاروائی قلم بند کی جائے تو اسے روداد کہتے ہیں۔''(۷)

سفر نامے میں سفر کے واقعات کی روداد قلم بند کی جاتی ہے۔ سفر اختیار کرنے والوں میں ادیب بھی ہوتے اور شاعر بھی، سیاست دان بھی ہوتے ہیں۔ نجی زندگی سے متعلق ان تقریبات میں شرکت کے لیے بھی لوگ سفر کرتے ہیں۔ اس طرح جس قسم کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اُن کی روداد الگ سے لکھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شاعر بیرون ملک کسی

مشاعرہ میں شرکت کے لیے سفر کرتا ہے تو جہاں وہ سفر کے دوسرے حالات واقعات تحریر کرے گا۔ وہاں پر وہ سفرنامے میں مشاعرے کی کاروائی کا ذکر بھی کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ، سفر کی ایک روداد بھی ہے لیکن یہ امر کسی سفرنامے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی طے پائے گا کہ سفرنامہ روداد کے زیرِ اثر لکھا گیا ہے یا آپ بیتی کے۔ اردو سفرناموں کی روایت ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے پڑی تھی۔ اس دور کے سفرناموں میں حقائق پر مبنی واقعات، تجربات، مشاہدات اور مناظر کا ذکر کیا گیا۔ بادشاہوں کے خاص مقربین نے روزنامچوں اور ڈائریوں کی شکل میں بھی سفرنامے لکھے۔ انگریزی زبان میں لکھے گئے زیادہ تر سفرنامے ڈائری کے نام سے ہیں۔ اس دور کے سفرناموں میں روایتی قصے کہانیوں سے ہٹ کر حقیقی زندگی کے واقعات پر مبنی سفرنامے کو خاص اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ عبدالرحمٰن نوری کا بیان ہے کہ: ''تجارت، حصول علم تبلیغِ دین، جہاں بانی، سیاسی مقاصد، تلاشِ معاش، مقاماتِ مقدسہ اور اس نوعیت کے کتنے ہی مقاصد ہیں جن کے لیے انسان سفر کرتا رہا اور سفرنامے تحریر کرتا رہا ہے۔'' (۸)

ایسے سفرناموں کی تعداد کم نہیں ہے جو روداد کی صورتوں میں لکھے گئے ہیں۔ ایک سیاح سفر سے لوٹنے کے بعد اپنے سفر کے قصے دوسروں کو سناتا ہے یا پھر تحریر کر لیتا ہے۔ ان دونوں صورت میں سفر کی روداد، واقعات کا ایسا سلسلہ ہوتا ہے جسے سفرنامہ یا سیاحت نامہ کہا جاتا ہے۔ بعض سفرنامہ نگار، سفرنامہ لکھتے وقت رپورٹ نویسی کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن سفرنامے کو خالصتاً رپورٹ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سفرنامہ روداد یا رپورٹ کے سیاق و سباق پر ہو سکتا ہے مگر خالصتاً اسے رپورٹ قرار دینا مشکل عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفرنامہ لکھتے وقت سفرنامہ نگار کے قلم سے کچھ حصے رپوتاژ کی تکنیک میں لکھے ہوئے ہو سکتے ہیں مگر مکمل سفرنامہ رپورتاژ کے انداز میں نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا تجزیہ ہے کہ: ''سفرنامہ واقعات کی تفصیل و تشریح پیش کرتا ہے اور رپورتاژ میں پیش آنے والے واقعات سے لیا گیا تاثر ہے اور اس تاثر کی تخلیق پیش کش میں خارج کی رپورٹنگ کے ساتھ داخلی عناصر اور تخیل کی رنگ آمیزی اضافی عناصر ہیں۔'' (۹) اس طرح سفرنامہ، سفر کی معلومات کا ایسا حصہ بن جاتا ہے جو روداد کے انداز، رپورتاژ کی تکنیک یا آپ بیتی کی ہیئت میں بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں: ''سفرنامہ ایک طرح کی ''روداد'' یا ''رپورتاژ'' ہے جسے آپ بیتی کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔'' (۱۰) رپورٹ کی تعریف کرتے ہوئے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کسی خاص مقصد کے تحت لکھے گئے چشم دید واقعات کی تفصیل کو ہی رپوتاژ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''رپورتاژ فرانسیسی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی رپورٹ ہی کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں رپورتاژ چشم دید حالات و واقعات کی وہ رپورٹ ہے جو اگرچہ معروضی واقعات ہی پر مشتمل ہوتی ہے لیکن مصنف کا تخیل اور واقعات کے بارے میں اس کا موضوعی اور ان واقعات کا ایک بصیرت افروز معنویت اور فکر انگیز فضا پیدا کر دیتا ہے۔'' (۱۱)

ایک سفرنامہ آپ بیتی، سوانح نگاری، روداد یا رپورٹ میں سے کسی ایک کے زیر اثر لکھا ہوا ہوسکتا ہے، خالص تاریخ نگاری کے پیرائے میں بھی ہوسکتا ہے اور قدرتی مناظر کی کا تفصیل کا مجموعہ بھی ہوسکتا ہے اور تہذیبی و ثقافتی معلومات بھی سفرنامے کا حصہ ہوسکتی ہیں۔ اس طرح سفرنامے کے مفہوم میں خاصی وسعت دیکھنے میں ملتی ہے۔ زیادہ تر سفرنامے تاریخ، تہذیب، ثقافت، مذہب اور زبان و ادب کے بارے میں معلومات کو سموئے ہوئے ہیں۔ اردو سفرنامے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف بِراعظموں کے سفر اختیار کرنے کے بعد سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح دنیا کے ساتوں براعظموں میں سفرناموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بِراعظم یورپ کے سفرناموں کی تعداد براعظم ایشیا کے سفرناموں سے زیادہ ہے۔ لیکن بِراعظم ایشیا کی سفرناموں کی تعداد بذاتِ خود بہت زیادہ ہے۔ اس کے بعد امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ کے سفرناموں کی تعداد درجہ بدرجہ ہے۔

سفرنامہ نگار جب سفری تاثرات کو کتابی صورت میں لکھتا ہے تو اسے کتابی صورت میں لکھے گئے متن کو سفرنامہ کہتے ہیں۔ سفرنامہ نگار، سفرنامے کے بہترین مواد کو بہترین ترتیب دے کر ایک عمدہ سفرنامہ لکھے تو اسے ادبی سطح کا سفرنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور بعض اوقات سفرنامہ نگار سفرنامہ لکھتے ہوئے کسی قدر حقیقت سے دور ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں سفرنامہ فکشن کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ یعنی سفرنامہ ناول کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ اردو میں بہت سے ایسے سفرنامہ نگار ہیں جنھوں نے سفرناموں کے پلاٹ میں بھی فکشن کے اجزاء کو برتا ہے۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں کہ: ''ہمارے ہاں عزیز احمد، شفیق الرحمٰن،، سید انور، کرشن چندر اور اے احمید نے سٹیوٹس، ڈی ایچ لارنس، سمرسٹ ماہام اور گراہم گرین کی طرح سیاحت کے پس منظر میں ناول اور افسانے لکھے۔'' (۱۲)

فرخندہ جالی کا ''گرین کارڈ''، اے حمید کا ''رنگون سے فرار'' اور مستنصر حسین تارڑ کے ''نکلے تیری تلاش میں'' ایسے سفرنامے ہیں جن میں کسی حد تک ناول کے پلاٹ کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ امر واضع ہے کہ سفرنامہ فکشن کے زیر اثر بھی لکھا گیا ہے۔ ناول، افسانہ، آپ بیتی اور ڈرامہ وغیرہ نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جہاں سفرنامہ، سیر و سیاحت کے واقعات کا نمونہ دکھائی دیتا ہے، وہاں پر سفرنامہ موجودہ دور میں ادب سے ہم آہنگ ہوتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ عطاالرحمٰن نوری لکھتے ہیں کہ:

> سفرناموں میں داستان کی داستان طرازی، ناول کی افسانہ پردازی، افسانے کی چونکا دینے والی کیفیتیں اور ڈرامہ کی منظر کشی ملتی ہے یعنی فکشن کی تمام اصناف سفرناموں میں ملتی ہیں۔ کرنل محمد خان کی خودنوشت سوانح ''بجنگ آمد'' سفرنامے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ جدید ترین سفرناموں کا رجحان شگفتہ بیانی سے عبارت ہے۔ آج کے سفرنامے گائیڈ بک نہیں بلکہ ادب اور سیاحت کا حسین ترین اظہار بن گئے ہیں۔ (۱۳)

سفرنامے کی تحریر میں یہ بات اہم ہے کہ سفرنامہ تجربات اور مشاہدات کا مجموعہ ہوتا ہے۔سفرنامے میں دی جانے والی معلومات کا انحصار سفرنامہ نگار کی محسوسات پر ہوتا ہے۔جب سفرنامہ نگار کسی ملک کی تہذیب ثقافت، مذہب اور تاریخ کو سفرنامے کا حصہ بناتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ تجربات اور مشاہدات پر داخلی کیفیات اثر انداز نہ ہوں۔سفرنامہ نگار کی محسوسات کا تعلق براہ راست مناظرِ فطرت، تہذیب، ثقافت اور تاریخ سے ہوتا ہے۔ وہ ان محسوسات کو سفرنامے کی شکل دینے کے لیے سفرنامہ تحریر کرتا ہے۔ محققین اور ناقدین نے سفرنامے کی تعریفیں بڑے جامع اور موزوں انداز میں کیں۔لیکن تکنیکی لحاظ سے سفرنامے کی تعریف سامنے نہ آنے کی وجہ مرزا حامد بیگ بتاتے ہیں کہ: ''سفرنامہ واحد نثری صنفِ اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تا حال ممکن نہیں ہو سکا اس میں کچھ سبب ہے کہ سفرنامہ کبھی روزنامچے کے انگ میں لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں۔'' (۱۴)

کسی ادیب کے سفرنامے پر آپ بیتی، روداد، رپوتاژ، ڈائری، سوانح، ناول اور افسانہ کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ان میں سے کسی ایک صنف کا اثر بھی ہو سکتا ہے اور ایک وقت میں ایک سے زیادہ اصناف کا بھی۔لیکن سفرنامہ کی اپنی ہیئت میں خاص فرق نہیں پڑے گا۔اتنا ضرور ہوگا کہ سفرنامہ آپ بیتی، روداد، ڈائری، ناول یا افسانہ کے قریب تر ہو جائے گا۔

سفر (Travel) کی سہولتیں عصر حاضر میں بحری برّی اور ہوائی صورتوں میں موجود ہیں۔بحری سفر سمندر کے ذریعے ہوتا ہے؛ برّی سفر بذریعہ سڑک کار، بس یا ریل گاڑی کے ذریعے طے پاتا ہے اور ہوائی سفر جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ فضائی راستے سے جہاز کے ذریعے طے پاتا ہے۔اس ذریعہ سفر میں، کم وقت میں زیادہ سفر طے ہو سکتا ہے۔تاہم سفر اور سیاحت کے مابین جو موجود فرق ہے، وہ واضح ہو جاتا ہے۔ہوائی جہاز کے ذریعے سفر سے صرف مسافت ہی طے ہو پاتی ہے۔اس صورت میں کسی مقام کی سیاحت کرنا، مطلوبہ مقام پر پہنچ کر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ریل گاڑی اور بس کے ذریعے سفر کرنے سے سفر بھی طے ہوتا ہے، قدرتی مناظر اور ثقافتی عناصر کی سیاحت بھی ہو جاتی ہے۔بحری جہاز کے ذریعے سفر اور سیاحت دونوں واقع ہوتے ہیں۔کئی خطوں اور ملکوں کے ساحلوں پر طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے اور کئی طرح کے حسین مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا مقصود ہو یا کسی طرف پیش قدمی کرنا چاہیں تو سفر کے لیے کوئی سا بھی ذریعہ آمد و رفت اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سیر کا لفظ عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔سیر فی الارض کے الفاظ کا ذکر قرآن پاک میں ہوا۔جس میں لفظ سیر کا مطلب گھومنا پھرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا یا سیاحت اختیار کرنا ہے اور ارض سے مراد زمین ہے جس پر گھومنے پھرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اردو جامع اللغات کی روشنی میں سیر کے معنی تین چار مدارج تک بیان کیے جاتے ہیں:

❖ سیر: (ع) اسم مونث ۱۔ گلگشت، سیر، تفریح، پھرنا، گشت، سیاحت ۲۔ ہوا خوری، چہل قدمی ۳۔ تماشا،

کیفیت(۱۵)

اردو زبان میں سفر کا لفظ بھی عربی زبان سے آیا ہے۔ یہ لفظ بلحاظ جنس مذکر ہے اور عربی زبان کے لفظ اسم مصدر سَفَرَ سے نکلا ہے۔ جامع اللغات میں اس کا مطلب 'مقام پر جانا ہے' اور فرہنگِ آصفیہ میں مطلب 'مسافرت اختیار کرنا' یا 'روانہ ہونا' ہے۔ لفظ سفر کی وضاحت ذیل میں اس طرح ہے۔

❁**سفر:**(ع)مذکر، مسافرت، ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا۔(۱۶)

❁**سفر:**(ع،ف)اسم مذکر مسافرت، جانا، سیاحت، سفر کرنا، فعل متعدی: سیاحت کرنا جاترا کرنا، مسافرت کرنا، روانہ ہونا، کوچ کرنا وغیرہ(۱۷)

لفظ 'سفر' چوں کہ اسم اور فعل دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے، جس سے مُراد ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا، خاص طور پر طویل مسافت پر، مزید یہ کہ بیرونِ ملک افریقہ وغیرہ یا پوری دنیا کا سفر کرنا۔ Advanced Learner's Dictionary میں لفظ سفر کی تفصیل اس طرح ہے کہ:

Travel(verb, noun)(i) to go one place to another especially over a long dictance(ii)to travel abroad/ across africa around the world.(۱۸)

سفر کی طرح لفظ ''سیاحت'' کے معنی بھی فرہنگ آصفیہ میں یوں بیان کیے گئے ہیں۔

❁**سیاحت:**(ع)اسم مونث، سیر و سفر(۱۹)

انگریزی، عربی، فرانسیسی ڈکشنری آف عرابک میں سفر کے معنی میں ''سفر''، ''سیاحت'' اور ''دورہ'' بیان کیے گئے ہیں۔

سَفَرَ: vn. trsvelling ; n journey, trip(۲۰)

سفر عربی زبان کا لفظ ہے اور اسم مصدر ہے اسی طرح لفظ ''مسافر'' بھی اسم مصدر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اَسفر، سَفَر، سَفیر، سِفارت یاسَفارت اور مسافر کے الفاظ کے مجموعی طور پر معنی کی بھی A Freqanecy Dictionary of Arbic, میں اس طرح وضاحت پیش کی گئی ہے۔

سفر:

سافَرَ:v .III to travel الی; to deport)(on a trip)

أسفَرَ:V.IV to result .عن in.cause عن sth

سَفَرَ: vn. traveling n. journey, triip

سَفیر: n. pl. سُفَرَاء embassador

سِفارة/سَفارة:n. pl. aat embassy

مُسافر: n.pl. uun passanger; a .p traveling(۲۱)

سفرنامے کے معنی کی وضاحت میں اصل کردار مسافر ادا کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسافر کا بھی تعارف کرایا جائے۔ ایک مسافر رواجِ زمانہ اور وقت کی ضرورت کے مطابق سفر اختیار کرتا ہے۔ ایک مسافر دوسرے ملکوں کی نامعلوم معاشرت اور تہذیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد سفر نامہ لکھتا ہے۔ اس طرح اس کا سفر تحریری حیثیت اختیار کرتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں لفظ مسافر کے لغوی، مُرادی اور اصطلاح معنی اس طرح استعمال ہوئے ہیں۔

مُسافر ۔ ع۔ اسم مذکر: سفر کرنے والا۔ بٹاؤ۔ راہگیر۔ سیاح۔ جاتری۔ بٹوہی۔ سالک۔ ابن السبیل، پردیسی (۲۲)

مُسافِر کا لفظ اسم فاعل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس سے مُراد سفر کرنے والا شخص کے ہیں۔ جب کوئی مسافر سفر کرتا ہے تو اس کے بعد اپنی ذاتی معلومات تحریری صورت میں پیش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں سفر نامہ وجود میں آتا ہے۔ تاہم لفظ مسافر A Freqanecy Dictionary of Arbic میں مندرجہ ذیل مفہوم کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

مُسافِر n. pl. uun traveler,passenger;a.p traveling (on a Trip)

بعد ذلک سیطلب منک ادخال بیاناتک الشخصیة وبیانات کل مسافر معک بالرحلة--After that it will ask you to enter your personal information and the information of each person traveling with you one trip.(۲۳)

Oxford ڈکشنری کی رو سے، جو برطانوی اور امریکن انگریزی کے مفاہیم کی وضاحت کرتی ہے، لفظ Traveler مسافر یا سیاح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

Trav-el-ler(especially Brit Eng)Trav-el-ler (American.Eng)(i) a person who in traveling or who often travel(ii) a person who does not live in one place but travel around, especially a part of group(۲۴)

Longman ڈکشنری کے مطابق مسافر سیر و سیاحت کرنے والے کو کہا گیا ہے۔ یعنی مسافر ایسا شخص ہے جو اکثر و بیشتر مصروفِ سفر رہتا ہے۔ زیرِ نظر حوالہ میں برطانوی اور امریکن انگریزی صوت کی رو سے وضاحت پیشِ نظر ہے:

Traveller British English, traveler American English /'træveler/ noun [countable] 1 someone who is on a journey or someone who travels often.(۲۵)

مسافر ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اکثر اور بیشتر محوِ سفر رہتا ہے۔ یا پھر مسافر سے مُراد ایسا شخص ہے جو ایک جگہ سے

دوسری جگہ، بغیر قیام کیے یا کسی جگہ پر لمبے عرصے تک رکے بغیر سیاحِ سفر ہے۔ Webster ڈکشنری میں مسافر یا سیاح کے لیے جہاں معنی بیان کیے گیے ہیں وہاں پر برطانوی انگریزی میں تعریف بھی بیان کی گئی ہے۔

Traveler noun,English Language Learners Definition of traveler :some one who is traveling or who travels often......British: a person who moves around from place to place instead of living in one place for a long time.(۲۶)

انسان کی سرشت میں یہ شامل ہے کہ وہ فطرت کی حد سے زیادہ تعریف کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں اور خطوں کے بارے میں جاننے کا اس کے اندر تجسس ہوتا ہے۔ اسی تجسس کی وجہ سے انسان مسافر کا روپ دھار لیتا ہے۔ نئی زمینوں اور تہذیبوں کے مشاہدے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ سفر اور سفر نامہ کی بحث کے پیش نظر سفر سے مراد ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر اختیار کرنا ہے۔ اپنے وطن سے کسی دوسرے ملک میں جانا۔ ایک علاقے یا ملک سے ہجرت کر کے دوسرے علاقے یا ملک میں سفر کرنا۔ سفر محض گھومنے پھرنے، کسی تعلیمی، سفارتی، تجارتی یا روزگار کے مقصد کے تحت بھی ہو سکتا ہے۔ سفر کے مسائل جھیلنے کی صورت کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے ہر پہلو سے سفر ہی کہیں گے۔ سفر کرنے والے اکثر افراد اپنے سفر کی یادداشتوں کو سفر نامے کی صورت میں لکھتے ہیں۔ تحریری صورت میں آنے کے بعد سفر نامے کی ہیئت کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً، سفر نامہ روداد، آپ بیتی، رپوتاژ، مراسلہ نگاری، سرگزشت اور فکشن وغیرہ کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سفر نامہ کی ان میں سے کوئی ایک نوعیت ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی، ادبی، مذہبی، تجارتی، ثقافتی، تاریخی اور فطری مناظر کی تصویر کشی جیسی اقسام کے سفر نامے ملتے ہیں۔

سیر، سیاحت اور سفر کے ساتھ ساتھ سفر نامہ کے اصطلاحی معنوں کا جہاں تک تعلق ہے تو اردو جامع اللغات میں اس سے مُراد سفری سرگزشت ہے۔ جامع اللغات میں سفر نامہ سے مُراد سیاحت نامہ، روزنامچہ سفر ہے۔

- **سفر نامہ:** (ع،ف) سفر کے حالات اور سرگزشت (۲۷)

فرہنگ آصفیہ میں سفر نامے کے لفظی اور اصطلاحی معنی کے بارے میں وضاحت اس طرح ہے کہ:

- **سفر نامہ:** (ع+ف) اسم مذکر سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روزنامچہ سفر، حالات و سرگزشت (۲۸)

سفر اور سفر نامہ کے معنی کی وضاحت ووبسٹر "WEBSTERS" ڈکشنری میں اس طرح کی گئی ہے کہ کسی سفر پر بیانیہ لیکچر، عام طور پر جس کی آرائش تصویروں کے ذریعے کی گئی ہو، سفر نامہ کہلاتا ہے۔ (Travelogue) کے زمرے میں یہ تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:

A lectuer of discourse on an account of travel, usually

illustrated pictorially, also"Travelogue"(Travel ,on analogy with monolog, dialog ect.)(۲۹)

سیر، سفر، سیاحت اور سفر نامہ کے الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کے علاوہ سفر نامے کا فنی تعارف کرایا جائے تو عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی سفرنامے پر بحث ملتی ہے۔مختلف زبانوں کی تعریفوں سے سفرنامے کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے۔سفرنامہ کا عربی زبان سے تعلق ثابت کرنے اور اردو میں ترجمہ یا معنی بیان کرنے کے حوالے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ:''سفر''عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنے کے لیے نکلنا۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونے کے ہیں۔اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔''(۳۰)سفر کی اصطلاح کے لیے عربی میں رحلۃ، فارسی میں مسافرت (سفرنامہ) اور انگریزی زبان میں لفظ Travelogue استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی انگریزی کے جس لفظ سے مُرادُ سفر نامہُ ہے، عربی میں اس کے لیے لفظ سفر نامہ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ سفرنامے کے لیے أسفر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے بیان کی گئی ہے کہ:

> عربی میں سفر کو ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور سفرنامہ کے لیے'' رحلۃ'' لیکن انگریزی میں(Travelo gue) کا ترجمہ''رحلۃ'' کے ساتھ''ضلیم سیاحتی'' بھی کہا جاتا ہے اور محاصرہ منصورہ عن رحلۃ'' یعنی عربی میں بھی وہی معنی لیے جاتے ہیں جو انگریزی میں Travelo gue کے ہیں۔تاہم فارسی میں سفر کا مسافرت کہنے کے باوصف سفرنامے کو سفر ہی کہا جاتا ہے۔(۳۱)

مذکور بالا میں ضلیم سیاحتی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔یہ اصطلاح عربی زبان کی ہے۔جس میں ضلیم کا مطلب ہے بھٹکنا اور سیاحتی کا مطلب ہے سیر کرنے والا۔اس طرح ضلیم سیاحتی کا مطلب ہوا سیاحت کے لیے جگہ جگہ پھرنے والا۔سفرنامے کی ترکیب کے لیے جیسا کہ انگریزی زبان میں ٹریولاگ (Travelogue) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔اردو زبان میں انگریزی کے لفظ (Travelogue) کا ترجمہ:''سفر کا بیان''،''سفر کی روداد'' یا پھر''سفر پر تقریر'' کیا جا سکتا ہے۔اردو میں سفرنامہ رودادِ سفر یا سفری تجربات، مشاہدات کو رقم کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔انگریزی میں اس کے لیے (TRAVELO GUE) مستعمل ہے جس کے معنی اردو کی نسبت قدرے وسیع ہیں۔''(۳۲)

Collons Dictionary میں بھی لفظ travelogue کے تقریباً وہی مفہوم ہے جو الزبیر میں سید جاوید اقبال نے بیان کیا ہے۔مذکورہ بالا بیان میں سفر نامہ، مسافر کے تجربات قرار دیا گیا ہے۔جب کہ زیر نظر حوالے میں سفرنامہ سیاح کے کوائف کو کہا گیا ہے۔اگرچہ یہ کوائف فلم کی صورت میں ہوں یا کہ زبانی بتائی گئی تفصیل کی صورت میں۔لفظ travelogues کے معنی collins dictionary میں اس طرح ہیں:

> travelogues (COUNTABLE NOUN) A travelogue is a talk or film about travel or about a particular

person's travels.(۳۳)

انگریزی زبان کے TRAVELOGUE کے لیے اردو زبان کا لفظ سفر نامہ، اس طرح کا مترادف یا ہم معنی نہیں رکھتا جس طرح دیگر الفاظ کے مترادفات ہوتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ مفرد لفظ کا مترادف مفرد ہونا چاہیے اور ترکیب کا مترادف ترکیب کی تیکنیک میں ہونا ضروری ہے۔ مذکورہ بالا لفظ کا اردو میں ترجمہ ''سفر کا بیان'' ہی کیا جاتا ہے۔ جو کہ ایک مرکب معنی کی صورت میں ہے۔ انگریزی زبان میں سفرنامے کے لیے زیادہ تر travelogue کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ lexico.com میں ''travelogue'' کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

travelogue US travelog (NOUN) A film, book, or illustrated lecture about the places visited by or experiences of a traveller. (۳۴)

Longman Dictionary کے مطابق امریکن انگلش میں بھی travelogue سے مراد فلم یا تحریر کا ٹکڑا جو کسی خاص ملک کے سفر کو بیان کرتا ہو، یا کسی شخص کے منفرد اسفار کی تفصیل ہو، سفرنامہ کہلائیں گے۔ Longman Dictionary میں travelogue کے لفظ کا معنی اس طرح ہے:

trav-el-ogue (also travelog American English) /'trævelog'/ noun [countable] a film or piece of writing that describes travel in a particular country, or a particular person's travels(۳۵)

سفرنامے کے معنی و مفہوم کی بحث کے پیش نظر دیکھا جائے تو لفظ ''نامہ'' فارسی زبان کا ہے، یہ بھی اسم مذکر ہے۔ اس کے لغوی معنی: '' لکھے ہوئے خط، فرمان یا عمومی طور پر تحریر شدہ عبارت کے ہیں اس لیے اردو کے علمانے ''سفر'' عربی سے اور ''نامہ'' فارسی سے لے کر سفرنامہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔''(۳۶) 'سفرنامہ' کی ترکیب 'سفر'، 'نامہ'' عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کو ملا کر بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر، اور سفرنامہ کے الفاظ پر عربی اور فارسی زبان کا اطلاق ہوتا ہے۔

جہاں تک متعلقہ اصطلاحات کے معنی، مفہوم، مطالب کا تعلق ہے تو سیر، سفر، سیاحت، سفرنامہ یا سیاحت نامہ کے الفاظ و مرکبات کے معنی لغات میں الگ الگ اور تفصیل سے درج ملتے ہیں۔ سفرنامہ اور سیاحت نامہ کے الفاظ ایک دوسرے کے ہم معانی ہیں۔ بلحاظ جنس، لغوی، اصطلاحی اور مرادی معنی کی وضاحت کے ساتھ پیش نظر ہیں۔ جیسا کہ ''سیر'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے معنی ''سیاحت کرنے'' کے ہیں۔ اردو ادب کی اصطلاح میں بھی اس کے معنٰی و مفہوم یہی ہے۔ لفظ ''سیر'' کسی بھی سفر کے اہم محرک کا کام سرانجام دیتا ہے۔ یہ لفظ بلحاظ جنس اسم مذکر ہے اور اس کے معنی

گھومنے پھرنے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔اس لفظ کے اندر سیر وسیاحت کا ایک مقصد چھپا ہوا ہے۔سفر کرنے کے دوران یا سفر ختم ہوتے وقت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سفر کے مقصد کی نوعیت کیا تھی۔جیسے دریا کی سیر، پہاڑی علاقے کی سیر، کسی جھیل کی سیر، تاریخی مقام کی سیر، کسی ملک کے خاص حصے کی سیر۔لفظ سیر کے پس منظر میں یہ مفہوم پوشیدہ ہے کہ کسی جگہ کی سیر کر کے مسرت حاصل کرنا، دلچسپ اجزاء کی تفصیل اکٹھی کرنا اور سیر کی تفصیل دوسروں تک پہنچانا، وغیرہ بھی سفر نامہ نگار کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔

سیر اور سفر کے الفاظ کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔سیر کرنا سے مراد گھومنا پھرنا ہے۔سفر اختیار کرنا سے مراد سیر کرنے کے لیے سفر اختیار کرنا ہے۔دونوں الفاظ بعض اوقات مترادف مرکب عطفی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔جیسے سیر وسفر یا سیر وسفر کرنا۔لغت میں لفظ سفر کا تعلق عربی زبان سے ہے۔لفظ سفر کے لغوی معنی 'سفر اختیار کرنا'، اصطلاحی معنی 'سیاحت کرنا' اور ذیلی معنی 'کسی دوسری کی جگہ کا سفر اختیار کر کے گھومنا پھرنا' ہیں۔سفر کا لفظ بھی اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے کئی مقاصد رکھتا ہے۔کوئی سفر کسی مقصد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔کوئی فرد بلاوجہ یا اتفاقیہ سفر نہیں کرتا، کسی فرد کا سفر کرنے کا کوئی بظاہر مقصد نہ ہو تو پھر بھی سفر کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔تاہم سفر لاچاری، مجبوری یا خوشی سے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

سفر کے ذریعے صرف دوسرے ممالک کی سیاحت ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسری قوموں کے افراد سے میل جول کا موقع بھی ملتا ہے۔دوسری قوموں کے افراد کے اطوار اور مصروفیات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔تہذیب ثقافت، سیاست، زبان وادب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔سفر نامہ کا جامع انداز میں تعارف الزبیر میں یوں ملتا ہے: ''سفر نامہ انسان اور انسانی زندگی سے بحث کرتا ہے۔دو چیزوں، جگہوں، تاریخی نوادر، جغرافیائی کیفیتوں، تاریخی حوادث، معاشرت و ماحول کو انسان کے حوالے سے دیکھتا اور پیش کرتا ہے۔'' (۳۷) سفر نامے کے بارے میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کا نقطۂ نظر بھی وہی ہے جو سید جاوید اقبال کا ہے۔مگر سید جاوید اقبال تاریخ اور جغرافیہ کو بھی سفر نامے کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ رکھ کر پرکھتے ہیں۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی سفر نامہ تاریخی اور جغرافیائی صورت حال سے گریز برتنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> سفر نامے کا موضوع انسان اور انسانی زندگی ہے۔تاریخی یا جغرافیائی حالات وکوائف نہیں۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ جغرافیائی ماحول اور تاریخی پس منظر بھی کسی تاریخی پس منظر اور جغرافیائی حالات سے اعتنا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔بعض سفر نامے اپنی خصوصیات کے باعث جو ایک رپورتاژ کے لیے ضروری ہیں رپورتاژ کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن ہر سفر نامہ رپورتاژ اور دوسری طرف رپورتاژ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی سفر ہی کے حالات سے متعلق ہو۔(۳۸)

سفر نامہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔کسی ملک کی تہذیب وثقافت، تاریخ اور جغرافیہ، سفر نامے کا حصہ بننے سے پہلے سفر نامہ نگار کی زندگی کا حصہ بنتے ہیں۔جس کی وجہ سے سفر نامہ، سفر نامہ نگار کی خود

نوشت بن جاتا ہے۔مظہر احمد کا بھی سفرنامے کے بارے میں وہی نکتہ نظر ہے جو سید جاوید اقبال اور ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کا ہے۔تاہم مظہر احمد سفرنامے کے اعلیٰ معیار کے قائل اسی صورت میں نظر آتے ہیں جب سفرنامہ ادبی سطح کے قریب تر نظر آتا ہے،وہ لکھتے ہیں کہ:''سفرنامہ سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ تاریخی وجغرافیائی معلومات کی کھتونی ہوتے ہیں۔سفرنامہ نگار اپنے حالات وخیالات کو ہی قلم بند نہیں کرتا بلکہ بالواسطہ طور پر تاریخ نگاری کے فریضے کو بھی انجام دیتا ہے کہ جس دور میں سفرنامہ نگار مصروفِ سفر ہوتا ہے۔اس دور کے تاریخی واقعات پر تبصرہ کرتا جاتا ہے۔''(۳۹)

ایک سیاح دنیا کے کونے کونے میں نئی سرزمینوں کی سیر کرتا ہے۔نئی طرزِ معاشرت، نئے رسم ورواج،تہذیب و ثقافت اور تاریخ وجغرافیہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔سفری یاداشتوں یا کوائف کو جمع کرتا ہے۔اپنے دور کے تاریخی واقعات کو سفرنامے کا حصہ بناتا ہے۔ڈاکٹر مظہر احمد اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ:

> سفرنامہ ایک نوع کی ''خودنوشت'' ہے کہ اس میں سیاح اپنی زندگی کے حالات قلم بند کرتا ہے۔یوں خود نوشت بھی دراصل زندگی کے سفر کی ہی روداد ہے۔اس حیثیت سے سفرنامے کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ایک کامیاب سفرنامہ سیاحت اور ادب کی خوبصورت آمیزش سے عبارت ہے۔(۴۰)

سفر براہ راست انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔وہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی میں کوئی سفر کیا ہے تو وہ کئی بار اس سفر کے قصے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو سناتے رہتے ہیں۔براعظم ایشیا جو کہ ایک بہت وسیع اور گنجان آباد براعظم ہے۔اس کے وسیع وعریض ممالک اور رچی بسی تہذیبوں اور معاشروں کی اپنی انفرادیت اور اہمیت ہے۔اس کے تمام علاقوں میں داستانیں اور کہانیاں ہر دور میں اپنے عروج پر رہی ہیں۔حقیقت میں داستانیں اور کہانیاں کہنے کا فن بھی سفری قصے سنانے کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔اس طرح سفری قصے سناتے سناتے بے شمار کہانیاں وجود میں آئیں جن میں بے شمار اسفار کا ذکر ملتا ہے۔طلسم ہوشربا،الف لیلۃ اور کئی ایک دوسری داستانیں اپنے اندر دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ سفر کے لوازمات کو بھی سموئے ہوئے ہیں۔ہندوستان کے خطے میں جاتک کہانیاں،مہابھارت،سنگاسن بتیسی،سب رس،نوطرزِ مرصع،باغ و بہار،فسانہ عجائب،فسانہ آزاد اور اس طرح کی دیگر کہانیوں پر بھی سفری قصوں کی فضا طاری نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں،اسی تاثر کے زیر اثر مسافر،سیاحت کے لیے ان خطوں کو اہمیت دیتے ہیں،ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے رقم کرتے ہیں:

> مشرق کی داستانوں میں بغداد ایک ایسے شہر کی صورت میں آتا ہے جو پرشکوہ محلات،عالیشان باغات، جلیل القدر شہنشاہوں،جمیل شہزادوں اور خوبصورت شہزادیوں کے طلسمات میں لپٹا ہوا ہے۔چنانچہ پُرانے قصے کہانیوں میں اس شہر بے مثال کے گرد دائرۂ تحیرات بنتے گئے۔اور قاری کو خواب الحسن دیکھنے کے مواقع مہیا کئے گئے مغربی ادب میں ہندوستان جادو کی سرزمین تھی۔اور اس کی سیر عجوبہ روزگار سمجھی جاتی تھی۔(۴۱)

چوں کہ سفر اور سفر نامہ کی جہتیں داستان اور کہانی کی واقعیت سے مماثلت رکھتی ہیں۔ سفر نامہ کے قاری کے پیش نظر بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سفر نامہ پڑھتے وقت قصہ گوئی اور سفر نامے کے مابین کیسے امتیاز برتے۔ درحقیقت سفر نامہ کا پلاٹ داستان اور کہانی کی طرح بالکل نہیں ہوتا۔ مگر سفر نامہ کا بھی کوئی نہ کوئی اپنا پلاٹ ضرور ہوتا ہے۔ جو سفر نامہ کو داستان سے جدا کرتا ہے۔ داستان کی طرح سفر نامہ بھی ماضی کے واقعات کا اچھا خاصہ مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں سفر نامہ ملکوں کے مقامات اور قدرتی مناظر کو بیان کرتا ہے وہاں پر تاریخ کے گوشوں کو بھی بیان کرتا ہے۔

سفر نامہ ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے سیاح کے خیال میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مختلف خطوں کے تہذیبی و ثقافتی تعلقات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ سفر ناموں کے ذریعے قوموں کے تاریخی حالات و واقعات تحریر کیے جاتے ہیں، جن میں سفر نامہ نگار کا مشاہدہ، زبان، اسلوب، تکنیک اور دلی کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ سفر نامے کے مختلف پہلوؤں کا فنی اور فکری لحاظ سے مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سفر نامہ میں تاریخ کا کتنا حصہ ہو سکتا ہے؟ جغرافیہ کا سفر نامے میں کہاں تک عمل دخل ہے؟ سفر نامے کے کوائف میں کس قدر ربط موجود ہے؟ ایک سفر نامہ نگار اپنی ذاتی فنی صلاحیت سے اپنے دور کی منظر کشی پیش کر دیتا ہے، ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> یہ صنف علمِ تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط، دلچسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ادب سے فائدہ ضرور اُٹھاتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے اس مشاہدے کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے۔ (۴۲)

سفر روزگار کی تلاش کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے؛ سفر مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے بھی عمل میں آ سکتا ہے اور سفر تفریح کے مقاصد کے لیے بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں سفر دوسرے ممالک کی ثقافت، زبان و ادب آگاہی حاصل کرنے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ ہنر سیکھنے، علم حاصل کرنے اور تبلیغ کرنے کے لیے بھی سفر اختیار کیا سکتا ہے۔ سفر ایک ایسی حقیقت ہے جس کو زندگی سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی عناصر سفر نامہ نگار کی زندگی کا حصہ بنتے ہیں۔

سفر نامہ کی تعریف و توضیح کے ساتھ ساتھ لفظ تاریخ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی پیرائے میں تعارف کرانا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ لفظ ''تاریخ'' کے لغوی معنی ''وقت کی نشاندہی کرنا'' یا ''وقت بتانا'' کے ہیں۔ تاریخ نگاری کی اصطلاح میں تاریخ سے مُراد ماضی میں پیش آنے والے اہم واقعات اور حادثات کے بارے میں تحریروں کو تاریخ کہتے ہیں۔ یہ واقعات، سیاست، سماج، معاشرت، ادب، سائنسی یا کسی بھی سطح پر کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہو؛ اس بڑی تبدیلی کی کوئی سیاسی، سماجی اور معاشرتی اہمیت بھی ہو اور ان واقعات کی ترتیب تاریخ وار ہو تو ایسی صورت میں تاریخ کہیں گے۔ فرہنگ آصفیہ میں لفظ

تاریخ کے معنٰی اور مطالب اس طرح بیان کیے گئے ہیں: **"تاریخ**: اسم مونث (۱) کسی چیز کے ظہور ا کا وقت (۲) کسی امرِ اعظم کے وقت تعین، زمانہ کا عرصہ (۳) شمسی یا قمری مہینے کا ایک دن مع شب (۴ قانون) وہ دن جو عدالت مقدمہ کی پیشی کے لیے مقرر کرے، پیشی مقدمہ کا دن۔ (۴۳)

لفظ ''تاریخ'' کے لغوی اور اصطلاحی معنٰی بیان کیے گئے ہیں۔ تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے اور مادہ ''ارخ'' سے نکلا ہے۔ کسی واقعہ کے ظہور ہونے کا وقت، کسی بڑے واقعے کے وقت کا تعین۔ ایسا علم جس میں گزرے ماضی کے واقعات سے بحث کی جاتی ہے یا بادشاہوں، نامور آدمیوں کے حالات و واقعات کا تحریری تذکرہ تاریخ کہلاتا ہے۔ انٹرنیٹ ایڈوانس اردو لغت میں لفظ تاریخ کی وضاحت یوں ہے:

ارخ / تاریخ: عربی زبان میں ثلاثی مزید فیہ کے "باب تفعیل" سے مصدر اور اردو میں بطور حاصل مصدر رائج ہے۔ قلی قطب شاہ نے ۱۶۱۱ء میں استعمال کیا۔

اسم حاصل مصدر (مؤنث - واحد)

جمع: تارِیخیں [تا + ری + خیں (ی مجہول)]

جمع استثنائی: تَوارِیخ [تَوا + رِیخ]

جمع غیر ندائی: تارِیخوں [تا + ری + خوں (و مجہول)]

(۱)۔ **کسی چیز یا واقعے کے ظہور کا وقت**": اس بادشاہ کے حالات اور واقعات کو ٹکڑے ٹکڑے سن و تاریخ کی قید کے سبب سے (بیان) نہیں کیا"۔

(۲)۔ **کسی امر عظیم کے وقت کا تعین، زمانے کا عرصہ**: " تاریخ دہم، جمعہ کے دن، عصر کے وقت آہ چھپ جائے گا آنکھوں سے اس چاند میں یہ ماہ۔" (مراثی انیس)

(۳) **شمسی یا قمری مہینے کا ہر دن یا ہر رات**: لڑکوں کے نام ان کے نئے درجوں میں آیندہ کی یکم تاریخ کو رجسٹر حاضری پر لکھ دیوے۔" (مدرسین دستور العمل)

(۴)۔ وہ علم جس سے گزشتہ واقعات اور سیر سے بحث کی جاتی ہے۔ "اب تو سب مٹ گئے مٹنے کے نشان بھی اپنے خاص اک وقت میں تھا علم ہمارا تاریخ۔" (گفتار بے خود)

(۵)۔ بادشاہوں، نامور آدمیوں، قوموں اور فرقوں کے حالات و واقعات اور حادثات کا تحریری تذکرہ: ☆ کھولتی حال ہے دنیا میں خدا والوں کا رمز درویشوں کا کرتی ہے یہ افشا تاریخ ☆ حروف ابجد کے اعداد کے لحاظ سے کوئی بات یا واقعہ، کسی حرف یا نظم یا نثر کے کسی جملے میں اس طرح بیان کرنا کہ اس کے مکتوبی حروف کے عدد جمع کرنے سے اس واقعے کا سنہ نکل آئے، اس قسم کے حرف یا جملے یا شعر کو مادہ تاریخ کہتے ہیں، حساب جمل۔" فن تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے ان کو مطلق لگاؤ نہ تھا"۔ (یادگار غالب)

(۶) [**قانون**] **کسی مہینے کا وہ دن جو عدالت مقدمے کی پیشی کے واسطے مقرر کرے**: "یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ

تاریخ روبکاری کیا ہے۔"(خطوط غالب)

انگریزی الفاظ

date era epoch; day (of a month); chronogram; chronicle book of annalhistory.(۴۴)

مذکورہ اقتباس میں لفظ تاریخ کی تعریف کے علاوہ سفرنامے کا تاریخ سے تعلق بھی بتایا گیا ہے۔ تاہم لفظ تاریخ کا عربی زبان سے تعلق، اس کا اصل مادہ اور اردو زبان میں اس کے استعمال کی وضاحت کی گئی ہے۔

لفظ ''تاریخ'' عربی زُبان کا لفظ ہے۔ مادہ ''اَرَخ'' سے حاصل مصدر ہے۔ اردو زبان میں قلی قطب شاہؒ نے سب سے پہلے یہ ۱۶۱۱ء میں استعمال کیا ہے۔ زمانی حالات و واقعات ہی صرف تاریخ کے علم سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ تاریخ اسباب، واقعات اور نتائج کے تفصیلی مطالعے کا بھی علم ہے۔ تاریخ کے علم کے ذریعے واقعات کے اسباب اور نوعیت کے جاننے کے ساتھ ساتھ زمان و مکان، معاشرے اور تہذیب میں واقعہ ہونے والے حوادث کا ادراک کیا جاتا ہے۔ یوں تاریخ ایک ایسا مشترکہ عمل ہے جسے فطرت اور انسان نے مل کر فروغ دیا ہے۔

مختلف زبانوں میں لفظ تاریخ کے معنی و مفہوم کی وضاحت اس طرح ہے کہ لفظ تاریخ کے لیے زمانہ (Era)۔ تاریخ (History)، ہسٹوریا (Historia)، انڈنئے (Endenai)، گشٹے (Geschichte)، ہسٹر (Istor Histor) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مختلف زبانوں، عربی، عبرانی اور فارسی میں لفظ تاریخ کی تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ:

> عربی زبان میں لفظ تاریخ زمانہ (Era) حساب اور تعین وقت (Date) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لفظ تاریخ زمانہ مادہ و۔ر۔خ۔ سے مشتق ہے جو سامی زبانوں میں مشترک ہے مثلاً عبرانی زبان کے لفظ یارے اخ ''چاند'' اور پیرخ ''مہینہ'' میں یہی مادہ موجود ہے۔ اسی مشابہت کی بنا پر قیاس کریں تو لفظ تاریخ کے معنی ہوں گے ''مہینے کا تعین کرنا'' چنانچہ ایک طرف تو لفظ تاریخ معنی کسی واقعہ کے ہونے کا زمانہ معین کرنا اور روداد وقائع ہے۔ اور دوسری طرف وقائع کے وقتوں (dates) اعصار (Era) زمانے کا تعین (Chronology) یعنی تاریخ وار سلسلہ ترتیب سے واقعات کا تعین کرنا ہے۔(۴۵)

عربی کے لفظ ''ورخ'' اور عبرانی لفظ ''پیرخ'' کا آپس میں مشترکہ مفہوم واضح کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا تعریف کا مادہ انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم میں اس طرح ہے:

> عمومی لحاظ سے تاریخ سے مُراد قوموں کے عام وقائع کا بیان بہ ترتیب سالیانہ (Annasl) ہے۔ یہ لفظ کسی عصر کی ابتداء کا تعین (Era)، حساب، حوادث کے واقعات (Date) کا تعین بترتیب تاریخی وقائع استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے ہاں تاریخ ہجری کا آغاز ''سنہ ہجری'' پیدائش دنیا کی تاریخ ''تاریخ عالم'' حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی ''تاریخ مسیح'' اور خلقت عالم کی تواریخ وغیرہ۔(۴۶)

فارسی زبان کا لفظ تاریخ: ''ماہ روز'' کا معرب ہے۔ یعنی ماہ (چاند) اور روز (دن) سے مُراد ہے۔'' (۴۷) ڈاکٹر صادق علی نے تاریخ کی تعریف وہی کی ہے جو انسائیکلو پیڈیا میں بیان ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''لغوی طور پر لفظ تاریخ سے مُراد ایک دن رات، مہینے کا ایک دن کسی چیز کے ظہور کا وقت ایسا فن یا کتاب ہے جس میں مشہور آدمیوں کا بادشاہوں کے وقائع، حالات، پیدائش وفات یا کسی عہد کے وفاق، روایات، قصے افسانے اور جنگ نامے درج ہوں۔'' (۴۸) جیسا کہ فارسی زبان میں تاریخ سے مُراد ''ماہ وروز'' لی جاتی ہے۔ یہ لفظ فارسی سے عربی زبان میں آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق علی گل نے یہ بات بھی واضح کی ہے ماہ یا مہینے کے نام سے تاریخ کو منسوب کرنے کا جواز یہ بھی ہے کہ:

> فارسی زبان میں لفظ تاریخ ''ماہ روز'' کا معرب ہے۔ یعنی ماہ (چاند) اور روز (دن) مُراد ہے۔ اس میں بھی ایک مبہم سا احساس پایا جاتا ہے کہ اس لفظ کو مہینے کی ابتداء کے تعین سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ ممکن ہے اس نظریے کا اس روایت سے تعلق ہو (جو متعدد مورخین نے بیان کی ہے) جس کی رو سے اسلامی سن کو ہجرت کے سال سے شروع کرنے کا مشورہ حضرت عمر کو الہرمزان نے دیا تھا۔ (۴۹)

انگریزی اور لاطینی زبانوں میں لفظ تاریخ کی تعریف ملتی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم میں لفظ تاریخ کی وضاحت انگریزی اور لاطینی زبانوں میں اس طرح ہے کہ: ''انگریزی میں یہ لفظ ''ہسٹری (History) کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو لاطینی زبان کے لفظ ہسٹوریا (Historia) سے نکلا ہے۔ ہسٹوریا سے مُراد کسی واقعہ کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے۔ عام طور پر لفظ ہسٹری (History) سے مُراد کسی قوم، معاشرے اور ادارے کے وقائع خاص کا صحت و وجوہات کے ساتھ ترتیب وار تحریری ریکارڈ ہے۔'' (۵۰)

تاریخ کے متعلق یونانی زبان میں: ''لفظ ایڈنے (Eidenai) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جس سے مُراد کسی واقعہ کی بصیرت وادراک حاصل کرنا ہوتا ہے۔'' (۵۱) انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم میں جرمن زبان کے لفظ گشئے کا مطلب اس طرح ہے: ''جرمن زبان میں لفظ گشئے (Geschichi) تین قسم کے مفہوم ادا کرتا ہے۔ 1۔ کسی واقعہ کا وقوع پذیر ہونا۔ 2۔ وہ سلسلہ تحقیق جس کی بدلت وقائع کا علم ہو۔ ۳۔ معلوم شدہ وقائع کا بیان ہے۔'' (۵۲) اور اسی طرح فرانسیسی زبان میں لفظ ہسٹری کا مفہوم ماضی کے واقعہ کے بارے میں جاننا مُراد ہے۔ تاریخ کے انسائیکلو پیڈیا میں تحریر ہے کہ: ''فرانسیسی زبان میں یہ لفظ ہسٹر (Istor,Histor) کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مُراد ماضی کی کسی چیز یا واقعہ کے بارے میں ''جاننا'' اور معلومات رکھنا ہے۔'' (۵۳)

تاریخ کے متعلق متعدد دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا میں ابن خلدون: ''تاریخ کو ایک مسلسل جاری و ساری عمل کا نام دیتا ہے، اس کے مطابق تاریخ ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔'' (۵۴) زمانے کے لحاظ سے تاریخ کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی اقدار بدلتی رہتی ہیں۔ ویچو کے نزدیک: ''تاریخ انسانی شعور اور سیاسی اقدار کا ایسا

عمل ہے جس پر ہر مذہب، معاشرے اور انسانی تہذیب کی بنیاد قائم ہے۔" (۵۵) اینگلر تاریخ کو: "قوموں کی تہذیب وتمدن کے عروج وزوال کی کہانی کہتا ہے۔" (۵٦) جب کہ ٹائن بی تاریخ میں: "تہذیب وتمدن کے عروج وزوال کی کہانی بیان کرتا ہے۔" (۵۷) ایک اور نامور تاریخ دان کالنگ وڈ کا تاریخ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ: "تاریخ نیچرل سائنس کی مانند ایک علم اور فکر ہے۔" (۵۸) جس سے کائنات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح تاریخ کے افکار وحوادث کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ تاریخ کی تعریف انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کی ایک وحدت کا نام ہے۔ یہ انسانی عرفان وشعور کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تا کہ انسانی شعور کے آغاز، ارتقاء تہذیب کے مقصد کو سمجھا جائے۔ انسانی سوچ کو بیدار کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ہم آس پاس کے علاوہ پیچھے بھی دیکھیں تا کہ مستقبل کی روشنی نظر آئے۔ ہم آج میں رہ کر کل کو نہ بھولیں، نہ آنے والا کل کی اور نہ ہی گزرا ہوا کل۔ (۵۹)

تاریخ کے مطالعہ میں سہولت پیدا کرنے کے لیے اسے مختلف اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کسی خاص نوع کی تاریخ کو دوسری تاریخ سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ سماجی یا روایتی تاریخ کو بادشاہوں کی زندگیوں کے واقعات سے منسوب کیا جاتا ہے۔ تاریخ صرف بادشاہوں کے کارنامے پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دنیا میں بے شمار ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو تاریخی نگاری کی تفصیل کے محتاج ہوتے ہیں۔ مشاہیر عالم کا ایک وقت تک تاریخ اور تاریخی واقعات پر قبضہ رہا ہے۔ اب ایسے امکانات تاریخ نگاری سے خارج کیے جا رہے ہیں جن کا تاریخ سے دور پار کا بھی تعلق نہیں ہے۔ انسائیکلو پیڈیا میں تاریخ سے مُراد ایک: "رات، مہینے یا ایک دن یا کسی چیز کے اظہار کا وقت یا ایسا فن یا کتاب ہے جس میں مشہور آدمیوں اور بادشاہوں کے وقائع، حالات، پیدائش ووفات یا کسی عہد کے وقائع، روایات، قصے، افسانے اور جنگ نامے درج ہوں۔" (٦٠)

تاریخ کی اقسام کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے سامنے پہلی صورت میں علاقائی لحاظ سے ایشیا، یورپ، امریکا، افریقا، آسٹریلیا، وغیرہ کے خطوں کی تقسیم آتی ہے۔ زمانے کے لحاظ سے تاریخ کی قسمیں، دور، صدی، عشرہ، سال، شامل ہیں۔ جامعات یا تعلیمی اداروں میں مطالعہ کے لحاظ سے: دور قدیم کی تاریخ، امریکہ کی تاریخ، تاریخ یورپ، تاریخ افریقہ، مشرق وسطیٰ کی تاریخ، تاریخ ہند، ایشیا کی تاریخ، آسٹریلیا کی تاریخ، اسلامی تاریخ وغیرہ تاریخ کی اہم قسمیں خطوں کے لحاظ سے ہیں۔ دیگر اقسام میں، فلسفہ، علوم، فنون، ادب، طب، مذاہب اور مشاہیر عالم کی تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔

تاریخ میں فنی اور فکری طور پر رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ارتقاء کے حوالے سے ویچو اپنی کتاب 'جدید سائنس' میں تاریخ کو: "انسانی شعور اور سیاسی ارتقاء کا زینہ سمجھتا ہے۔ وہ تاریخ کو ایسا عمل قرار دیتا ہے کہ جس پر مذہب، معاشرے اور انسانی تہذیب کی بنیادی قائم ہے۔" (٦١) جہاں پر ویچو انسانی شعور کی ترقی کو تاریخ کا زینہ قرار دیا ہے۔ وہاں پر کانٹ کا نقطہ نظر ہے کہ: "تاریخی قوانین فطرت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس کے مطابق تاریخ سے انسان کے اعمال، اس کی ترقی

اور فطرت کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔'' (۶۲) اسی طرح تاریخ کے متعلق ہرڈر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ: '' انسان کی طاقت، عمل اور رجحانات کا فطری عمل بتاتا ہے۔ جو جگہ، وقت اور ماحول کے مطابق بدلتی رہتی۔'' (۶۳) بحیثیت مجموعی ہرڈر تاریخ کو تبدیل ہونے والا عمل تصور کرتا ہے جو وقت اور جگہ کی ترجیحات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ مگر کارل مارکس کے یہاں: '' تاریخ محض واقعات ماضی کی کہانی نہیں بلکہ اقتصادی نظام اور عوامل پیدائش دولت میں تبدیلی کی کہانی ہے۔'' (۶۴) تاریخ کائنات میں موجود ہر جاندار شئے کی افزائش کی کہانی ہے۔ لہٰذا اسپنگلر: '' تاریخ کو اصولِ گردش کے مطابق قوموں کی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کی کہانی کہتا ہے جو نامیاتی عمل کی طرف پیہم رواں دواں ہے۔'' (۶۵) ٹائن بی، اسپنگلر کے نقطہ نظر کی تردید تو نہیں کرتا مگر تاریخ کو مسلسل جاری رہنے والا عمل کہتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ: '' اصول للکار (Challange) اور جواب للکار (Response) کے بتدریج عمل ارتقاء کے مطابق جاری ہے۔'' (۶۶) مشہور فلسفی گوئٹے کا تاریخ کے متعلق نقطۂ نظر فلسفے کی بنیاد پر ہے، وہ کہتا ہے کہ: '' ہم سب ماضی کے سہارے زندہ رہتے ہیں اور اسی ماضی کی وجہ سے تباہ ہوتے ہیں۔'' (۶۷) ول ڈیورانٹ تاریخ کو تفہیم کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وہ گوئٹے کی طرح ماضی کو انسان کی تباہی کا سبب قرار نہیں دیتا۔ یہ نظریہ تاریخ کے بارے میں ول ڈیورانٹ کا ہے کہ: '' ہمارا ماضی ہمارے حال کا مجموعہ برائے عمل ہے اور ہمارا ماضی سمجھنے کے لیے پھیلا ہوا زمانہ حال ہے۔'' (۶۸)

تاریخ نویسی کا دارومدار حقائق کی بنیاد پر مبنی ہوتا ہے۔ نامور جدید مورخوں کی رائے ہے کہ تاریخ کسی معیاری اور درست طریقے سے نہیں لکھی جاسکتی۔ تاریخ لکھنے کے لیے خاص لوگوں کے ساتھ ساتھ عوام بھی کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی تحقیق میں گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ عام لوگوں کی غیر معیاری تحقیق کی وجہ سے تاریخی حقائق صداقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ تحقیق کر کے درست اور حقائق پر مبنی تاریخ لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ابن خلدون اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> مورخین نے قوموں کے عروج زوال پر خوب لکھا ہے لیکن جو مستند شہرت و امامت کی فضلیت میں گویا سبقت لے گئے اور جنھوں نے قدماء کی کتابوں کا قطرہ قطرہ اپنی کتابوں میں نچوڑ لیا وہ تھوڑے سے اور انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جیسے ابن اسحٰق، ابن جریر طبری، ابن کلبی، محمد بن اقدی اور سیف بن عمر اسدی وغیرہ مورخین مشہور ہیں اور جمہور سے ممتاز ہیں۔ (۶۹)

تاریخ اُس وقت تاریخ کہلاتی ہے جب ایک مورخ تحقیق کر کے آزاد فضا میں تاریخ لکھتا ہے۔ تاریخ نویس اوّل تو عملی تجربے سے گزر کر تاریخ لکھتا ہے۔ محض معلومات کی فراہمی اور خبروں کے مواد کے سہارے تاریخ لکھنا غیر معیاری عملی ہوتا ہے۔ زیادہ تر تاریخ نویسی، روزنامچوں، سفرناموں، ڈائریوں، اخباری مواد پر مبنی ہے جیسا کہ تاریخ نویسی ایک تجرباتی، مشاہداتی اور تحقیقی عمل ہے۔ جب تک تاریخ لکھنے والا عملی تجربے سے نہیں گزرتا تب تک تاریخ نویسی میں بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوں گی۔ تاریخ نویسی کے بارے میں پولی بیس کی تحقیق کے اصول اس طرح ہیں:

تاریخی تحقیق کے معاملے میں جن کو عملی تجربہ نہیں ہوتا وہ غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ایسے ناتجربہ کار مورخ کیسے بتا سکتے ہیں کہ فوجیں کس طرح چالیں چلتی ہیں، شہر کا محاصرہ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور بحری لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی ہیں۔اگر انھیں یہ باتیں بتا دی جائیں تو ان کی تفصیلات کو یہ لوگ کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔(۷۰)

مورخ پولی بیس نے تاریخ لکھنے کے حوالے سے مخصوص شرائط مقرر کی ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ کر ایک ایسی تاریخ لکھی جاسکتی ہے جو کسی ذاتی مقصد سے بالاتر اور بے لاگ ہو۔کیوں کہ اس کا کہنا ہے کہ:''محقق کا دل احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی، خاک اور مٹی کی صدا بھی سنتا ہے۔''(۷۱) یعنی تاریخ کا محقق بہت زیادہ احساس طبیعت کا ملک ہوتا ہے۔وہ حالات کے اسباب واقعات، نتائج تک بہت جلد رسائی حاصل کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک احساس مورخ تحقیق کرتا ہے تو حقائق کھل کر اس کے سامنے آجاتے ہیں۔تاریخی حقائق کے مختلف پہلوؤں سے مورخ آشنا کراتا ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ مورخ تاریخی واقعات کو تاریخ نگاری کے اصولوں کے مطابق بیان کرتا ہے۔تاریخ کو تاریخ کے اصولوں کے مطابق لکھنے والے بہت کم مورخ ہیں۔ان گنتی کے مگر نامور مورخوں میں :''ہیروڈوٹس، تھیوس ڈائڈر، لیو، پولی، ٹیسی ٹس، پلوٹارک، والٹیئر ، بالنگ بروک، ہیوم میکالے، کار لائل، اسپنگلر، ونسٹین چرچل ،طبری، واقدی، بلاذری، مسعودی اور ابنِ خلدون۔''(۷۲) شامل ہیں۔مذکورہ بالا مورخین کسی نہ کسی معاملے، واقعات کی تاریخ نویسی میں بھی مصروف رہے تھے۔جہاں تک پیشہ وارنہ تاریخ نگاری کا معاملہ ہے تو انیسویں صدی میں سائنسی بنیادوں پر تحقیق کے ذریعے تاریخ نگاری کے اصول ترتیب دیے گئے ہیں۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان لاکھوں سال سے بھی زیادہ عرصے سے اس دنیا میں آباد ہے۔اس طویل عرصے میں انسانی معاشرہ مختلف نسلوں، گرہوں، قوموں، تہذیبوں اور نظاموں کے عروج وزوال کے مدراج طے کرتا رہا ہے۔اس طرح مختلف واقعات، کہانیاں، قوموں کے اندازِ فکر، اسلوب، نصب العین بھی متعین ہوتے ہیں۔ہر ملک اور اُس ملک کی قوم کا مورخ اپنی تہذیب کی کہانی بیان کرتا ہے۔فلسفۂ تاریخ کے ایک مورخ کی رائے ہے کہ:''یہاں بے شمار مورخ ہیں ہر آدمی اپنا مورخ ہے۔''(۷۳) یعنی ہر فرد اپنی کہانی اور تاریخ سناتا ہے جو دوسرے فرد کی کہانی یا تاریخ سے مختلف ہوتی ہے۔سوال یہ ہے کہ تاریخ کو کس طرح بیان کیا جائے؟ جیسا کہ دو شاعر یا ناول نگار ایک جیسی تحریر نہیں لکھ سکتے یا دو مصور ایک جیسا آرٹ تخلیق نہیں کر سکتے۔اسی طرح :''دو مورخ بھی ٹھیک ٹھیک یکساں تاریخ نہیں لکھ سکتے۔''(۷۴) اگر ایسی کوشش کی بھی جائے تو ہوسکتا ہے کہ زمانی اور مکانی واقعات ایک جیسے لکھ لیں مگر اُسلوب، لفظوں، اور جملوں کی ترتیب میں ضرور فرق ہوگا۔تاریخ نویسی کے لیے معیاری انحراف کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک کمرۂ جماعت میں ایک استاد سے پڑھنے والے دو ہونہار طالب علم موجود ہوں۔ان کے مضامین ایک جیسے ہوں، امتحانی پرچوں میں مجموعی

نمبر ایک ہے جیسے ہوں۔ ہر ایک پرچے کے نمبر بھی برابر برابر ہوں مگر ان کے سوالات و جزیات کے نمبروں میں فرق ضرور ہو گا۔ اس طرح دو مورخین کی تحریروں میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ ایک ہی زمان و مکاں، ایک جیسے حالات و واقعات، ایک جیسی سہولتیں بھی ہوں تو تب بھی ان کے اسلوب، ترتیب، واقعات اور نتائج میں فرق ضرور ہوگا۔ تاریخ پر بحث کرنے والے ماہرین نے تاریخ کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے تاکہ تاریخ کے مطالعہ میں آسانی پیدا کی جا سکے۔ تاریخ میں، علوم، سوانحی، سیاسی، معاشی، جنگی، مذہبی، ذہنی، اسلامی، یورپی، تمدنی، آرٹ، ادب اور فلسفہ کی تاریخ کی اقسام شامل ہیں۔ مگر یہاں صرف سوانحی، سیاسی، سماجی اور جنگی تاریخ کی اقسام کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

سوانحی تاریخ(Biographic History):

سوانحی تاریخ، تاریخ کی سب سے قدیم قسم ہے۔ تاریخ کا بڑا حصہ اعلیٰ نسب مشاہیر حکمران شخصیات کی سوانح پر مشتمل ہے مثلاً حضرت یوسف اور ادریس کے بھائیوں کے واقعات، حضرت ایوبؑ کی کہانی وغیرہ۔ انگریزی ادب میں ”حیاتِ کارلائل“، ”حیاتِ رابرٹ لی“، ”حیاتِ نپولین“، حیاتِ ولسن“ از آرتھر وغیرہ۔ اسی طرح اردو میں ”حیاتِ جاوید“، حیاتِ سعدی“، ”الفاروق“ اور ”سیرۃ النبیؐ وغیرہ مشہور سوانح عمریاں ہیں۔

سیاسی تاریخ(Political Historiy)

سیاسی تاریخ بھی تاریخ ایک اہم قسم ہے جس کے ذریعے مختلف ممالک کی سیاسی تاریخ کی معلومات اور مواد کو نہ صرف تحقیق کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے بلکہ اہم قسم کی معلومات تک رسائی تاریخی حقائق کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ مورخ فری مین لکھتا ہے کہ: ”تاریخ زمانہ ماضی کی سیاست ہے اور ماضی کی سیاست حال کی تاریخ۔“(۷۵) سیاسی تاریخ کا تعلق ملک، معاشرے اور حکومت سے ہوتا ہے۔

جنگی تاریخ(War History):

تاریخ عالم میں خاموشی اور امن برقرار رکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں جنگ و جدل کو روکا جا سکے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں دنیا کے کسی حصے میں جنگ و جدل نہ ہوئی ہو۔ ایک طاقتور قبیلہ یا قوم ہمیشہ سے دوسرے کمزور قبیلے یا قوم کو غلام بناتا آیا ہے۔ طاقت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی جنگی جبلت کی خواہش کو تحریک دیتی ہے: ”جنگیں تاریخ میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور تمدن کی ترقی یا جمہوریت کی آمد سے ان میں کوئی کمی نہیں آتی۔“(۷۶)

مذہبی تاریخ(Religious History)

دوسری سماجی تاریخوں کی طرح مذہبی تاریخ کو بھی ایک الگ قسم کی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔ مذہبی تاریخ کا

تعلق مذہبی معاملات سے ہوتا ہے۔کسی ملک میں مذہبی اجارہ داری کے بغیر حکومت برقرار رکھنا ممکن نہیں۔اس کی اہمیت اور ضرورت معاشر میں ہر سطح پر واضح ہو جاتی ہے۔جیسا کہ مذہب کسی معاشرے میں سب سے پہلے عقیدے کے نظام کو رائج کرتا ہے۔مصیبت میں مبتلا لوگوں سے ان کی خواہشات کے حاصل کرنے کی ایک امید دلاتا ہے۔مذہب مادی اور جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے غلط ذرائع استعمال کرنے سے بھی روکتا ہے۔مذہب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کمزور ترین لوگوں کو عزت ووقار عطا کرتا ہے۔نپولین کے بقول: ''مذہب نے غریبوں کو امیروں کے قتل عام کرنے سے باز رکھا ہے۔''(۷۷)

سفر نامہ کی تعریف وتوضیح کرتے ہوئے یہ بات سامنے آئی کہ سفر نامہ کا تعلق آپ بیتی، روداد اور رپورٹ کی ترتیب وآہنگ سے بھی ہے۔لہٰذا مذکورہ اصطلاحات کا تعارف کراتے ہوئے مواد کی ترتیب وتنظیم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔جیسا کہ سفر نامہ کا تعلق مراسلہ نگاری، سرگزشت اور فکشن سے بنتا ہے۔اس لیے ان نثری اصناف کا مطالعہ کرتے وقت ان کے معنی اور مفہوم کی وضاحت اور مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔اس دوران اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ سفر نامہ کا مراسلہ نگاری، سرگزشت اور فکشن سے بھی تعلق ہے۔مذکور اصناف کا سفر نامہ سے تعلق جوڑتے ہوئے جدا حیثیت بھی قائم کی گئی ہے۔جہاں تک فکشن کی بات ہے تو داستانیں اس کا خاص روپ ہیں۔البتہ اس بات پر زیادہ زور اس لیے نہیں دیا گیا کہ موضوع سے دوری کا باعث نہ بنے۔تاہم داستان کی اصل بنیاد ہی اسفار ہیں۔جیسا کہ قصہ چار درویش میں ہر ایک درویش سفر اختیار کرنے کی ضرورت سے دوچار ہوتا ہے۔الف لیلۃ الیلہ میں سند باد جہازی کئی ایک اسفار کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔حاتم طائی کے قصوں میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔یعنی فکشن مراد داستان اور ناول نثری اصناف میں سفر یا سفر نامہ سے تعلق جوڑے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے۔یہی وجہ ہے کہ مذکور اصناف کے مطالعات بھی مختصر طور پر پیش کیے گیے ہیں۔سفر نامہ کے لوازمات کا تعلق بادشاہوں، ان کے مقربین اور سفیروں کے روز نامچوں اور ڈائریوں سے بھی ہے، اس لیے روز نامچہ اور ڈائری کی تعریف وتوضیح کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی مناسبت کے تحت سیر، سیاحت اور سفر، سفر نامہ یا سیاحت نامہ کے الفاظ ومرکبات کی وضاحت بھی پیش کی گئی ہے۔سفر نامہ کا بلاواسطہ سوانحی کوائف سے بھی تعلق ہے۔اس لیے سوانح نگاری کے بارے میں سمجھ بوجھ حاصل کی گئی ہے۔جیسا کہ سفر نامہ کے تاریخی عناصر کا تعلق تاریخ سے جوڑنے سے پہلے لفظ تاریخ اور تاریخ نویسی جیسی اصطلاحات کے مطالعات بھی پیش نظر رہے ہیں۔

ب: ایشیا کا جغرافیہ، وجہ تسمیہ، اہم حصے اور تعارف:

ایشیا ایک بہت بڑا برِ اعظم ہے۔اس کی آبادی، رقبہ اور محلِ وقوع بھی بہت ہی پیچیدہ ہے۔اس لیے اہمیت کا حامل بھی ہے۔خود برِ اعظم ایشیا مختلف خطوں شمالی، مشرقی، وسطی، جنوبی، مشرقِ وسطیٰ اور مغربی ایشیا پر مشتمل ہے۔ایشیا کے ان خطوں میں متعدد ممالک ہیں جن کی جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔**شمالی ایشیا** سے مراد یورال کے

مشرق میں ایشیا کا وسیع و عریض شمالی حصہ ہے، جسے سائبیریا بھی کہا جاتا ہے۔ 13 ملین کلومیٹر (5.1 ملین مربع میل) خطہ شمال میں آرکٹک بحر، مغرب میں یورپی روس کے ساتھ اور مشرق میں بیرنگ بحر کے ساتھ متصل ہے۔ سائبیریا کے جنوب میں قازقستان، منگولیا اور چین کے ساتھ بین الاقوامی سرحدیں مشترک ہیں۔ اس حصے میں صرف ایک ہی ملک روس واقعہ ہے۔ **مغربی ایشیا** سے مراد ایشیا کا مغربی حصہ ہے جس میں جزیرہ نما عرب اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر ممالک شامل ہیں۔ مغربی ایشیاء میں انیس ممالک ہیں۔ یہ تمام ممالک ہیں جن کی اکثریت مسلم آبادی پر مشتمل ہے۔ اس خطے میں آرمینیا، آذربائیجان، بحرین، قبرص، جارجیا، ایران، عراق، اسرائیل، اردن، کویت، لبنان، عمان، قطر، سعودی عرب، فلسطین کی ریاست، شام، ترکی، متحدہ عرب امارات اور یمن کے ممالک شامل ہیں۔ **وسطی ایشیا** سے مراد بحیرہ کیسپین اور مغربی چین کے درمیان ایشیا کا ایک خطے ہے۔ وسطی ایشیا میں قازقستان، کرغزستان، تاجکستان، ترکمنستان اور ازبکستان کے ممالک شامل ہیں۔ **مشرقی ایشیا** سے مراد ایشین براعظم کے مشرقی حصے کا ہے۔ اس میں چین، جاپان، کوریا (شمالی)، کوریا (جنوبی)، منگولیا اور تائیوان کے ممالک شامل ہیں۔ **جنوبی ایشیاء** سے مراد وسطی ایشیا کا جنوبی حصہ ہے۔ یہ خطہ بحر ہند سے جنوب میں گھرا ہوا ہے اور اس کے شمال میں ہمالیہ بھی واقع ہے۔ جنوبی ایشیاء میں آٹھ خودمختار ممالک افغانستان، پاکستان، بھارت، نیپال، بوٹان، بنگالہ دیش سری لنکا اور مالدیپ شامل ہیں۔ **جنوب مشرقی ایشیا** سے مراد ایشیاء کا وہ حصہ ہے جس میں جزیرہ نما ہند چینی اور سمندری جنوب مشرقی ایشیاء کی قومیں شامل ہیں۔ یہ خطہ براعظم کے جنوب مشرقی حصے، چین کے جنوب، ہندوستان کے مشرق اور برِ اعظم آسٹریلیا کے شمال میں واقع ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں برونائی دارالسلام، کمبوڈیا، انڈونیشیا، لاؤس، ملائیشیا، میانمار (برما)، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ، تیمور لیستی اور ویت نام شامل ہیں۔ یونان اور مصر کے ممالک کبھی ایشیا میں شمار کیے جاتے ہیں اور کبھی یورپ اور افریقہ میں، اس طرح برِ اعظم ایشیا میں پچاس سے زیادہ ممالک شامل ہیں۔ جن کی اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔

ایشیا کی بحث میں نام ''ایشیا'' کی تلاش، نام رائج ہونے کی وجہ اور تاریخی شہادتوں کے پیشِ نظر یہ نام کب رائج ہوا ہے۔ اس کے بارے میں مختلف مگر دلچسپ معلومات سامنے آتی ہیں۔ ایشیا کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ایشیا سلطنتِ روم کے ایک صوبے کا نام تھا جسے ایشیاء (Asia) یا ایشیانا (Asiana) کہا جاتا تھا۔ جو بعد میں مشرقی روم یا موجودہ ترکی میں شامل ہو گیا اسے بازنطینی زمانے میں فریگیا کہا جاتا تھا۔ یہ ایک سینٹوریئل صوبہ تھا، جو ایک صوبہ کے حاکم کے زیرِ انتظام تھا۔ 211ء میں جب روم سلطنت میں تبدیلی واقع ہوئی تو اس میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ ایشیا کے اس حصے کو اناطولیہ (ترکی) یا ''ایشیا صغیر'' بھی کہا کرتے تھے۔ ایشیا کے مغرب میں اب بھی سب سے بڑا سطح مرتفع اس میں پھیلاؤ ہوا ہے۔ آج کل جدید ترکی کا یہ خطہ شمال میں بحیرہ اسود، جنوب میں بحیرہ روم، مشرق میں آرمینہ کی بلند پہاڑیوں اور مغرب میں بحیرہ ایجیئن سے گھیرا

ہوا ہے۔ بحر مرمرا، اسود (Black) اور ایجیئن (Aegean) سمندروں کے درمیان، باسفورس (Bosphorus) اور درہ دانیال (Dardanelles) کے ذریعے سمندروں کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے اور یورپی سرزمین پر اناطولیہ کو تھریس (Thrace) سے جدا بھی کرتا ہے۔

برِاعظم ایشیا کے بارے میں مختلف قسم کی آرائیں ملتی ہیں۔ کسی نے اسے جیوپیٹر سیارے کے ایک چاند ٹائٹان (Titan) کا نام دیا ہے تو کسی نے اسے مشرق یا سورج طلوع ہونے کی سرزمین کہا ہے۔ جیوپیٹر کا چاند ٹائٹان یونانیوں کی دیوی تھی۔ یونانی زبان میں ٹائٹان (Titan) سے مُراد مشرق یا ایشیا ہے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ رومیوں کے نزدیک ایشیا (Asia) کا لفظ فینقی (Phoenician) زبان کے لفظ "ایزا"، "ایشا" یا "ایسا" (Asa) سے نکلا ہے۔ ایشیا کے بارے میں وثوق سے یہ کہنا محال ہے کہ اس کا نام "ایشیا" کب اور کیسے پڑا۔ اس کے بارے میں رائے یہ ہے کہ:

> Well, no one can say for sure where Asia got its name; although, there are plenty of theories about theorigin of the word"Asia"(۲۸)
>
> یہ کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ایشیا کا نام کہاں سے نکلا ہے؛ تاہم لفظ "ایشیا" کی اصلیت کے بارے میں کئی طرح کے بیانات ملتے ہیں۔

برِعظم ایشیا صدیوں سے موجود ہے۔ ایران اور عرب میں یوں تو آسمانی مذاہب رائج رہے ہیں، تاہم جو تصور لوگوں کے یہاں پہلے سے چلا آ رہا تھا اُسے ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بارے میں قدیم مائیتھالوجی میں تصور موجود تھا، یونانی اساطیر میں ایشیا یونانیوں کی ایک دیوی کا نام ہے۔ ہندو میتھ میں بھی یہی تصور رائج تھا۔ ایشیا کے بارے میں یونانیوں کے یہاں ایک تصور یہ ہے کہ:

> The Greeks are generally credited with creating the concept of an Asia, which at the time included Persians, Arabs, Indians, and anyone not African or European."Asia" was the name of a Titan goddess in Greek mythology(۲۹)
>
> یونانیوں کا عام طور پر ایشیا کے بارے میں وہی تصور ہے جو ایرانیوں، عربوں، ہندوستانیوں کا ہے۔ اس قسم کا تصور افریقہ اور یورپ کے بارے میں رائج نہیں ہوا۔ یونانی دیومالا میں ایشیا ٹائٹان دیوی کا نام تھا۔

ایشیا کے بارے میں معانی اور مطالب کی بحث کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہیروڈوٹس نے اپنے زمانے میں ایشیا کے لیے یونانی لفظ Originate استعمال کیا تھا جس کے معنی آغاز کرنا یا شروع کرنا کے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورج نکلنے کی وجہ سے جب دن کا آغاز ہوتا تھا یا دن شروع ہوتا تھا تو یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں نے اُس جگہ کو دن کا

آغاز کرنے کی جگہ قرار دیا۔ دراصل ایشیا کا لفظ ایران یا ترکی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ یونان اور مصر کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ یونان اور مصر کے لوگ ترکی، ایران یا مشرق کے لیے آغاز کرنے والا کے لفظ کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ ذیل میں ایشیا کے معنی کے حوالے سے انٹرنیٹ پر دی گئی وضاحت اس طرح ہے:

> PersonifiedinGreek mythology by the deityofthesamename. Asia.Theword Asia originated from the Ancient Greek word, first attributed toHerodotus (about440BC) in reference to Anatolia or to thePersianEmpire,incontrast to Greece and Egypt. It originally was just a name for the east bank of the Aegean Sea, an area known tothe Hittitesas Assuwa.(۸۰)
>
> یونانی اسطورہ میں ایشیا تجسیم کے طور پر ایک دیوتا کا ہی نام تھا۔ لفظ ایشیا قدیم یونانی لفظ سے نکلا originate ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے یونان اور مصر کے برخلاف اناطولیہ یا سلطنت فارس کے حوالے سے ہیروڈوٹس (قریباً 440 ق م) نے استعمال کیا تھا۔ یہ خاص طور پر ایشیا کے مشرقی کنارے، بحرہ ایجئین کے لیے مستعمل ایک نام ہے۔ اسووا (Assuwa) کے طور پر جانا جانے والا ہٹائیٹز (Hittites) جیسا علاقہ ہے۔

دراصل ہٹائیٹز Hittites کا جو علاقہ آسووا Assuwa کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ بحیرہ ایجئین Aegean کے مشرقی کنارے کا ایک نام تھا۔ اس علاقے میں حوتی آباد تھے اس لیے اسے یہ نام دیا گیا تھا۔ موجودہ ترکی کا یہ علاقہ قدیم دور میں یونانی ایشیا کا حصہ تھا۔ اسے ایشیا تصور کیا جاتا تھا۔ جہاں تک رومیوں کا ایشیا کے بارے میں تصور کا تعلق ہے تو انھوں نے رومن سلطنت میں موجود پورے لیڈیائی خطے کو ایشیا قرار دے رکھا تھا۔ رومن سلطنت اب چوں کہ اٹلی اور ترکی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اب دو الگ الگ ملک ہیں اس لیے جس علاقے کو اہل روم نے ایشیا تصور کیا تھا وہ حصہ اب شمال مشرقی ترکی میں صوبہ ایشیا کی حیثیت سے موجود ہے۔ اہل ترکی خود اس جزیرے ''ایشیا صغیر'' کہتے تھے۔ کلاسیکی عہد میں، یونانیوں نے پورے خطے کو ایشیا کہنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم ایشیا کے تصور کو مزید پھیلا کر مشرق تک وسیع کر دیا گیا۔ وکی پیڈیا میں ایشیا کے تصور کے بارے میں یہ رائے دی گئی ہے۔

> It originally was just a name for the east bank of the Aegean Sea, an area knowntotheHittitesasAssuwa.Inearly Classicaltimes,theGreeksstartedusingtheterm"Asia"toreferto thewhole region known today as Anatolia(the peninsula which

formstheAsianportionofpresent-dayTurkey.)TheRoman Empirereferredtothe entireLydianregionofwhatisnow northeasternTurkeyastheprovinceofAsia. Eventually, however, the name had been stretched progressively further east, untilitcame to encompass the much larger land area with which we associate it today, while the Anatolian Peninsulastartedbeingcalled "Asia Minor" or "The Lesser Asia" instead.(۸۱)

یہ اصل میں بحیرہ ایجئین Aegean کے مشرقی کنارے کا صرف ایک نام تھا، یہ علاقہ حوثیوں Hittites کے نام، آسووا Assuwa سے جانا جاتا تھا۔ ابتدائی کلاسیکی عہد میں، یونانیوں نے ایشیا کی اصطلاح پورے خطے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دی تھی۔ "اناطولیہ" (جزیرہ نما جو موجودہ ترکی کا ایشیئن حصہ بنتا ہے) جو آج کل موجودہ ترکی ہے۔ رومن سلطنت نے پورے لیڈیائی خطے کی طرف اشارہ کیا جو اب شمال مشرقی ترکی میں صوبہ ایشیا کی حیثیت سے ہے۔ تاہم اس نام (ایشیا) کو مزید پھیلا کر مشرق تک وسیع کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ آج اس میں اس کے وسیع و عریض رقبے کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے، جب کہ اناطولی جزیرے "ایشیاء مائنر" Minor Asia کے بجائے ایشیا صغیر Lesser "The Asia" کہا جانے لگا ہے۔

لفظ ایشیا کا تعلق یونان کی ترکیب ہٹائٹ اسووا (Hittite Assuwa) سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ اسووا کا علاقہ بحرۂ ایجئین کی ایک روایت کے مطابق یہ نام اس علاقے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ:

However, since the Greek name Asia is in all likelihood related to Hittite Assuwa, the etymology of one has to account for the other as well.(۸۲)

تاہم، چونکہ یونانی نام ایشیا کا تعلق ہٹائٹ اسووا Hittite Assuwa سے ہے۔ جیسا کہ دوسرے علوم کی طرح علم اشتقاق کی ایک تفصیل ہوتی ہے۔

لفظ ایشیا کے لیے ایک اور بحث بھی ہے جو یونانی، ہندی اور ایران اساطیر میں موجود ہے۔ ان خطوں میں جو ایشیا کے بارے میں تصور دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے مگر اس ایشیا کا تصور فنیقی زبان کے لفظ ایزا (Asa) سے یونانی زبان میں آیا جس کے معنی مشرق کے ہیں۔ یونانیوں سے رومیوں نے ایشیا کے تصور کو لیا۔ اس طرح لاطینی زبان میں اوریئنس Oriens سے مراد مشرق یا مشرقی ہے جس کا انگریزی زبان میں رائزنگ Rising معنی لیا جاتا ہے۔ ایشیا کے

بارے میں انٹرنیٹ پر اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ:

> Some historians say that the word "Asia" was derived from the Phoenicianwordasawhich means"east."The ancient Romans pickedup theword from the Greeks.TheLatinword oriensmeans"rising"--thesunrisesintheeast,so any people originatingfrom that direction were eventually refer redto as Orientals.(۸۳)

کچھ مورخین کہتے ہیں کہ لفظ Asia "ایشیا" فینقی Phoenician زبان کے لفظ ایزا Asa سے نکلا ہے جس کے معنی مشرق East کے ہیں۔قدیم رومیوں نے یہ لفظ یونانی زبان سے لیا تھا۔لاطینی زبان کے لفظ اوریئنس Oriens (مشرق) کا مطلب رائزنگ Rising ہے: جیسے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔تاہم اس کا مطلب ایسے شخص کے ہیں جو مشرق کی سمت سے شروع کرتا ہے اُسے شروع کرنے والا کہتے ہیں۔

ایک قیاس یہ بھی ہے برِاعظم ایشیا کے لیے " آسو" Asu کے لفظ کا استعمال کیا جاتا تھا یہ لفظ سیمیٹک جڑ Semitic سے تعلق رکھتا ہے جس کا مطلب "طلوع" یا "روشنی" ہے، مطلب یہ کہ یہ لفظ طلوع آفتاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس طرح اس لفظ کا مطلب 'مشرقی سرزمین' قرار پاتا ہے۔ماہرین علم اشتقاق کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس مذکورہ لفظ کا تعلق ایجیئن جڑ Aegean Root "ایسس" Asis سے ہوسکتا ہے جس کا مطلب " کیچڑ اور نمکین" والی جگہ کے ہیں۔انٹر نیٹ پر علمِ معانی کی رو سے اس لفظ کی تفصیل اس طرح ہے کہ:

> The deeper root of the etymology can onlybeguessed at. The following two possibilities have been suggested:1. It could have originated from the Aegean root "Asis" whic h means"muddyandsilty" as a description of the eastern shores of the Aegean Sea. 2. It couldderivefromthe borrowedSemiticroot"Asu",whichmeans varyingly"rising"or "light",of course a directional referring to thesunrise,Asia thusmeaning'Eastern Land'.(۸۴)

شجرہ نسب کی بنیادی کی گہرائی کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔مندرجہ ذیل دو امکانات تجویز کیے گئے ہیں: 1۔اس کی ابتدا ایجیئن جڑ Aegean Root "ایسس" Asis سے ہوسکتی ہے جس کا مطلب

"کیچڑ اور نمکین" ہے، جیسا کہ بحیرہ ایجیئن کے مشرقی ساحلوں کی وضاحت ہے۔ 2یہ سیمیٹک جڑ "آسو"Asu سے مستعار ہوسکتا ہے، جس کا مطلب مختلف طور پر "طلوع" یا "ضو" ہے، Semitic یقیناً جس کا ایک ہی سمت سے طلوع آفتاب کا حوالہ دیتا ہے، اس طرح اس کا مطلب 'مشرقی سرزمین' ہے۔

ایک ہی طرف سے سورج کے طلوع ہونے کا حوالہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے وہی مشرق کی سرزمین ہے۔ ایشیا کے بارے میں جتنی بھی وضاحتیں کی گئی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی تعلق یا مناسبت پائی جاتی ہے۔ ایشیا کے لیے فنیقی زبان کے لفظ ایزا(Asa) کے معنی مشرق(East) ہیں۔ جب کہ لاطینی، یونانی اور اکادیئین کے لفظ اسو(asu) سے مُراد ''نکل آنا یا، طلوع ہونا'' ہے۔ ایزا(Asa) اسو(Asu) کے الفاظ مشرق سے سورج کے حوالے سے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس طرح ایشیا کو'' سورج طلوع ہونے کی سرزمین'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1300 قبل مسیح کے بعد میں آنے والے یونانی اسے ''ایشیا صغیر'' کے نام سے جانتے تھے۔ مگر پلینی (Pliny) کے مطابق پورے خطے کو ایشیا قرار دیا گیا تھا:

Asia c.1300,from Latin Asia, from Greek Asia,speculated to be from Akkadian asu"to go out, torise,"in reference to the sun, thus"the land of the sunrise."Used bytheearly Greeks of what laterwas known as Asia Minor; by Pliny of the whole continent.(۸۵)

ایشیا 1300 قبل مسیح میں لاطینی، یونانی، اکادیئین کے خیال کے مطابق اسو(asu) سے مُراد'' نکل آنا یا چڑ نا، طلوع ہونا'' سورج کے حوالے سے ہے، اس طرح اس سے مُراد'' سورج طلوع ہونے کی سرزمین'' ہوا۔ اوّلین یونانیوں کے بعد آنے والے متاخرین اسے ایشیا صغیر(Asia Minor) کے نام سے جانتے تھے۔ پلینی (Pliny) کے مطابق پورا ایشیا ہے۔

ایشیا کے خطے کی اس بحث میں جہاں پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں۔ وہاں پر ایشیا کے بارے میں واضح شواہد بھی ملتے ہیں جن کی وجہ سے اس خطے کے بارے میں ابتدائی ادوار میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جیسا کہ ہیروڈوٹس نے ایشیا کے لیے یونانی لفظ Originate؛ کلاسیکی عہد کے یونانیوں نے ایشیا کے لیے آسووا Assuwa کا لفظ؛ یونانی زبان میں مشرق کے لیے ایزا(Asa) استعمال کیا اور یونانیوں ہی نے اوریئنس Oriens کا لفظ رومیوں کی پیروی میں مشرق یا مشرقی کے لیے استعمال کیا۔ حوشیوں نے ایشیا کے لیے "آسو"Asu کے لفظ کا استعمال کیا جب کہ ٹائٹان (Titan) کا لفظ بھی یونانی ایشیائی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان تمام تر وضاحتوں سے ایشیا یا مشرق کے خطے کے

بارے میں استعاراتی نام استعمال کیے جاتے تھے۔ جسے بعد میں یونانی ہیروڈوٹس کے زمانے میں ایشیا کی اصطلاح استعمال کی گئی۔

دنیا کے بعض خطوں کے نام انبیاؑ کی اولاد کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ جن بزرگ ہستیوں کے نام کی مناسبت سے خطوں اور ملکوں کے یہ نام رکھے گئے ہیں وہ کسی نہ کسی وجہ سے مشہور ہوں گے۔ کنعان، مصرائم، اندلس، شام اور فارس یہ ایسے لوگ تھے جن کا نوحؑ سے قریبی سلسلہ نسب بنتا تھا۔ مذکورہ بالا بحث میں لفظ ''ایشا'' یا ''ایزا'' بار بار استعمال ہوا ہے۔ دراصل ایشیا کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نوح کی اولاد میں سے **یافث** کے ایک بیٹے کا نام **''ایشائی''** تھا۔ حضرت نوحؑ سے اس کی نسبت چوتھی پشت میں جا کر بنتی تھی جس کا شجرہ نسب ایشائی بن یافان بن یافث بن نوح بالترتیب ہے۔ یوسفؑ کے ایک پوتے کا نام ''ایشا'' یا ''الیشا'' تھا جس کا شجرہ نسب: ایشا بن منشا بن یوسفؑ بن یعقوبؑ تھا۔ چوتھی پشت میں جا کر حضرت یعقوبؑ سے ملتا ہے۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے والد اور سلیمانؑ کے دادا کا نام ''ایشا'' تھا، ایشا یعقوبؑ کے بیٹے یہوذا یا یہودا کی اولاد میں سے تھے۔ جس کا شجرہ نسب گیارویں پشت میں حضرت یعقوبؑ ملتا ہے۔

اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایشیا کا نام انبیاؑ کی اولاد کے ناموں میں سے کسی ایک سے موسوم ہوا جسے بعد میں آسووا، اسو، ایزا اور کبھی ایشا کے ناموں سے پکارا گیا۔ تاہم ایشیا ایک غیر متنازعہ، وسیع تر قطعہ زمین اور ایک بے حد مشہور برِ اعظم ہے۔ یہ پوری دنیا کی ساٹھ فیصد سے زیادہ آبادی والا حصہ ہے۔ جس کی اپنی سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور تاریخی اہمیت ہے۔ برِ اعظم ایشیا رقبے کے لحاظ سے ایک وسیع خطہ ارض ہے۔ براعظم ایشیا میں نوآبادیاتی دور کے آغاز سے پہلے بھی سلطنتوں کی معرکہ خیزیاں رہی ہیں اور برطانوی نوآبادی کا حصہ بننے کے بعد تو ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنھوں نے براعظم ایشیا کی عوام میں شعور بھی پیدا کر دیا۔ انیسویں اور بیسویں دونوں صدیوں میں دنیا بھر میں خاصے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئی۔ چوں کہ ایشیا کا زیادہ تر حصہ انگریز نوآبادیات پر مشتمل تھا اس لیے اس براعظم میں بھی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئی۔ جہاں پر معاشرتی زندگی کے دوسرے عوامل پر ان تبدیلیوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے وہاں پر ایشیائی ممالک کے سفر اور سفرنامے پر بھی گہرا اثر رونما ہوا۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو سفرنامے پر بھی تاریخ کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ایشیا کے سماجی اور سیاسی تاریخ نے اردو سفرنامے پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے زیرِ اثر لکھے جانے والے سفرناموں کی تحقیق کا دائرہ کار ایشیائی اردو سفر کے تاریخی عناصر پر مشتمل ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک کی اندورنی صورت حال، خدوخال، نشیب و فراز، میدانوں، صحراؤں، پہاڑوں، دامنوں گھاٹیوں، ندی نالوں، جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں کے بارے میں معلومات، اُس کی آب و ہوا، زمین کی بناوٹ، زرخیزی، خشکی، تری کے اساس کی مناسبت سے مہیا کی جائے تو اس قسم کی صورت حال اور خدوخال کو علمِ جغرافیہ کہتے

ہیں۔ کسی ملک کی آبادی اور اُس آبادی کا مزاج اُس کی زمین کی ساخت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جس نوعیت کی زمین اور اس کے اجزائے ترکیبی ہوں گے اس قسم کے عوامی رویے، رسم و رواج اور ثقافتی عناصر خاصی حد تک اس کے مناسب ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر کسی علاقے کی آبادی، حیوانات، نباتات اور اس کے حشرات کا تعلق بھی علمِ جغرافیا سے ہوتا ہے۔ جہاں جہاں زمین کی ساخت تبدیل ہوتی جائے گی وہاں پر لوگوں کے رویوں، مزاج اور روایت میں انحراف اور اختلاف ہوتا رونما ہوسکتا ہے۔ جس طرح تاریخ کا علم اپنے اندر بہت زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ اسی طرح جغرافیہ کا علم بھی اپنے تمام تر دائرہ کار کی مناسبت سے پیچیدہ اور وسیع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق علم جغرافیا کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''جغرافیہ وہ علم ہے جو سطح زمین، اس کی آبادی، نباتات، حیوانات اور طبیعی تقسیم کے حالات بتاتا ہے۔ جغرافیا کو ہم تاریخ کا منبع و ماخذ، اس کو پروان چڑھانے اور اس کی تنظیم کرنے والا کہہ سکتے ہیں۔'' (۸۶) کسی ملک کا جغرافیہ تاریخ ساز ہوتا ہے تو کسی ملک کی تاریخ جغرافیا ساز ہوتی ہے۔ تاریخ اور جغرافیا دونوں علوم ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایک علم دوسرے علم پر انحصار کرتا ہے۔ کسی ملک کی سرحدوں کے اندر اُستوار ہونا اس کی جغرافیہ کی ہیئت کے مناسب ہوتا ہے۔ اس طرح تاریخ اور جغرافیہ ایک ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ جس وجہ سے آئے روز ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کے بقول: ''ہنری ٹامس بکل جس نے انگلستان کی تہذیب کی تاریخ لکھی اس نے جغرافیے کو محض نقطۂ آغاز ہی نہ بنایا بلکہ تاریخ کی تہذیب کا انحصار اس پر رکھا اور وہ اپنے دعوے کو مقبول عام بنانے میں بُری طرح سے ناکام ہوئے ہیں۔'' (۸۷) کوئی ملک تو جغرافیائی سرحدوں میں قید ہوسکتا ہے مگر تہذیب و جغرافیائی سرحدوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ کسی خطے میں ایک تہذیب اور ایک سے زیادہ ممالک کی سرحدوں میں پھیلی ہوئی ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق علی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''قدیم عربی شاعری میں جو جغرافیائی تصورات و معلومات موجود ہیں ان سے اسلام سے پہلے کے عربوں کے جغرافیائی مظاہر کے مفہوم اور ان کے علم کی حدود کا اندازہ ہوجاتا ہے۔'' (۸۸)

قدیم عربوں میں جالینوس الصوری ایک اصطلاح تھی۔ یہ اصطلاح بطلیموس کی کتابوں میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ عربی میں اس اصطلاح کا ترجمہ صورۃ الارض کیا ہے۔ عربی زبان کے بعض جغرافیا دانوں نے اپنی کتابوں کے نام اس اصطلاح سے ملتے جلتے رکھے ہیں۔ مشہور مسلم سائنس دان، المسعودی کے ہاں اس اصطلاح کا نام قطع الارض ملتا ہے۔ قطع الارض کا مطلب یوں تو زمین کا ٹکڑا ہے۔ لیکن مزید وضاحت میں اس کا مطلب سیاحت و پیمائش لیا گیا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ اصطلاح رسائل اخوان میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ جغرافیا کے موجودہ تصور سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ جغرافیہ بذاتِ خود ایک وسیع اور پیچیدہ علم ہے۔ جس کی وضاحت اہل عرب کے یہاں مختلف موقع پر مختلف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق گل کا کہنا ہے کہ: ''جغرافیے کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ 'یک موضوعی' تصنیفات قلم

بند کی گئیں، مثلاً کتاب البلدان، صورۃ الارض، المسالک والممالک اور علم الطرق، وغیرہ۔ البیرونی کے نزدیک: ''المسالک'' ایک ایسا علم ہے جس کا تعلق مقامات کا جغرافیہ محل و وقوع متعین کرنے سے ہے۔'' (۸۹)

برِ اعظم ایشیا ایک ایسا بر اعظم ہے جس میں تہذیبی، تمدنی، لسانی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی لحاظ سے تنوع پایا جاتا ہے۔ اس خطے میں ایٹمی طاقت کی صلاحیت رکھنے والے پانچ ممالک ہیں۔ اور تقریباً اتنے ہی ممالک کا سپر پاور بننے کا مستقبل قریب میں امکان ہے۔ مذہبی لحاظ سے بھی اس خطے میں بڑی حد تک تنوع پایا جاتا ہے۔ اس خطے میں اسلام۔ عیسائیت، ہندوازم، جین، بدھست، آتش پرست، دیریت اہم مذاہب ہیں۔ سیاست پر بات کی جائے تو نوئے فیصد ممالک میں جمہوریت کا نظام رائج ہے۔ تاہم جمہوریت میں سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے اُتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ عربی، اردو، فارسی،، اُزبک، ترکی، ہندی، چینی، روسی، جاپانی، ملائی، تھائی، کوریائی اور ویتنامی بڑی زبانیں ہیں تاہم سیکڑوں علاقائی اور صوبائی زبانیں رائج ہیں۔ تہذیب اور تمدن میں قدامت اور جدت کے ساتھ ساتھ ضخامت بھی پائی جاتی ہے۔ برِ اعظم ایشیا میں تہذیب کا رچاؤ آفاقی ہے اور تمدن میں تنوع پایا جاتا ہے۔ تاریخ نویسی کے حوالے سے بر اعظم ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس سلسلے میں بھی یہ برِ اعظم کسی حوالے سے کم نہیں ہے، وسیع تر تاریخی معلومات رکھتا ہے۔

ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کے مطالعات کے پیش نظر مقالہ ہذا میں ایشیا کا جغرافیا، وجہ تسمیہ، اہم حصے اور ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔ علم جغرافیا کے ماہرین ایشیا کو چھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل مذکورہ بالا سطور میں ہے۔ اس طرح ایشیا کا تفصیلی تعارف اور لفظ ایشیا کی وجہ تسمیہ اور اس کا جغرافیا زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ پہلی بار انکشاف ہوا ہے کہ جس خطے میں اہل ایشیا بستے ہیں اس کی تاریخی اور جغرافیائی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ للہٰذا لفظ ایشیا کا مفہوم، معنی اور دیگر مختصر مطالعات پیش کرتے ہوئے ایشیا کا تعارف کرایا گیا ہے۔

ج: سفر نامہ نگاری اور تاریخ نویسی کے فنی، فکری اور اسلوبی مباحث

اردو سفر نامے کے اسلوب اور تکنیک پر تحقیق اور تنقیدی بحث کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ ادبی اور علمی، کاروباری اور تجارتی، سیاسی اور شاہی، جنگی اور مہماتی، خیالی اور تصوراتی کے علاوہ ہجرت و تفریح اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اسفار کی بنیادی پر لکھے جانے والے سفر ناموں کی چند اہم ایسی اقسام ہیں جو سفر نامے کے اسلوب اور تکنیک پر حالات، واقعات اور جغرافیائی مناسبتوں کی وجہ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اردو سفر نامے میں اسلوب کے استعمال ہونے کا تعلق ہے تو اردو ادب کی نثری اصناف سے مختلف ہے لیکن انہی میں سے کسی نہ کسی کے درمیانی سطح کے اسلوب کو استعمال کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے۔ جہاں تک روداد، رپورٹ، خط اور سوانح، خاکہ نگاری کا تعلق ہے تو سفر نامے کا اسلوب ان کے قریب تر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آخر الذکر اصناف میں سے محض کسی ایک صنف یا بیک

وقت کئی ایک اصناف کے اشتراک سے بھی سفر نامہ تشکیل پاتا ہے۔البتہ سفر نامے کا ناول، افسانے اور داستان کی طرح نہ تو پلاٹ ہوتا ہے اور نہ ہی کردار، ایک سے زیادہ جو سیاح ہوتے ہیں وہ بھی منظرِ عام پر نہیں رہتے بلکہ راقم ہی سفر نامے میں دکھائی دیتا ہے۔سفر نامے میں دوسروں کا ذکر تو ہوسکتا ہے مگر باقاعدہ کردار بنا کر پیش نہیں کیا جاتا۔سفر نامہ روداد کی تکنیک میں ہوگا تو اس میں بذاتِ خود راقم پس منظر میں چلا جائے گا۔خطوط کی تکنیک میں لکھے جانے والے سفر نامے، میں مکتوب نگار، مکتوب الیہ کو بھی سیر وسیاحت میں شامل کر لیتا ہے۔ جہاں تک سفر کے سلسلے میں پیش آنے والے حالات کا تعلق ہے تو وہاں تک تو ایسی صورت میں لکھا جانے والا سفر نامہ عصر اور جغرافیائی صورت حال کے زیرِ اثر ہوگا۔جنگوں میں قید ہو کر جانے والے قیدیوں نے بھی سفر نامے لکھے ہیں۔سفارت کاروں نے دوسرے ملکوں میں رہ کر حالات وواقعات سفر نامے کی صورت میں جمع کیے۔کاروباری حباب اور تارجروں نے بھی سفر نامہ لکھنے پر طبع آزمائی کی ہے۔کانفرنسوں میں جانے والے وفود نے بھی سفری حالات کو قلم بند کیا ہے۔سیاسی طور پر ملک سے فرار ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں پناہ لیتے ہیں وہ لوگ بھی سفر نامے لکھ ڈالتے ہیں۔لوگ دوسرے مما لک میں تبلیغ کرنے جاتے یا تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں تو ایسے لوگ اپنے سفر حالات لکھ ڈالتے ہیں۔عمرہ، حج اور دوسرے ملکوں میں زیارات کے لیے جانے والے بھی سفر نامے لکھتے ہیں۔کچھ لوگ خاص تقریبات میں شرکت کے دعوت نامے ملنے کی بنا پر سفر کرتے ہیں وہ بھی اپنے سفری تارثرات لکھ ڈالتے ہیں۔تحقیقی مقاصد کے لیے جانے والے احباب بھی سفر نامے لکھتے ہیں۔کچھ لوگ دوسرے مما لک کی مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں اپنے وطن واپس نہیں آتے وہ بھی سفر نامہ لکھتے ہیں۔ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو روزگار کے لیے سفر کرتے ہیں ایسے لوگ اگرچہ سفر نامے کم ہی لکھتے ہیں۔مگر ان کے سفر کی بیانیہ صورت کی ایسی دلچسپ ہوتی ہے کہ لوگ ان کے سفر کے حالات سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔بعض احباب سفر نامے لکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر ان کا سفر نامہ ادب کے معیارات پر پورا نہیں اُترتا۔سفر نامہ لکھنے کی حالاتِ سفر یا سیاحت کے ذریعے پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔کسی نے بذریعہ ریل یا بذریعہ سڑک سفر کیا ہے تو اس کے سفری مشاہدات زیادہ ہوں گے کسی نے بحری سفر کیا ہے تو اس کے سفری مشاہدات زمینی حقائق سے مختلف ہوں گے۔ہوائی سفر کی صورت میں سفر کے مشاہدات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ سفر کی منزل پر پہنچ کر سفر کے جو حالات واقعات لکھتے ہیں وہ دراصل منزلِ مقصود کے مشاہدات کا ذکر ہوتا ہے۔سفر نامہ نگار پر دوسرے خطوں کی تہذیب وثقافت اس کے مزاج کی ہم آہنگی کے مطابق اثر انداز ہوگی۔یہ ساری تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ جس طرح سفر کے طبعی حالات ہوں گے سفر نامہ نگار کی تکنیک اور اسلوب اُن حالات و واقعات کے مطابق ہوگا۔

سفر نامہ نثر کی ایک صنف ہے جسے لکھنے کے لیے سفر نامہ نگار معروضی وزمانی (عصری) اور مکانی صورت حال کو پیش

نظر رکھ کر سفر نامہ تحریر کرتا ہے۔ ایک سفر نامہ نگار خطوط کی تو کوئی دوسرا روداد کی تکنیک میں لکھتا ہے، کوئی سفر نامہ نگار ڈائری کی تکنیک اختیار کرتا ہے تو کوئی خود نوشت کے انداز میں لکھتا ہے۔ کسی کے سفر نامے پر فکشن کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں تو کسی کے سفر نامے پر شاعری کے؛ کسی سفر نامے کی تحریر پر تحقیق کا رنگ غالب ہوتا ہے تو کسی کی تحریروں پر داستان نگاری کا؛ کسی کی سفر نامہ نگاری پر تاریخ نگاری کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں تو کسی کی تحریروں میں جغرافیائی حالات کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے۔

تاہم ان سب تحریروں میں یکساں بات یہ ہوتی ہے کہ ان میں متکلم واحد کی مشاہداتی حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔

سفر نامہ کی تکنیکی اور فنی بحث کو دیکھا جائے تو سیر و سفر کرنا انسان کا بہت پرانا دستور ہے سفر کرنے والے نئے خطوں، ملکوں اور جزیزوں کی تلاش کے لیے چل پڑتے تھے۔ سیر و سیاحت کے ابتدائی دور میں مسافر یا سیاح ایسی ایسی جگہوں کی معلومات جمع کر کے لاتے تھے جو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہوتی تھیں یا وہ انجانے علاقوں کی ہوتی تھی۔ سفر نامہ لکھنے کا رواج بہت کم تھا اس لیے سیاح اپنے سفر کے قصے لوگوں کو زبانی سناتے تھے۔ سفر کی داستان زبانی سنانے کی وجہ سے سفر نامہ سنانے کی روایت کو فروغ ملا جسے سفر نامہ کی بیانیہ صورت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیر و سیاحت سے واپس آنے والے سیاح عام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ عام لوگ بڑی دلچسپی سے ان کے گرد جمع ہو کر سفر کے قصے سنتے ہیں۔ اس طرح سیاح سفر کے قصے سناتے سناتے درمیان میں مافوق الفطرت باتیں شامل کر لیتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کی حیرت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس بنا پر سچ اور جھوٹ کا ملا جلا سفر نامہ لوگوں کے لیے داستان بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی قدیم قصے کہانیاں اور داستانیں ہیں وہ سب سفر کی بنیاد پر پروان چڑھتی رہی ہیں۔ جیسا کہ قصہ چہار درویش، فسانۂ عجائب، ہومر کی اڈیسی کی بنیاد سیر و سیاحت پر تھی۔ قبل از مسیح سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں سفر نامہ کے لکھنے کی کاوشیں ملتی ہیں مگر جدید دور کے آغاز کے بعد (۱۴۵۳ء) سے ہی دور دراز سفر پر جانے اور سفر کے حالات لکھنے کے عمل میں تیزی آئی۔ جدید دور کے سفر نامہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ کیوں کہ خیالی دنیا یعنی داستان گوئی سے نکل کر سیاح حقیقت کی دنیا کی طرف متوجہ ہوئے۔ جیسا کہ ابن بطوطہ، واسکوڈے گاما، کرسٹفر کولمبس، مافیو پولو اور مارکو پولو کے سفر کے سفر نامے حقیقت پسندی کے بنیاد پر اُستوار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو سفر نامے کا عبوری دور نو آبادیات کے زیر اثر پروان چڑھتا ہے۔ اس دور کے سفر نامے تاریخی اور تہذیبی شعور کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوم کے درمیان میں واقع ہونے والے سفر ناموں کا ذخیر سامنے آتا ہے۔ اس دور کے سفر ناموں میں دنیا آزادی کی لہر کے آنے، ہندوستان کے آزاد اور دولخت ہونے کے واقعات نے اردو سفر نامے پر گہرا اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر آئے ہیں، لہٰذا سفر نامے کے متن میں تاریخی عناصر کا در آنا ایک فطری عمل ہے جب سیاح کسی ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیتا ہے تو اُسے اُس ملک کے سیاسی، تہذیبی،

تاریخی اور سماجی حالات حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی تاریخی عناصر کی اہمیت کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

> سفرنامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالباً کسی ملک کے جملہ حالات جاننے کے لیے تاریخ سے زیادہ توقعات اور طرزِ حکومت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن سفرنامے تاریخ کے ساتھ سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب تہذیبی اور سماجی حالات سے انسان کما حقہ واقفیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لیے ملک کے دوسرے حالات کو سمجھنے اور جاننے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔(۹۰)

قدیم دور کے سفرنامے ایسے ہوتے تھے جو اپنے اندر تہذیبی۔ ثقافتی، معاشرتی اور جغرافیائی صورتِ حال کو ضمن میں لیے ہوئے تھے۔ قدیم دور میں جب سفرنامہ پروان چڑھا تھا تو وقت بے وقت کی ہنگامہ آرائی، جنگ و جدل اور انقلابی نوعیت کے واقعات رونما نہیں ہوتے تھے۔ البتہ دورانِ سفر اکا دکا دلچسپ واقعات ضرور پیش آتے تھے۔ مطالعہ کے دوران یہ نکتہ بھی سامنے آیا ہے کہ اکثر اور بیشتر حالات میں قدیم سفرنامہ ایک پُرسکون صورتِ حال میں فروغ پا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم سفرنامے میں اسلوب عام طور پر تاریخ نگاری کے زیرِ اثر تھا۔ پھر تاریخی عمارتوں کے ذکر بھی سفرنامہ نگاری کے اسلوب میں شامل ہوا۔ جہاں تک جغرافیائی معلومات کا تعلق ہے تو سفرنامہ کا زیادہ زوردار پہلو، جغرافیائی پہلو ہی ہوا کرتا ہے۔ ملکوں کی سیر و سیاحت کے دروان اہل سفر اختیار کرنے کے وقت اور جگہ کی مناسبت سے اسلوب اختیار کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلوب ملکوں اور معاشروں کی مجموعی صورتِ حال کے زیرِ اثر پروان چڑھتے ہیں۔ قدیم سفرنامے کے اسلوب سے قطع نظر کرتے ہوئے جدید سفرنامے کو دیکھا جائے تو سفرنامے کے اسلوب میں تنوع دیکھنے میں آیا ہے۔

سفرنامہ نگار قدرتی مناظر اور تاریخی واقعات سے جس قدر متاثر ہوتا ہے اسی قدر وہ اپنے احساسات کو بھی بیان کرتا ہے۔ داخلی اور خارجی واقعات شامل ہونے کی وجہ سے سفرنامہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر ایک صنف نثر کا اسلوب منفرد ہوتا ہے۔ داخلی اور خارجی واقعات شامل ہونے کی وجہ سے اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر ایک صنفِ نثر کا اسلوب جداگانہ ہوتا ہے۔ ناول اور داستان کے اسلوب و زبان میں فرق ہوتا ہے۔ افسانے اور انشائیے کے اپنے اپنے اسلوب اور اندازِ بیان ہوتے ہیں۔ سفرنامہ کی زبان، اسلوب اور فنی مہارتیں باقی اصناف نظم و نثر سے جدا ہوتی ہیں۔ سفرنامے کو مناظر اور واقعات کی بنا پر مختلف اسلوب میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس میں کہیں سادہ اسلوبِ بیان اور کہیں تاریخی، جغرافیائی، شماریاتی اسلوب اور بعض اوقات تشبیہاتی اور استعاراتی اندازِ بیان بھی استعمال ہوتا ہے۔ سفرنامے کو تکنیکی درجہ بندی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی فنی لحاظ سے کئی ایک درجہ بندیاں کی گئی ہیں۔ سفرنامہ دیگر ادبی اصناف کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ اس بارے میں رائے یوں ہے کہ: ''سفرنا ایسی غیر افسانی (NONFICTIONAL) ''صنف ادب ہے جس میں فکشن کی تنظیم، آپ بیتی کی ذاتیت، رپورتاژ کی قوتِ متخیلہ، انتھروپالوجسٹ کی انسان دوستی، تاریخ کی تحقیقی بصارت جیالوجسٹ کی وسعت، فطرت اور

تخلیق کی جولانیاں شامل ہو سکتی ہیں۔'' (۹۱) واحد متکلم بیانیہ تکنیک کے مطالعہ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ سفر نامہ واحد غائب اور حاضر کے صیغوں کی تکنیک پر بھی لکھا جاتا ہے سفر نامے کی اس تکنیک کے بارے میں سید جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ: ''سفر نامہ چوں کہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں بہت زیادہ تجربوں کی گنجائش موجود نہیں۔'' (۹۲) یہ سفر نامہ نگار پر منحصر ہے کہ وہ سفر نامہ لکھتے وقت کون سی تکنیک اختیار کرتا ہے۔ ہر بار ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ بہت سے باتیں سفر نامہ نگار کی ذہنی ہم آہنگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ واحد متکلم کی تکنیک کے علاوہ بھی سفر نامہ کئی ایک دیگر تکنیکوں میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔ سید جاوید اقبال اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ہمارے زمانے کے سفر ناموں میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا گیا اور وہ ہے اس کا تکنیکی رنگ روپ سفر نامہ اب آپ کو کئی شکلوں میں ملے گا۔ ناول اور افسانے کے انداز میں...... اخباری رپورٹ کے انداز میں...... ڈراما یہ شاعری میں...... آپ بیتی کے انداز میں...... شاعر اور فکشن کے انداز میں۔ (۹۳)

سفر نامے کی بیانیہ تکنیک میں آپ بیتی کی تکنیک غالب رہتی ہے جس سے سفر نامہ دلچسپ تو ضرور ہوتا ہے مگر سفر نامہ نگار کی تحریر خود اُس کے گرد گھومتی رہتی ہے جس وجہ سے سفر نامہ آپ بیتی کا بیانیہ انداز اختیار لیتا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> سفر نامہ ایک ایسا فن ہے جو دوسرے اصناف سے الگ اپنی انفرادیت کا حامل ہے، کیوں کہ ہر سفر نامہ کا سیاح اپنی تحریر میں اپنے حالات سفر اپنے اپنے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے سب ہی سفر نامے دلچسپ ہوتے ہیں لیکن عام طور پر سفر نامہ لکھنے والوں نے اپنے حالات کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ (۹۴)

وقت کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگاری کی ترجیحات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ سفر نامہ تکنیک، اسلوب اور مواد کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا جدید دور میں داخل ہوتا ہے۔ جدید دور سے مقالہ نگار کی مُراد ایسے دور سے ہے جس میں سفر اختیار کرنے اور سفر نامہ لکھنے کے لیے انسان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر آئی ہیں۔ سفر میں سہولیات بڑھنے کی وجہ سے سفر نامہ کی تکنیک میں بھی جدت آئی گئی۔ اردو سفر نامے نے نہ صرف تاریخی اور تہذیبی شعور کی سطح پر ترقی کی ہے بلکہ اس کے فن میں بھی جدت آئی ہے۔ ابتدائی دور کے سفر نامے میں زیادہ تر معاشرتی اور جغرافیائی حالات کا ذکر اکثر مواقع پر آتا تھا۔ تحقیقی مطالعہ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ سفر نامے کا زیادہ تر حصہ سفر کے لوازمات، مشکلات اور ان مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے تجاویز پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں جہاں نئی نئی ایجادات ہوتی ہیں وہاں پر سفر نامے کی صنف میں فروغ دیکھنے میں آتا ہے۔ خاص طور پر سفر نامے کی تکنیک اور اسلوب نے بھی نئی سمت اختیار کی۔ فن کے لحاظ سے سفر نامے کو روز نامچہ کی صورت میں بھی لکھا گیا ہے۔ اس تکنیک کو ڈائری لکھنا بھی کہتے ہیں۔ ڈائری کے انداز میں لکھے گئے سفر نامے

کے بارے میں سید جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ: ''سفر نامہ نگار اگر سفر کے حالات و تاثرات دوران سفر لکھتا چلا جائے تو ایسا سفر نامہ بالعموم ڈائری کی تکنیک اختیار کر لیتا ہے۔'' (۹۵)

ڈائری کی تکنیک میں لکھا جانے والا سفر نامہ زیادہ تر دوران سفر ہی لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کے سفر نامے میں سفر نامہ نگار کا مطمعِ نظر تہذیب و معاشرت اور فطری مناظر کے علاوہ تاریخی عناصر کی تحریری تجربات بھی سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائری کی صورت میں لکھے جانے والے سفر نامے تاریخی عناصر کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح کی تکنیک میں لکھے جانے والے سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ: ''سفر نامہ نگار اگر سفر کے حالات و تاثرات دورانِ سفر لکھتا چلا جائے تو ایسا سفر نامہ بالعموم ڈائری کی تکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ اس قسم کا سفر نامہ نہ صرف تاریخ کا تعین کرتا ہے بلکہ حادثات اور واقعات پر سیاح کا فوری ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔'' (۹۶) تکنیکی اعتبار سے ڈائری کی صورت میں لکھے گئے سفر نامے میں سیاح کسی دوسرے شخص کو اپنے سفر میں شامل نہیں کرتا مگر خط و خطابت یا خطوط نویسی ایسی تکنیک ہے جس کی وجہ سے سفر نامہ نگار اپنے مخاطب کو بھی سفری لوازمات میں شریک کر لیتا ہے۔ اگر یہ رائے دی جائے کہ سیاح اپنے مخاطب کو بھی سیر کراتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ خطوط کی تکنیک کے بارے میں سید جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ: ''دوران سفر لکھے ہوئے سفر ناموں کی دوسری صورت خطوط کی تکنیک میں سامنے آتی ہے۔ ڈائری میں تخلیقی عمل بے ساختہ ابھرتا ہے۔ لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیق مکرر کا وافر عنصر موجود ہے۔'' (۹۷)

خطوط نویسی کی تکنیک میں لکھے گئے سفر نامے کے سفری حالات اس طرح سے سامنے نہیں آتے جس طرح سے دوران سفر لکھے گئے کوائف سامنے آسکتے ہیں۔ خطوط کی صورت میں لکھے گئے سفر نامے کے سفری واقعات کی کڑیاں جوڑنا ایک دشوار مرحلہ ہے جس میں سفر نامہ بعض تخلیقی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ سفر نامے کا مجموعی تاثر اور منطقی ربط متاثر ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر انور سدید کا خطوط کی تکنیک میں لکھے گئے سفر نامے کے حوالے سے یہ کہنا ہے کہ: ''دوران سفر لکھے ہوئے سفر نامے کی دوسری صورت خطوط کی تکنیک میں سامنے آئی ہے۔ ڈائری میں سیاح کسی دوسرے شخص کو اپنے تجربے میں شامل نہیں کرتا لیکن خطوط کا مخاطب تو فاصلے پر موجود ہوتا ہے اور وہ منظر کے حسن میں بالواسطہ طور پر ہی شریک ہوتا ہے۔'' (۹۸)

خطوط نویسی کی تکنیک میں زمانہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ سفر نامے کی یہ ایسی تکنیک ہے جسے تاریخ نویسی کے قریب تر سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط کی صورت میں لکھے گئے سفر نامے میں تجسس کی فضا برقرار رہتی ہے۔

سفر نامہ کے سفری واقعات یا سفری یادداشتوں کو محفوظ کر کے سفر کرنے کے دوران لکھے گئے ہوں۔ یا سفر نامہ، سفر کے اختتام پر لکھا گیا ہو یا پھر سفر نامہ خطوط کے سلسلے سے مرتبہ کیا گیا ہو تاریخی عناصر سفر نامے کا ضرور حصہ بنتے ہیں۔ ایسی

صورت میں سفر نامہ تاریخ نگاری کا اسلوب اختیار کر لیتا ہے۔اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سفر ناموں کی زیادہ تعداد ایسی ہے جو سفری یاداشتوں کے پیشِ نظر لکھے یا لکھوائے گئے ہیں۔ سفر نامے کی اس تکنیک کا دارومدار حافظے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جسے بیانیہ صورت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔اس بیانیہ تکنیک کی وجہ سے سفر نامہ نگار سے واقعات کی ترتیب میں کہیں کہیں فروگزاشت بھی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات واقعات کو اپنی صوابدید سے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سفر نامے میں کئی قسم کے اضافے ہو جاتے ہیں۔قابل ذکر امر یہ ہے کہ بعض اوقات سفر نامہ تجرباتی، مشاہداتی اور مہماتی ہوتا ہے۔اس قسم کی صورت حال کے پیش نظر اپنی مرضی کے مطابق سفر نامے میں اضافوں اور مبالغوں کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔سفر نامہ کی واقع نگاری کی تکنیک کے بارے سید جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ:''سفر نامہ کسی بھی سفر کی ایک ایسی تحریری روداد ہے جسے دوسری جگہ کے واقعات، مشاہدات۔تجربات ومناظرات ہی نہیں بلکہ اب سے زندگی کے لیے کئی راہوں کے تعین میں مدد ملتی ہے۔''(۹۹)

سفر نامے کی واقع نگاری یا یاداشت نگاری کی تکنیک ایسی ہے جو زیادہ تر بعد کے لکھے ہوئے سفر ناموں میں ملتی ہے۔ان فنی نوعیت کے سفر ناموں میں سفر نامہ نگار اپنے مشاہدات قلم بند کرتا ہے۔جن پر دوران سفر اپنا زیادہ وقت دے چکا ہوتا ہے۔سفر نامہ نگار تاریخی ماحول کے جن مشاہدات سے گزرتا ہے انھیں اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتا ہے یا دوران سفر اہم اہم باتیں نوٹ کرتا جاتا ہے،سفر کے اختتام پر انھیں تفصیل سے لکھتا ہے، دنیا کے زیادہ تر سفر نامے اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ایسے سفر نامے معلومات کا بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔سفر نامہ کی چند اہم تکنیکیں کیا ہوسکتی ہیں اس بارے میں خالد محمود لکھتے ہیں کہ:

> سفر نامے میں ایک سیاح اپنے تجربات مشاہدات خود بیان کرتا ہے اس لیے سفر نامہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا، یہ شخص واحد متکلم ہے جو اپنی رودادِ سفر محفوظ کرتا ہے۔رودادِ سفر کو محفوظ کرنے کے لیے سفر نامہ نگار مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ واقعات کو اپنے ذہن میں محفوظ کرے اور سفر نامے لکھتے وقت ان واقعات کو اپنے ذہن سے کاغذ پر منتقل کر لے،لیکن اس طریقے میں یہ قباعت ہے کہ واقعات ذہن سے محو ہو سکتے ہیں۔یوں بھی پے در پے ان گنت واقعات کا خاص تسلسل کے ساتھ یاد رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔اس لیے سفر نامے نگار اپنی یاداشتیں احتیاطاً ڈائری یا روزنامچے میں لکھ لیتا ہے۔اس طریقے کار میں نہ صرف واقعات اپنی سچائی کے ساتھ محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ ان کا پیش منظر سیاق وسباق جزئیات، تاثرات اور فوری عمل کو بھی محفوظ کر لیتا ہے۔اس طور پر لکھے جانے والے سفر نامے میں صداقت کا عنصر زیادہ اور تخیل کی کارستانی کم ہو جاتی ہے۔(۱۰۰)

سفر نامے کی تکنیک واقعہ نگاری یا مرقع نگاری کی ہو یا مواد کے لحاظ سے سفر نامہ کا ترتیب کے لحاظ سے مواد بہترین ہو۔سفر نامے کا اسلوب سادہ ہو تو ان تکنیکوں کی وجہ سے سفر نامہ اعلیٰ معیار تک پہنچ سکتا ہے۔سفر نامہ میں تاثر ہوگا تو ایک کم

پڑھے لکھے قاری کو آسانی سے سمجھ بھی آ سکتا ہے۔ اس طرح قاری سفرنامے کے دلچسپ واقعات سے بھی لطف اندوز ہو سکے گا، جہاں تک سفرنامے میں تکنیک کا تعلق ہے۔ اوّل صورت میں مواد اچھا ہونا چاہیے اور موخر صورت میں سفرنامہ میں واقعاتی ترتیب اور سفرنامے کی زبان میں روانی ہونی چاہیے۔ جہاں تک سفرنامے کا مواد کم تر درجہ ہونے کا تعلق ہے تو اس طرح بہت کم لوگ سفرنامے کو پڑھنے کے لیے مائل ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ سفرنامے کی عمدہ تکنیک بھی سفرنامے کو عمدہ نہیں بنا سکتی جب تک مواد بہتر اور مواد کی ترتیب بہترین نہ ہو۔ اس طرح کی کوشش سے سفرنامے کی تھوڑی بہت خوبیاں بھی پیچیدہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی رائے میں: ''سفر کا عمدہ مواد سادہ انداز میں پیش کر دیا جائے تو قاری کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے لیکن مواد اچھا نہ ہو تو اچھی تکنیک بھی سفرنامے کی داخلی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو سکتی۔''(۱۰۱)

سفرنامے کی ایک تکنیکی خوبی یہ بھی ہے کہ سفرنامہ نگار قوتِ مشاہدہ سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنے تجربات اور محسوسات کی مجموعی صورتِ حال کو سمیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سفرنامہ نگار اپنی فنی مہارتوں سے سفر کے اجزا کو خوبصورت فنی مہارت کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ پورا منظر ایک فلم کی طرح رواں ہو کر قاری کے سامنے چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک فلم سے غیر ضروری اور غیر اہم مناظر خارج کر دیئے جاتے ہیں اس طرح سفرنامہ نگار فنی تکنیک سے سفرنامہ کی چاشنی میں اضافہ کرتا ہے۔ سفرنامے کی اس تکنیک کے بارے میں خالد محمود کی رائے یوں ہے کہ:

> ایک سیاح جب سوچ کر سفر کرتا ہے کہ سفر کے ساتھ ساتھ اسے ایک سفرنامہ لکھنا ہے تو اپنی پسند اور سہولت کے مطابق تکنیک وضع کر لیتا ہے اور اس کی قوتِ باصرہ جس قدر تیز اسی قدر وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر کام کی چیزوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے۔ مناظر و واقعات کا یہی انتخاب اس کی اس بصیرت کا امتحان ہوتا ہے۔ کس چیز کو نظر انداز کرنا ہے اور کس چیز پر زیادہ توجہ صرف کرنی ہے۔(۱۰۲)

اردو سفرنامے کے اسلوب کا کوئی طے شدہ قاعدہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسلوب منفرد ضرور ہوتا ہے جس کی پیروی کر کے کوئی تحریر لکھی جا سکتی ہو۔ اسلوب کا تعلق علاقے اور مصنف کے مزاج اور اس کی طبیعت پر منحصر ہے۔ کسی تحریر کا خالصتاً ذاتی انداز اسلوب کہلاتا ہے گویا اسلوب کسی مصنف کی ذاتی اور مخصوص مہارت ہے جسے بروئے کار لا کر وہ اپنی تحریر کو نہ صرف دوسروں سے مختلف اور منفرد بناتا ہے بلکہ اپنے عہد کا تعین بھی کرتا ہے۔ سفرنامے نگاری میں جہاں قدرتی مناظر، جغرافیائی حد بندی کی تفصیلات اور تاریخ نگاری ہوتی ہے وہاں پر اسلوب نگاری کے حوالے سے تحریر کا موضوع بھی ایک مخصوص اور انفرادی اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب کے سلسلے میں ہے، سفرنامہ نگار نے: ''اپنی پسند کے اسلوب کا انتخاب کیا۔ بعض سفرنامے افسانوی طرز میں لکھے گئے ہیں...... لکھنے والوں نے اپنے سفری تاثرات کو اپنے احباب کے نام خطوط میں...... تو بعض ممتاز لکھنے والوں نے سفرنامے کے لیے رپوتاژ کے اسلوب کو اپنایا...... تو بعض نے سوانحی پیش کش

کے رنگ کو برتا۔بعض نے شعری رنگ اسلوب اپنایا۔''(۱۰۳)

اردو سفرنامے میں تاریخ نگاری ایک رجحان نہیں ہے بلکہ ہر عصر کے سفرنامے کی فطری ضرورت ہے۔جس کی وجہ سے سفرنامہ نگاروں نے تاریخ نگاری کے اسلوب کو اپنائے رکھا تھا۔سفرنامہ نگار تاثرات، حالات اور مشاہدات کو اس طرح تاریخ نگاری کے اسلوب میں بیان کرتا ہے کہ حقیقی تاریخ نگاری کی جھلک سفرنامے میں دکھائی دینے لگتی ہے۔قاری کو سفرنامے اور تاریخ میں امتیاز کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید سوال اُٹھاتے ہیں کہ:''کیا سفرنامہ کسی نئی سرزمین کو دریافت کرتا ہے۔۲۔سفرنامہ کسی ملک کی سماجی یا سیاسی تاریخ مرتب کرنے میں معاونت کرتا ہے۔''(۱۰۴)

سفرنامہ نگار جتنا باریک بین ہوتا ہے مشاہدے کی جزئیات اتنی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ایک عام سطح کا سفرنامہ کسی ملک کے تاریخی حالات، جغرافیائی خدوخال آبادیوں کے چڑھاؤ اور لوگوں کے رہن سہن کے انداز کے بارے میں اعداد و شمار تحریر کرتا ہے۔لیکن حقائق نظر انداز نہیں کرتا کیوں کہ وہ بیک وقت سفرنامہ نگار بھی ہوتا ہے اور تاریخ دان بھی۔

اردو کے قدیم سفرناموں میں بالعموم یہی طریقہ عمل رہا ہے کہ ایسی معلومات باہم پہنچائی جائیں۔جو کہ مستقبل کے مسافروں کے کام آئیں۔انھیں راستے کی مشکلات سے بچائے۔ایک مورخ صفت سفرنامہ نگار سفرنامہ لکھتے ہوئے ملکی صورت حال اور عمارتوں کے نقشہ جات کی تفصیل کو سفرنامے کے لیے لازمی قرار دیتا ہے۔ایک ایسا سفرنامہ نگار جو بیک وقت سفرنامہ نگار بھی ہو اور مورخ بھی اس کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> ایک قسم تو صرف اسی روایتی سفرنامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔موسم کا حال میدانی اور پہاڑی مناظر۔آدابِ معاشرت، حاکمِ وقت کے خدوخال اور اگر وہ بیسویں صدی کا سفرنامہ نگار نے تو غسل خانوں اور ہوٹلوں کا حال مشروبات کی قلت یا فراوانی اور ہر قسم کے شکار کی جملہ تفاصیل اپنے اپنے سفرنامہ نویس جغرافیہ کے بجائے حرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا ہے اور سنے سنائے قصوں کے اظہارِ مکر میں لطف محسوس کرتا ہے۔(۱۰۵)

اردو سفرناموں میں تاریخی واقعات تحریر کرنے کا سلسلہ گزشتہ دو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔سفرنامے میں تاریخی عناصر کے در آنے کا جائزہ لیتے ہوئے مطالعے میں یہ بھی آتا ہے کہ شبلی نعمانی قدیم سفرناموں کے پیشِ نظر اپنے سفر کو بطور سیاح سرانجام دیتا ہے۔دوسرے ممالک کی صورت حال کو جہاں تعلیمی، تہذیبی، سیاسی زاویوں سے دیکھتے ہیں وہاں پر سفرنامہ نگار تاریخی حقائق کو بھی اپنے سفرنامہ کا حصہ بناتا ہے۔اپنے سفرنامے کی جزئیات کا ایک آزاد مشاہدے کرنے والے کی حیثیت سے مرتب کرتا ہے۔اسی طرح عوامی صورتِ حال اور تاریخی احوال کو سفرنامے کی صورت میں قلم بند کر کے معلومات حاصل کرنے کا آسان وسیلہ بنا دیا۔یہ بھی کہ سفرنامے کے قاری کو سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی، تاریخی اور جغرافیائی تمام تر مفصل معلومات ایک جگہ مل جاتی ہے۔سفرنامے میں تاریخ نگاری کے اسلوب کے آنے سے سفرنامے کے

متن میں اہم معلومات کا اضافہ ہوا ہے۔ سفرنامے میں اپنے عہد کی ایک خاص تہذیب، ثقافت اور تاریخ ہوتی ہے جس طرح سفرنامہ نگار پیش کرتا ہے۔ وہ واقعات عام تاریخی کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی بیان کرتی ہیں:

> سفرناموں کی تاریخی اور سماجی اہمیت مسلم ہے۔ سفرناموں سے بہت سے ایسے واقعات اور حادثات کا پتہ چلتا ہے جو عام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے، تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی سفرنامہ ہمارے لیے تاریخ کا ایسا مواد فراہم کرتے ہیں جو بذاتِ خود ایک تاریخ بن جاتے ہیں۔ اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور تہذیب و معاشرت کو ایک سیاح اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ (۱۰۶)

سفرنامہ نگاری کے ساتھ ساتھ جغرافیہ کے علوم کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سفرنامے کا براہ راست تعلق جغرافیہ کے ساتھ استوار ہوتا ہے اس کے بعد تاریخی حقائق سفرنامہ کے مصنف پر واضح ہوتے ہیں۔ جب ایک سیاح اپنے ملک کی سرحدوں کو پھاند کر دوسرے ملک میں داخل ہوتا ہے تو وہ دراصل لاشعوری طور پر ایک جغرافیائی عمل کے تاثر سے دوچار ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ اور جغرافیے کے عمل سے گزر کر سفرنامہ پروان چڑھتا ہے۔ ایک سیاح کو جغرافیائی خدوخال، قدرتی مناظر، تہذیبی، تمدنی اور سماجی معاملات میں ملے جلے حالات تاریخ نگاری پر مائل کرتے ہیں۔ سیاح جب سفر کے لوازمات سے لطف اندوز ہوتا ہے تو اپنے احساسات اور جذبات کا آزادانہ اور حقیقت نگاری پر مبنی اظہار کرتا ہے۔ یہی وجوہات ہیں جن کے باعث سفرنامہ نگار دوسرے ملک کی تاریخ میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ سعید احمد کی رائے اس حوالے سے یہ ہے کہ:

> ابتدائی دور میں سفرنامہ جغرافیائی معلومات کی فراہمی تک محدود تھا۔ اس میں مسافر کو دوران مسافرت جن شہروں اور ملکوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ سفرنامہ میں ان کا جغرافیہ اور محلِ وقوع تفصیل کے ساتھ تحریر کرتا ہے۔ چوں کہ اس کی بنیاد علم جغرافیہ اور ٹھوس حقائق پر استوار تھی اس لیے اس میں دیانت داری، راست گفتاری اور حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ (۱۰۷)

ایک سفرنامہ نگار کسی دوسرے ملک کی تاریخ، تہذیب، تمدن اور جغرافیے میں دلچسپی لیتا ہے۔ سیاح کسی ملک کے پہاڑوں۔ دریاؤں، وادیوں اور میدانوں کی سیاحت کر کے جہاں معلومات اکٹھی کرتا ہے وہاں پر ان ممالک کی سماجی اور سیاسی تاریخ کے حوالے سے بھی کوائف جمع کرتا ہے۔ ایسا سفرنامہ سماجی اور سیاسی تاریخ کے واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے جس کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ ایک ایسا سفرنامہ نگار جو سفرنامے سے گہرا تعلق رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ جغرافیا کی تکنیکوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ مگر پھر بھی سفر کے دوران پیش آنے والے جغرافیائی معاملات کا وہ پوری طرح سامنا کرتا ہے۔ کسی ملک کی موجودہ صورتِ حال بیان یا تحریر کی گئی ہو۔ وہ صورتِ حال ایسے سفرنامے سے مختلف ہوگی جس میں جغرافیائی مسائل بیان کیے گئے ہوں۔ اس طرح سفرنامہ نگار دورانِ سفر جغرافیائی صورتِ حال کو ضرورت کے مطابق بڑھا چڑھا کر بھی پیش کر سکتا ہے اور جغرافیائی ساخت میں کمی بیشی بھی کر سکتا ہے۔ مگر جغرافیائی پیچیدگیوں کو ایک جغرافیہ دان ہی

درست طریقے سے پیش کر سکتا ہے۔ جغرافیائی ساخت کا تجزیہ مختلف چیزوں کے درمیان مشابہت یا اختلاف کی بنا ہر کر سکتا ہے۔ جغرافیہ دان کا موضوع تحقیق کا خارجی علاقہ ہوتا ہے۔ جب کہ ایک تاریخ دان کی تحقیق کا موضوع واقعات کی داخلی جہتیں ہوتی ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کی اہمیت کے بارے میں سعید احمد لکھتے ہیں کہ:

> سفر نامہ نگاری نے محض تاریخ اور جغرافیے جیسے خشک اور بے رنگ بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے سفر کو اپنی باطنی کیفیات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی ہے سفر نامے کے اسلوب اور طریقِ اظہار کی بڑی اہمیت ہے۔ اردو سفر ناموں نے غیر معمولی ترقی کی ہے اس سے سفر نامے کی نوعیت اور خاصیت میں بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے۔(۱۰۸)

تاریخ دان اور جغرافیہ دان تو اپنے اپنے شعبوں کے مطابق تکنیکی پیچیدگیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک سفر نامہ نگار جو ادیب بھی ہو ایک اچھا سفر نامہ نگار ہوتا ہے۔ ایک سفر نامہ نگار کے لیے یہ بات ضروری نہیں کہ سفر نامے میں تاریخ نگاری کرتے ہوئے تاریخ نگاری کے تمام لوازمات پورے کرے۔ کیوں کہ تاریخ اس کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد سفر نامہ لکھنا ہوتا ہے۔ سفر نامہ کے مصنف کو دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سفر نامہ تحریر کرتے وقت جب مصنف کو تاریخی عناصر اپنی طرف متوجہ کریں تو سفر نامہ نگار صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے تاریخ کی کتب سے رجوع کرے گا اور لکھی لکھائی تاریخ کو سفر نامے کے بعض حصوں میں شامل کر دے گا۔ ایسی صورت میں سفر نامہ میں آنے والے تاریخی عناصر حقائق پر مبنی نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ تاریخی حقائق کا انحصار جہاں تحریر شدہ تاریخ پر ہوتا ہے وہاں سفر نامہ نگار کے ذاتی مشاہدے کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ ایک ایسا سفر نامہ نگار جو اپنے زمانی اور مکانی حالات سے آگاہی رکھتا ہے اور گہری دلچسپی لیتا ہے وہ تاریخی حقائق کو اس زمانے میں پیش آنے واقعات سے اخذ کرتا ہے۔ ایسے تاریخی عناصر حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں جس کا ذکر کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ہو سکتا۔ مگر مقالہ نگار کے مطالعہ میں کچھ سفر نامے ایسے بھی آئے ہیں جو ایک ہفتہ کی سیاحت کے دورانیے کے ہیں۔ مگر ان سفر ناموں کی ضخامت بلاوجہ ہے۔ یہ سب دوسری تاریخ کی کتب سے تاریخی عناصر مرتب کر کے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس طرح مصنف کی اپنی کاوش حق پر مبنی تاریخی عناصر کے سلسلے میں بہت کم نظر آتی ہے۔ سفر ناموں اور تاریخ کی کتب میں تاریخ کے مابین اشتراک و افتراق کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ حقیقتِ حال اور سچائی تک پہنچا جا سکے۔ جب ایک سفر نامہ نگار جو تاریخی عناصر کو تاریخ کی کتب سے سفر نامے میں جگہ دیتا ہے تو اس میں اُس کا تجربہ اور مشاہدہ کم شامل ہوتا ہے اور تاریخی کتب کا مطبوعہ مواد زیادہ شامل ہوتا ہے۔ تاریخ نگاری اور سفر نامے میں فرق بیان کرتے ہوئے قدسیہ قریشی لکھتی ہیں کہ: ''تاریخ اور سفر نامہ میں یہ فرق ہے کہ تاریخ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ مواد سے ترتیب دی جاتی ہے، جب کہ سفر نامہ سیاحت کے حالات و واقعات، مشاہدات تجربات کو پیش کرتا ہے اور جغرافیائی حالت بھی بیان کرتا ہے۔''(۱۰۹)

وہ معروضی حالات و واقعات تاریخ پر مبنی تاریخی عناصر کے زمرے میں آتے ہیں جن کا سفر نامہ نگار مشاہدہ کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کا اگر تاریخ نویسی ذاتی دلچسپی کا معاملہ ہے تو وہ تاریخی عناصر کی اہم جزیات سفر نامے میں قلم بند کرتا ہے۔ اس امر میں وہ ذاتی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔ غیر جانب داری اور صبر و تحمل کا اعلیٰ سطح پر مظاہر کرتے ہوئے نتائج کا منتظر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر سفر نامہ نگار کے سفر نامہ کے مجموعی مواد کو دیکھا جائے تو وہ تاریخی عناصر اور واقعات کو اتنی خوش اسلوبی سے مرتب نہیں کرتا جتنا ایک پیشہ وارانہ تاریخ دان کو مہارت ہوتی ہے۔ ایک سفر نامہ نگار سفر نامے میں ایسے تاریخی واقعات کو جگہ دیتا ہے جن واقعات کی سفر نامے میں حقائق کی ضرورت ہوتی ہے یا کہ وہ جس نقطہ نظر سے سیاحت کے دوران مشاہدہ کرتا ہے، تاریخی واقعات اُس بہاؤ اور تسلسل میں بیان کر دیتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے ذریعے بیانیہ کی تکنیک میں سفر نامے میں داخل ہو جاتی ہے۔

سفر نامہ کا تاریخ نگاری یا تاریخی واقعات سے بالواسطہ تعلق نہیں ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار کا رخ سفر نامہ لکھتے وقت بلاواسطہ طور پر تاریخی واقعات کی طرف ہوتا ہے۔ تاریخی حقیقتوں کو ایک سیاح اسی لیے پیش کرتا ہے کہ وہ ان کا قریب سے مشاہدہ کر چکا ہے۔ کچھ واقعات اس کے شنیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق رائے قائم کرنے کے بعد حالات اور واقعات کو وہ سفر نامے میں قلم بند کر دیتا ہے۔ سفر نامہ نگار اس بات کا محاکمہ نہیں کرتا ہے کہ ان میں سے کون سا واقع صحیح اور کون سا غلط ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں مختلف ملکوں کے تاریخی حقائق تاریخ کی کتابوں میں موجود بھی ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسے واقعات کی بنیاد تاریخ کی حقیقتیں ہوتی ہیں۔ سفر نامہ نگار حالات و واقعات دلکش اور خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے تو یہ اُس کی فنی مہارت ہورتی ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں کہ: ''سیاح ایک چیز کو اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس میں بعض چیزیں غلط ہو جائیں وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتا، اس واقعہ کے تاثر کو، اس کی اہمیت کو جس انداز سے دیکھتا ہے، اس طرح اس کو پیش کر دیتا ہے۔'' (۱۱۰) تاریخ کے کسی واقع کے غلط یا درست ہونے کا اندازہ لگانا سفر نامہ نگار کے ذمے نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی سفر نامہ نگار تاریخی واقعات کی زمانی ترتیب کا خیال رکھتا ہے۔ تاریخ نویس کی رو سے جو علاقہ مورخ کا ہوتا ہے ایک سفر نامہ اُس میں دخل اندازی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ مشاہدات کے تاثرات کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے اس لیے تاریخ عناصر کو بیان کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کے بیان کردہ عناصر کو تاریخ کے تناظر میں تلاش تو کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی واقعات، اسباب اور نتائج کے تجزیہ پر مکمل طور پر اعتبار کرنا کسی قدر تحقیقی نکتہ نظر سے ناقص عمل ہے۔ اس حوالے سے خالد محمود کا اقتباس قابلِ ذکر ہے کہ:

> سفر نامہ تاریخی دست ویز نہیں۔ تاریخ کو ربط کے ساتھ کرنے کی اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ سفر نامہ نگار تاریخ کو صرف چھو کر دیکھتا ہے ایک مورخ کی طرح تاریخی واقعات کو زمانی تناظر میں رکھ کر دیکھنا اس کا شیوہ نہیں وہ تو بس تاثراتی اشارے فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے سفر نامہ کے تاریخی شعور اور

واقعات کے تجزیاتی عمل پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔(۱۱۱)

موجودہ دور کا سفرنامہ نگار اس بات سے غافل نہیں ہوتا کہ سفرنامہ میں دیئے گئے تاریخی واقعات صداقت اور حقیقت پر مبنی ہونے چاہیے۔اس نکتہ نظر سے تاریخی واقعات کو وہ سفرنامے کا حصہ بناتا ہے۔

سفرنامہ نگار ایسے عمل میں غیر ذمہ داری کا مرتکب نہیں ہوسکتا کہ ایسی معلومات جن کا حقیقت سے تعلق نہ ہو انھیں سفرنامے میں سمودے۔ایسا سفرنامہ نگار جو ایک شاعر اور ادیب بھی ہوتا ہے سفرنامے کے مواد کو اس انداز سے ترتیب دیتا ہے کہ کسی تنقیدی مکتبۂ فکر کا سامنا نہ کرنے کا متحمل ہو سکے۔اپنے فرائض کو تخلیقی انداز میں نباہتا ہے، وہ تحقیق کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ہے اور تخلیق میں بھی اپنی مہارت بروئے کار لاتا ہے۔سفرنامہ نگار کا مقصد سفرنامہ تخلیق کرنا ہوتا ہے اس لیے سفر کے حالات و واقعات کو سفرنامے کے مواد پر غالب نہیں آنے دیتا۔خالد محمود کا بیان اس حوالے سے یوں ہے کہ: ''تاریخی واقعات میں اس قسم کی اغلاط زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔تاریخ سے انسان کی ذاتی وابستگی ہے اس کے سبب سے غلطیوں کے نقصان دہ نتائج نکلتے ہیں۔چنانچہ صحیح طریقے یہ کہ کسی کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے سے پیشتر تحقیق ضرور کی جائے۔سفر نامہ کے تاریخی حصوں میں احتیاط زیادہ ضروری ہوتی ہے۔''(۱۱۲) سفرنامہ نگار کا موازنہ مورخ سے اس لیے کرنا درست نہیں ہے کہ سفرنامہ نگار تاریخی واقعات کی تحقیق کی گہرائی میں نہیں جاتا، بلکہ تاریخی واقعات باقاعدہ کسی سند اور تصدیق کے مطابق پیش کرتا ہے۔زیرِ نظر مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ سفرنامہ نگار کے تاریخی عناصر کی کتب کے ذریعے تصدیق کی جائے۔ تاہم قدسیہ قریشی کا زیرِ نظر اقتباس قابلِ غور ہے کہ:

> مورخ کے یہاں جذبات واحسات یا اشاروں اور کنایوں کی کوئی گنجائش نہیں، وہ تاریخ اور سنہ کے ساتھ مُردہ واقعات کی کھتونی تیار ہے۔ان کو مُردہ واقعات اس لیے کہا گیا ہے کہ مورخ صرف گزرے ہوئے واقعات ہی قلم بند کرتا ہے، کل کیا ہونے والا ہے وہ نہیں لکھ سکتا۔اس لیے کہ وہ تاریخ نہیں ہوگی۔اس طرح تاریخی دن، وقت، تاریخ اور سنہ کے ساتھ کسی واقعہ کی بے جان داستان ہے۔(۱۱۳)

کسی مصنف کی تاریخ نگاری کے بارے میں ایک نکتہ نظر ہے کہ سفرنامے نگاری میں تاریخی نگاری کا عمل ایک طرح سے تاریخی نگار کے رجحان کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔یہ رجحان اُس وقت زیادہ واضح صورت میں منظرِ عام پر آتا ہے جب ایک سفرنامہ نگار ایشیا میں نوآبادیاتی دورِ اقتدار پر تاریخ کے پہلوؤں پر مختلف زاویے سے نگاہ ڈالتا ہے۔اُس وقت برصغیر کے ادیب نہ صرف مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھ رہے تھے بلکہ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجم کر رہے تھے۔ایشیائی مما لک سے مواد حاصل کر کے کتابوں کی تصنیف و تالیف میں بھی مصروف کار تھے۔اس طرح ایشیائی مما لک کی تاریخ اور تہذیب نے برصغیر کے محققین کو خاص طور پر متاثر کیا۔تاریخ اور تہذیب کے چھپے ہوئے مواد کو تحقیق کے ذریعے منظرِ عام پر لایا۔سفرنامہ نگاروں نے نہ صرف انگریز کے عہد کی تاریخ نگاری پر لکھا بلکہ تقسیم کے بعد کے سفرناموں میں بھی تاریخ نگاری

کے ذریعے تاریخی عناصر کو سفرناموں میں سمویا۔ حقیقت یہ ہے کہ سفرنامہ نگار جب کسی خطے یا ملک کا سفر کرتا ہے تو اس کے پیش نظر متعلقہ ملک کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ وہ اس ملک کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وثقافت کا مطالعہ بھی کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ایک مسافر پر تاریخ کے حالات وواقعات حاوی ہو جاتے ہیں۔ تاریخ نگاری نے سفرنامے میں اس قدر مضبوط سطح رجحان کی صورت اختیار کی کہ کوئی سفرنامہ نگار ایسا نہیں ہوتا جو کسی ملک کا سفرنامہ لکھتے ہوئے تاریخ کے دریچوں کو نہ چھوا ہو۔ اس لیے سفرنامہ میں تاریخ نگاری ایک ایسا رجحان بھی ہے اور ایک طرح کا اسلوب کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ خالد محمود اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> تقسیم کے بعد پاکستان کے بیشتر سفرنامہ نگار مخصوص عصری رجحانات اور طبعی میلانات کے زیر اثر ایک ایسی تخلیقی روش پر گامزن ہو گئے تھے جس میں بڑی حد تک یکسانیت کے علاوہ سفرنامہ نگار کی ذات کو فوقیت اور تخلیقی اسلوبِ نگارش کو غلبہ حاصل ہوا چنانچہ پاکستان کے نمائندہ سفرنامہ نگاروں کے مطالعہ سے پاکستانی سفرنامے کے مجموعی رجحان، رویے اور روش کا بخوبی انداز ہو جاتا ہے۔ (۱۱۴)

تاریخ کی اقسام کے مقابلے میں سفرنامے کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے سامنے ابتدائی یا عبوری دور کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ روایتی سفرنامے کے علاوہ مذہبی نوعیت کے سفرنامے بھی ہر دور میں آتے ہیں۔ مگر سفرنامے کی مذکورہ اقسام تاریخی سطح کے مواد اور معلومات کی متنوع صورتِ حال کی حامل ہیں۔ سفرنامہ کسی بھی دور کا کیوں نہ ہو سفرنامہ نگار شعوری لاشعوری طور پر اس کے متن میں تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، معاشی، سماجی، سیاسی، مذہبی، تاریخی اور جغرافیائی صورت حال کو سموتا رہتا ہے۔ کسی علاقے، خطے یا ملک کی فطرت وندرت، جنگ وامن، عادات واطوار، رسم ورواج، رہن سہن، تعلیم وتربیت نظم وضبط، فن وفکر جیسے امور کو بھی سفرنامہ کا لازمی جزو تصور کیا جاتا ہے۔ سفرنامے کے مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ سفرنامے ناول کے اسلوب میں بھی لکھے گئے ہیں۔ باقاعدہ ایک دو نظم کی صورت میں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا سفرنامے میں جتنی جہات ہوں گی سفرنامے کو اُتنی ہی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ بات پایۂ تکمیل تک اُس وقت پہنچے گی جب سفرنامے کی یہ انواع تحقیق کر کے ثابت کی جائیں گی۔ جہاں تک سفر کے رجحان میں سمت کے تعین کا معاملہ ہے تو قبل از مسیح میں سفر اختیار کرنے کی صورت میں سامنے آتی ہے، اس عرصے میں سفر کی مرکزیت ترجیح بنیادوں پر ایشیائی ممالک کو حاصل تھی۔ سفرنامے کی نوعیت کے لحاظ سے دورانیہ قبل از مسیح کے پہلے پہل کا ہے۔ چنانچہ قدیم دور میں اہل سیاح مغرب سے مشرق کی طرف سفر اختیار کرتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ سفر وسیاحت کی ترجیحات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قبل از مسیح کے بعد اور خاص طور پر اسلامی دور کے سفرناموں میں فنی اور فکری تبدیلیاں رونما ہوتی دیکھائی دیتی ہیں۔

سفرنامے کی تقسیم میں وہ سفرنامے جو نوآبادیاتی دور میں لکھے گئے ان سفرناموں کو ایک الگ عہد تصور کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے سفرناموں میں جہاں سفرنامے کے فن میں تبدیلی رونما ہوئی وہاں پر فکری سطح پر بھی تبدیلیاں رونما ہوئی۔ کیوں کہ

اس دور میں سائنسی ایجادات نے ان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ بقول انور سدید:
''ہندوستان کی جادوئی کیفیت اپنا اسرار کھو بیٹھی اور اس کی جگہ مغربی تہذیب نے لے لی جس میں سائنسی ایجادات نئی نئی حیرتوں کو جگا رہی تھی۔ اس تحیر کو یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے نے مجسم کر دیا تھا۔ چنانچہ سرسید کے دور میں یورپی ممالک کی سیاحت کا رجحان روز افزوں ترقی پانے لگا۔'' (۱۱۵)

اردو سفرنامے کو ادوار کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ہمارے مطالعہ میں اردو سفرنامے کا سنہری دور یا جدید دور ہے۔ جدید دور کے سفرنامے کا آغاز نوآبادیاتی دور سے ہوتا ہے۔ حقیقت میں جدید سفرنامے کا آغاز بھی نوآبادیاتی دور میں ہی ہوتا ہے مگر اس دور کے سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ سیاح کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف ہو گیا تھا۔ یعنی سیاح اب اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مغربی ممالک کے سفر اختیار کرتا تھا۔ جدید سفرنامے کا دورانیہ قیام پاکستان سے دس سال پہلے اور دس سال بعد کا ہے۔ سفرنامے میں قیام پاکستان کے بعد جو تبدیلی آئی وہ پاکستانیت کی شناخت کے انداز میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ سفرنامہ میں ایک بڑی تعداد اُن سفرناموں کی ہے جو مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لیے کیے گئے۔ خاص طور پر مسلمانوں نے جو سفر حج کے سلسلے میں کیے ہیں وہ کسی بھی مذہب کے مقابلے میں کیے جانے والے اسفار سے زیادہ ہیں۔

تاریخ کا تعلق جغرافیا سے اور جغرافیا کا تعلق سفرنامے سے جوڑا گیا ہے۔ اس دوران جغرافیا کا تعارف، مباحث اور جغرافیا کی اہمیت کے ساتھ ساتھ سفرنامہ کی نئی اقسام اور جغرافیا کا سفرنامے سے تعلق، سفرنامے کی مختلف تکنیکیں اور دیگر پہلوؤں زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جغرافیائی ساخت کا سفرنامے پر اثر انداز ہونے کا دائرہ کار۔ کسی ملک کی جغرافیائی اہمیت اور سفرنامے کے تاریخی واقعات کا خطے کی جغرافیائی حالات کے پیشِ نظر اثر انداز ہونے کا امکان بھی مطالعہ کا حصہ رہے ہیں۔ سفرنامے کے فنی، فکری اور اسلوبی مباحث کی صورت میں اصطلاح ''اسلوب'' کی مختصراً تعریف و توضیح کی گئی ہے۔ زیرِ نظر باب کے آخر میں تاریخ کی اقسام کی وضاحت کرتے ہوئے تاریخ کی چند اقسام کا تعارف، ایشیائی اردو سفرنامہ کی روایت اور ان سفرناموں کا مختصراً تعارف بھی زیرِ مطالعہ رہا ہے۔

د: منتخب ایشیائی اردو سفرنامہ: تعارف، روایت اور تاریخی عناصر کی اہمیت

پرانے زمانے میں سفر اختیار کرنا بہت مشکل کام تھا، جب سفر کے لیے لوازمات اور آشائشیں نہ ہونے کے برابر تھی۔ لوگ کئی دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں سفر کی حالت میں رہے تھے۔ اتنا ہی وقت سفر کی تیاریوں میں بھی لگتا تھا۔ گزشتہ زمانے میں سیاحت اور تفریح کی غرض سے سفر نہیں کیا جاتا تھا بلکہ تجارت، سفارت، تعلیم، روزگار اور ہجرت کے لیے سفر اختیار کیے جاتے تھے۔ سفر سے لوٹنے کے بعد مسافر اپنے سفر کے تاثرات دوسروں کو اپنی زبانی سناتا تھا۔ اسی وجہ سے سفر کی بیانیہ یعنی کہانی کے انداز میں سفر کی روداد سنانے کی روایت پڑی۔ آہستہ آہستہ یہ کہانیاں، داستان کی صورت اختیار کر لیتی

تھی۔ انھیں مزید لطف اندوز بنانے کے لیے مسافروں نے اپنے سفر کے تجربات اور مشاہدات میں کچھ مافوق الفطرت عناصر کی آمیزش کی جس کی بنا پر سفر کی داستان پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ دلچسپ ہوتی گئی۔ دوسرے ملکوں کے سفر سے لوٹنے والے مسافر دوسرے ملکوں کی عالیشان عمارتوں، بہادر اور مہم جو شہزادوں اور خوبصورت شہزادیوں کے واقعات کو مزید طلسماتی رنگ میں پیش کر کے داد حاصل کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کی تہذیب، ثقافت، تعلیم، مذہب اور معاشرے کی صورتِ حال کی تفصیل بھی بیان کرتے تھے۔ اہل یورپ نے ایشیا اور افریقہ میں سفر کیے اور ان ممالک کی داستانیں اپنے ملک میں جا کر بیان کی، اہل عرب نے ایشیا اور یورپ کے سفر کی داستانیں بیان کیں۔ اور اسی طرح اہل ایشیا نے یورپ، افریقہ اور ایشیا کے حالات و واقعات بیان کیے۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کے سفر کا سلسلہ تیز ترین ہو گیا تھا اس کی وجہ یہ ہے دین کی رو سے سفر اختیار کرنا ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے بھی آسمانی مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمدؐ ہر ایک کے سفر کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا تو سوچے سمجھے منصوبے کی تحت جنت سے زمین پر بھیجا، یوں آدمؑ کا جنت سے زمین پر پہلا سفر صادر ہوا جس کا سفر نامے کی صورت میں خود اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ آدمؑ کو زمین پر بھیجنے کا سبب کوئی بھی ہو انسانی تاریخ میں سفر نامہ کی روایت میں اسے اوّلیت حاصل ہے۔ سفر نامے کی روایت کے بارے میں پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مختلف اوقات میں مختلف سفر کیے، حضرت نوحؑ کا پانی پر پہلا سفر بحری سفر تھا اور حضرت یوسفؑ، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰؑ کے برّی اور بحری اسفار، سفر نامے کی روایت میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرزد ہونے والے اسفار بھی آج کے دور کی مناسبت سے بحری، بری اور ہوائی تین جہات میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا سفر کی مذکورہ اقسام صرف آج ہی مستعمل نہیں ہیں بلکہ اس سے پہلے بھی پیش آ چکی ہیں۔ خدائی حکم کے مطابق بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے جو سفر کیے وہ کم آزمائش میں دالنے والے نہیں تھے۔ حضرت موسیٰؑ کفر کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو گئے اور اللہ کی منشا کے مطابق اپنی قوم کو فرعونِ مصر سے آزاد کرایا۔ فرعونیوں سے قوم کو بچا کر لے جاتے ہوئے راستے میں بحر حائل ہوا تو اللہ کے حکم سے اس نے راستہ فراہم کیا۔ حضرت یونسؑ نے اللہ کی رضا کے خلاف عمل کیا اور سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کے ظلم وستم کے ہاتھوں مجبور ہو کر کنعان سے مصر کی جانب ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔ اس طرح سفر اور سفر نامہ کی روایت میں انبیاؑ کی قائم کردہ مثالیں اہم ہیں۔ بنی نوع آدم کے لیے سفر کا حکم سیروفی الارض بہت بعد میں صادر ہوا۔ پیغمبرانِ خدا کے اسفار میں حضرت ابراہیمؑ کا سفر بھی سفر نامہ کی روایت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلا سفر مکہ کی سرزمین پر حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیل کے ہمراہ وادیٔ صفاو

مروہ میں کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دوسری بار بھی اللہ کے حکم سے مکہ کی وادی کا سفر اختیار کیا اور اس میں اللہ کا گھر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

سفر کی روایت میں مقدس ہستیوں کے سفر کو دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ ہستیاں اللہ کی رضا کی خاطر سفر میں سرگرم رہی ہیں۔ دیگر عظیم انبیاؑ کی طرح حضورؐ کو بھی سفر اختیار کرنا پڑے۔ بلکہ آپؐ نے بہت زیادہ سفر اختیار کیے۔ نبوت کے بعد آپ کا پہلا سفر زمین سے آسمان کی طرف ایک روحانی سفر واقعہ معراج کی صورت میں پیش آیا۔ اس سفر کی یہ خوبی تھی کی صرف یہ سفر زمین سے آسمان کی سمت پہلا سفر تھا بلکہ یہ سفر زمان و مکاں سے بالاتر تھا، یہ سفر مادہ اور ماہیت پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔ ظہورِ نبوت سے قبل آپؐ نے تجارت کی غرض سے زیادہ تر شام کے ملک کے سفر کیے۔ پھر کچھ سفر آپ نے دفاعی مقاصد کے لیے بھی اختیار کیے اور اس سب کچھ سے بڑھ کر آپ کو مکانی اور تاریخی سفر مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی صورت میں پیش آیا۔ اس سفر میں آپ کی ذاتِ اقدس کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ المختصر زمین سے آسمان کی طرف آپ کا سفر انفرادیت کا حامل ہے۔: ''واقعہ معراج نبی اکرمؐ کے روحانی سفر ایک ایسی روداد ہے جس میں اللہ کے برگزیدہ بندے نے تمام خلائی حد بندیوں کو عبور کیا۔'' (۱۱۶)

اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کے سفر کی روایت کے علاوہ عوام الناس کے سفر کی روایت کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود سفر کی آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس آزمائش سے باہر بھی نکالتا ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ بھی سفر کے حوالے سے معاملہ اس صورتِ حال سے جدا نہیں ہوتا۔ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی قوت ارادی اور ثابت قدمی کی بنا پر سفری مصائب کا سامنا کرتے ہیں۔ گو کہ معاملہ کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے مگر ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال رہتی ہے۔ سفر اور سفرنامے کی راویت کے تقریباً سبھی قدیم تہذیبوں کے ادب میں شواہد ملتے ہیں۔ ہندوستان کی طرف آریاؤں نے پیش قدمی کی اور اس پیش قدمی کے نتیجے میں دراوڑیوؤں نے جنوبی اور مشرقی ہند کی طرف سفر اختیار کیے جن کا ذکر رمائن میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کے لوگوں نے اپنے زمانے میں جو سفر دور دراز کے ملکوں کے کیے ان کا ذکر بھی رمائن، مہابھارت، پرانوں، ویدوں، جاتکوں اور دیگر پرانی کتابوں میں موجود ہے۔

سفر کی جوں جوں ضرورت زیادہ محسوس ہوتی گئی توں توں سامانِ سفر میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ پیدل سفر میں جب دقتیں پیش آئیں تو انسان نے سفری سواری کے جانوروں سے مدد حاصل کی۔ جانوروں کی سواری سے آگے کی سوجھی تو پہیے کی ایجاد عمل میں آئی۔ پہلے پہیہ پتھر کا بنایا گیا پھر زیادہ سہولت میسر آئی تو پہیے لکڑی اور ربڑ کے بنائے گئے۔ انسان کو پانی پر دسترس حاصل کرنے سوجھی تو کشتی اور چپو ایجاد کر ڈالا۔ اس کے بعد بادبانی اور دخانی کشتی آئی، بحری جہاز اور پھر بحری بیڑے بنے یوں انسان کا گہرے پانیوں اور سمندروں پر بھی قبضہ ہو گیا۔ پھر فضا میں اُڑتے پرندوں کو دیکھ کر زیادہ متجسس ہوا تو ہوائی جہاز اور خلائی طشت ایجاد کر ڈالے۔ اس طرح زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ سفری احتیاجات میں بھی اضافہ ہوا۔ جہاں تک سفر کی پہیے کی ایجاد کے ساتھ مناسبت ہے۔ وہ اس طرح کہ پہیہ دنیا کے کسی خطے میں بھی ایجاد کیوں نہ ہوا ہو یہ بہت جلد

ہندوستان پہنچا اور یہاں کے لوگوں نے اس کی ایجاد سے بھر پور فائدہ اُٹھایا۔ پہیہ کب اور کہاں ایجاد ہوا اور ہندستان کی سر زمین پر اس کا رواج ہونے کے بعد پہیے کی ایجاد نے اہم اثرات مرتب کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ہندوستان قدیم زمانے سے پہیے کی اہمیت سے آشنا تھے۔ یوں پہیے کے توسط سے زمینی سفر میں ایک نئی سہولت میسر آئی۔

انسان کی گہرے سمندروں پر سفر کی خواہش دھات کے زمانے سے کچھ قبل چپو کی ایجاد کے ساتھ ہی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ یوں خشکی کے ساتھ ساتھ تری پر بھی انسان نے سفری کارنامے انجام دینا شروع کر دیے۔ اس طرح جو سمندر پر سفر کی روایت پڑ چکی تھی اُسے عملی جامہ دھات کے زمانے سے تھوڑا پہلے کے آدمی نے پہنایا: ''جب دھات کا زمانہ آیا چپو کی ایجاد عمل میں آ چکی تھی اور انسان نہ صرف برّی سفر پر قادر ہو چکا تھا بلکہ اب اس نے دریاؤں اور سمندروں پر بھی حکمرانی حاصل کر لی تھی۔'' (۱۱۷)

جیسا کہ سکندرِ اعظم (۳۵۶۔۳۲۳ ق م) نے قریب قریب ۳۲۳ قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ سکندر کے حملہ کا دفاع راجہ پورس نے اپنے جنگی ہاتھیوں سے کیا جس میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن راجہ پورس اور سکندر کے مابین گہری دوستی استوار ہو گئی تھی۔ سکندر تو واپس ہوتے ہی فوت ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد کے فرمانروا نے سکندر کے ساتھ دوستی کی بنیاد پر قائم کردہ سفارتی تعلقات کو تہذیبی، تجارتی اور سیاسی بنیاد پر نئے سرے سے استوار کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ: ''میگس تھنیز نے اس رشتے کو جو سکندرِ اعظم نے یونان اور ہندوستان کے درمیان قائم کیا تہذیبی اور سفارتی سطح پر استوار کرنے کی کوشش کی۔'' (۱۱۸)

میگس تھنیز کا ہندوستان میں قیام چند روزہ نہیں تھا اور نہ ہی ایسا ہوا کہ وہ ایک دو ماہ یہاں رہ کر واپس چلا گیا ہو۔ بلکہ اُس کا ہندوستان میں قیام ایک طویل دورانیے پر مشتمل تھا۔ جس کی صورت میں اُسے ہندوستان کے عوام کو نہ صرف قریب سے دیکھنے کا موقع ملا بلکہ اُس نے مقامی لوگوں کی تہذیب و معاشرت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ میگس تھنیز نے اپنے مشاہدات کو کتابی شکل میں پیش کیا۔ یوں سفرنامے کے تاریخی شعور کی روایت میں میگس تھنیز وہ پہلا شخص ہے جس نے سفر کو ادبی سطح کی زندگی سے ہم کنار کیا: ''میگس تھنیز کئی سال تک رہا اور اس نے ہندوستان کے حالات کا مشاہدہ کیا اس نے اپنی کتاب ''انڈیکا'' (Indica) میں ہندوستان اور یہاں کے رہنے والوں کے بارے میں تفصیلی حالات تحریر کیے۔'' (۱۱۹) میگس تھنیز نے ۳۰۲ قبل از مسیح میں ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اس دور میں دارالحکومت کا نام پاٹلی پتر تھا اور چندر گپت کی حکومت تھی۔ حقیقت میں مگس تھنیز سکندر اعظم کی طرف سے مقرر کردہ سفیر تھا جو سفارتی مقاصد کی انجام دہی کے لیے سلسلے میں بھیجا گیا تھا۔ جو نہ صرف ہندوستان میں طویل عرصہ رہا بلکہ اس نے ہندوستان کے حالات و واقعات کا بہت قریب سے جائزہ لیا۔ اس حوالے سے خالد محمود کا زیر نظر حوالہ قابل ذکر ہے: ''میگس تھنیز کا سفرنامہ چندر گپت موریہ کے دور کا ہے جس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور اقتصادی حالات کے نقوش صاف اور گہرے نظر آتے ہیں۔ تمام

مورخین نے اس کتاب کو بے حد معلوماتی سفرنامہ قرار دیا ہے۔'' (۱۲۰)

سفرنامے کی روایت میں میگس تھنیز کا نام اہم ہے۔ وہ چندر گپت موریہ (۳۲۲ تا ۲۹۸ ق م) کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ حقیقت میں میگس تھنیز بنیادی طور پر سیاح نہیں تھا وہ ایک یونانی فرمانروا سلیوکس کے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ ہندوستان کی تہذیب میں کسی یورپی سیاح کی یہ پہلی مداخلت تھی جو سامنے آتی ہے۔ مذکورہ سیاح نے اپنے سفر کے واقعات کو نہ صرف سفارت کے پیشِ نظر قلم بند کیا بلکہ وہ ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے بھی متاثر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا سفرنامہ ''انڈیکا'' گوکہ فی زمانہ میسر نہیں ہے لیکن اس کی افادیت، اہمیت اور اوّلیت اپنی جگہ مستند ہے۔ سفرنامہ نگار کے مجموعی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ: ''اس نے ہندوستان کے سیاسی، معاشی، تہذیبی، تمدنی، جغرافیائی واقعات کو نہایت چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ قدیم سفرناموں میں میگس تھنیز کے سفرنامے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔'' (۱۲۱)

سفرنامہ کی تاریخ نگاری کی روایت کے بارے میں دیکھا جائے تو چین کے ایک راہب فاہیان کے ہندوستان میں سفر کا ذکر ملتا ہے۔ فاہیان اُس وقت ہندوستان آیا جب بدھ مت ہندوستان سے افغانستان تک پھیلا ہوا تھا۔ فاہیان کا یہاں آنے کا مقصد مذہبی مقامات کی بازیافت تھا۔ دراصل ہندوستان کے وہ مذہبی مقامات جو کسی وقت بدھ مت کا مرکز رہے، زمانے کی شکست و ریخت کے ساتھ پانچویں صدی عیسوی تک دنیا سے اُن کے نشانات مٹ چکے تھے۔ جن مقامات کی تلاش میں فاہیان آیا تھا۔ ان میں متھرا کا مقام جس میں وہ مذہبی بنیادوں کی تلاش میں آیا: ''اوائل پانچویں عیسوی (راجہ بکر ماجیت کے عہدِ حکومت) میں کا ایک سیاح فاہیان، بدھ رہبانیت کی نشانیوں کو محفوظ کرنے کی خاطر ہندوستان آیا اور اپنی یاداشتیں یادگار چھوڑیں۔'' (۱۲۲)

سفرنامے کی راویت میں ظہورِ اسلام کے بعد سفر پر بھیجے جانے والے مسلمان تاجروں اور سفارت کاروں کے سفر بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ مبلغین کی طرف بھی مذہبی مقاصد کے تحت سفر اختیار کیے تھے، ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان تاجروں کے قافلے شام، یمن چین کی طرف روانہ ہوئے جن میں اسلام کے فروغ اور حصولِ علم کے لیے جانے والے لوگ شامل تھے۔ اسی قسم کے مسلمان تاجروں کے قافلے ہندوستان اور اس سے آگے کے ممالک کے لیے روانہ ہوئے۔ چوں کی تاجروں کے ان قافلوں کی آمد و رفت ہندوستان کے ساحلوں سے ہوتی تھی اس لیے انھوں نے ہندوستان میں تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کو اسلامی تعلیمات اور تجارت کے فروغ کی صدیاں قرار دی جاتی ہیں۔ ان صدیوں میں مجموعی طور پر اسلام کو فروغ ملا اور مسلمان دنیا کے کونے کونے میں پہنچے۔ مذکورہ دور میں ابوفرج محمد بن اسحاق الندیم نے ہندوستان کے سفر کے متعلق جو کتاب مرتب کی اس کا نام: ''کتاب الفہرست'' ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے متعلق مفید معلومات لکھی ہوئی ہیں۔ مذکورہ سفر کا جواز کیا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر

نور سدید لکھتے ہیں۔ان معلومات کی اساس پر الکندی نے تاریخی کتب مرتب کیں۔'' (۱۲۳)

متذکرہ دور میں جن مسلمان سیاحوں نے سفر کیے اُن میں احمد بن فضلان کا سفر روس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے اپنے سفرنامے میں روس کی سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی کے بارے میں بڑی خوبصورتی سے معلومات پیش کیں۔ابوعبداللہ مقدسی کا سفر ''مراکش سے تاشقند تک'' بیس سال کے عرصے پر محیط تھا۔ان کے سفرناموں میں عوامی زندگی کے متعلق معلومات ہیں۔ابوالقاسم محمد ابن جوقل بغدادی نے مختلف اسلامی ممالک کا سفر تجارتی مقاصد کے لیے اختیار کیا۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ مصر کے بادشاہ کا جاسوس ہے۔کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابولقاسم نے خاص طور پر تجارتی مقاصد کے سفر کیا تھا۔تاہم انھوں نے اپنا سفرنامہ ''المسالک والممالک'' کے نام سے ترتیب دیا۔اسی طرح حکیم ناصر خسرو بلخی نے بھی مختلف ممالک کا سفر کیا جو آٹھ نو ہزار میل پر مشتمل ہے۔ان کا سفرنامہ ''زادِالمسافرین'' کتابی صورت میں موجود ہے۔جس میں حج کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور جغرافیائی صورتِ حال کے بارے میں بھی معلومات موجود ہیں۔مسلمان سیاحوں نے اپنے سفروں کے دوران نہ صرف مختلف ممالک کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں بلکہ وہاں کے علوم وفنون سے بھی استفادہ کیا۔ان مسلمان سیاحوں کے سفرنامے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے تہذیب وتمدن کو اجاگر کرتے ہیں۔متذکرہ بالا سفرناموں میں مؤخرالذکر سفرنامہ اہمیت کا حامل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ: ''مسلمان سیاح حکیم ناصر خسرو بلخی کا نام سیاحت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ناصر خسرو نے سیاحت کی غرض سے آٹھ نو ہزار میل کی طویل مسافت اس دور میں طے کی جب سفر کرنا آسان نہ تھا۔'' (۱۲۴)

البیرونی کا سفرنامہ روایت کے لحاظ سے دوسرے سفرناموں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ابوریحان البیرونی نے بھی حکیم ناصر خسرو کی طرح سلطان محمود غزنوی کے دور میں سرکاری نوعیت کا سفر اختیار کیا۔چوں کہ سلطان محمود غزنوی کے لشکر میں شامل تمام مکتبہ فکر کے لوگ تھے۔یہاں کی طرزِ معاشرت کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں، بلکہ علوم وفنون بھی حاصل کرنے میں اپنی کاوشیں صرف کیں۔سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ کرتا، کامیابی حاصل کرنے کے بعد واپس چلا جاتا، پھر حملہ کرتا اور سابقہ روایت کی طرح واپس چلا جاتا یہی وجہ ہے کہ البرونی مسلسل سفر میں رہتا تھا۔ان مسلسل حملوں کے باعث البیرونی آزادی کے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔جس کی وجہ سے اسے بہت سے معلومات کی باہمی ترسیل کے لیے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔تاہم اس حوالے سے البیرونی نے جتنی کوششیں کیں وہ قابل تعریف ہیں: ''ابوریحان البیرونی نے محمود غزنوی (۱۰۳۰ء۔۹۹۸ء) کے عہد میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور ایک گراں قدر علمی صحیفہ ''کتاب الہند'' کے نام سے مرتب کیا۔البرونی کا شمار اُن علماء اور فضلاء میں ہوتا ہے جو وسط ایشیا کی سرزمین سے آفتاب و ماہتاب بن کر اُبھرے تھے۔'' (۱۲۵)

محمد بن جبیر اندلسی کا نام سفرنامہ کی روایت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جیسا کہ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ جبیر کا اصل وطن اندلس تھا۔ محمد بن جبیرندلسی نے اپنے سفر کا آغاز بیت کا حج ادا کرنے کے سلسلے میں کیا تھا لیکن حج کے فرایض ادا کرنے کے بعد وہ مقدس مقامات کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ مقدس مقامات کی زیارت کے لیے وہ ۵۸۱ھ میں دمشق، شام اور عراق وغیرہ ممالک میں گئے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک سفر مصر کا بھی ہے جو انھوں نے ۵۸۵ھ میں کیا تھا، یہ:

''مسلمان سیاحوں میں غرناطہ کے ابن جبیر اندلسی کا سفرنامہ ہے''رحلۃ ابن جبیر'' بھی لازوال سفرنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ابن جبیر ایک بلند پایہ ادیب تھا اس کا سفرنامہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے عربی کے شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے۔''(۱۲۶)

مسلمان سیاحوں کے سفرنامہ کی روایت میں ایک اور اہم نام محمد عبداللہ ابن البطوطہ کا ہے۔ اس کا آبائی وطن مصر تھا لیکن مراکش میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ وہ مصر کے بربری قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ابن بطوطہ نے کوئی ۲۲ سال کی عمر میں سفر کا آغاز کیا تھا اور جب وطن واپس پہنچا تو عمر کے آخری ایام بسر کر رہا تھا۔ ابن بطوطہ حج بیت اللہ کرنے کے بعد دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ شام، ایران ماوراالنہر اور افغانستان سے ہوتا ہوا وہ ہندوستان میں پہنچا، ہندوستان سے ابنِ بطوطہ چین روانہ ہوا اور چین سے واپسی پر ہندوستان کے سمندری ساحل کے ساتھ ساتھ مدراس، کالی کٹ کرناٹک، کھنائیت اور پھر یہاں سے سری لنکا جا نکلا۔ مرزا حامد بیگ ابنِ بطوطہ کے سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''مسلمان سیاح طنجہ مراکش کا باشندہ شیخ ابوعبداللہ المعروف ابنِ عبداللہ ہے اس نے ۱۳۲۵ء میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور حجاز، مصر شام، عراق، ترکی، ایران، بخارا، بدخشاں، افغانستان اور ہندوستان کے سفری تجربات و مشاہدات کو ''عجائب الاسفار'' کے نام سے قلم بند کیا۔''(۱۲۷)

تاہم ابن بطوطہ کا یہ سرسری تعارف ہے، اس کے اسفار کی داستان بڑی طویل ہے۔ ابن البطوطہ نے دورانِ سفر بے شمار تجربات حاصل کیے، یہ تجربات اس نے مراکش واپس پہنچ کر وہاں کے فرمانروا کو سنائے۔ اس طرح ابن بطوطہ کا سفرنامہ، سفر کی ایسی روداد ہے جو سفر کرنے والے کی زبانی بیان کی گئی ہے اور بعد میں قلم بند کی گئی ہے۔ ابنِ بطوطہ کا سفرنامہ ''عجائب الاسفار'' ایک غیر مسلم ڈاکٹر سموئیل نے دریافت کر کے ۱۸۲۹ء میں اس کی تلخیص شائع کرائی۔ اس تلخیصی سفرنامے کا مسودہ الجزائر سے بسیار تلاشی کے بعد ملا تھا۔ مذکورہ سفرنامے کے کئی ایک دوسری زبانوں میں تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو زبان میں سب سے پہلا ترجمہ پیرزادہ محمد حسین ایم اے نے کیا۔ موصوف کا ترجمہ شدہ سفرنامہ موجودہ دور میں کم یاب ہو چکا ہے۔ اس وقت جو مذکورہ سفرنامے کا ترجمہ رائج ہے، وہ رئیس احمد جعفری نے ۱۹۶۱ء میں کیا تھا۔ اس سفرنامے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں برِصغیر کے خطے کے حوالے سے بڑی اہم معلومات موجود ہیں: ''ابن بطوطہ کا سفرنامہ ''عجائب الاسفار'' تاریخ انسانی کے ان گم شدہ اوراق کی نشاندہی کرتا ہے جو عرصہ دراز تک نگاہوں سے اوجھل رہے۔ برِصغیر

خصوصاً ہندوستان کے عہد محمد تغلق کی بدولت سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی زندگی، پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔" (۱۲۸)

سفر نامہ نگار مارکو پولو کا نام سفر نامہ کی روایت میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔ مارکو پولو تیرہویں صدی صدی عیسوی میں اٹلی کے شہر وینس سے روانہ ہوا اور ہندوستان سے ہوتا ہوا چین جا پہنچا۔ مارکو پولو نے بچپن میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور پورے چالیس سال تک سفر میں سرگرداں رہا۔ اس سیاح کی ہندستان آمد سلطان غیاث الدین بلبن کے دور میں ہوئی اور وہ تقریباً دو سال تک اس خطے میں قیام پذیر رہا۔ اس زمانے میں چین میں قبلا خان کی حکومت تھی۔ مارکو پولو چین پہنچ کر قبلا خاں کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ ابن بطوطہ کے سفر نامے کی طرح مارکو پور کے سفر نامے کا مدار بھی بڑا وسیع ہے: "ہندوستان سے متعلق یورپی سیاحوں کے قدیم سفر ناموں میں مارکو پولو کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ لگ بھگ چالیس برس تک براعظم کی سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔ وہ غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت (۱۲۶۵ء۔ ۱۲۸۷ء) میں چین سے مالا بار تک آیا کئی سال تک یہاں مقیم رہا۔" (۱۲۹)

جہاں تک ایشیائی اردو سفر نامے میں روایت اور مختلف قوموں کے تاریخی شعور کے مطالعہ کا تعلق ہے تو اس روایت کے حوالے سے ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کا اردو کا پہلا معیاری سفر نامہ "تاریخِ یوسفی عجائباتِ فرنگ" ہے۔ سفر نامہ سفر دار المصطفیٰ کپتان رچرڈ فریدرک برٹن کا سفر نامہ پلگری میج ٹو المدینہ اینڈ مکہ" Pilgrimage to Al Madina and Massa کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ محمد انشاء اللہ نے کیا تھا۔ کپتان رچرڈ فریڈرک برطانیا کا ایک جاسوس تھا جو عربیوں کا بھیس بنا کر آیا تھا۔ کپتان موصوف نے انگریزی کے علاوہ دنیا کی کئی زبانیں سیکھی ہوئی تھیں۔ اس بنا پر اُسے برطانیا کے لیے جاسوسی کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ برطانیا کے لیے ملک عرب کی جاسوسی کرنے پر برطانوی حکومت نے اُسے لارڈ آف عربیہ کا خطاب دیا تھا۔ نادر کا سفر نامہ "مثنوی نادر" شاعرانہ انداز میں مثنوی کی صنف میں لکھا گیا تھا۔ مذکورہ سفر نامہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ سفر نامہ نگار نے سفر نامے میں اعظم جاہ والئی ارکاٹ کے حالات سفر کو مثنوی میں پیش کیا ہے۔ ونٹریم صاحب انگلستان سے کشمیر کے علاقے کی سیر کے لیے آئے تھے اور سیر کرانے کی ذمہ داری پنڈت کنھیالال کی تھی۔ سفر نامہ "سیرِ کشمیر" کنھیالال کا ہے۔ منشی امید سنگھ کا سفر نامہ "باغ نو بہار" مرتبہ صورت میں ہے۔ یہ سفر نامہ اندور کے راجا تکوجی راؤ کا سفر نامہ ہے جو منشی صاحب نے اس طرح لکھا کہ جیسے راجا صاحب خود سفر کے حالات بیان کر رہے ہوں۔ نواب غوث محمد خان کا سفر "سیر المحتشم" ہے مذکور سفر نامے میں درجن بھر مقامی شہروں کے سفر کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ نواب بیگم کا سفر نامہ "تاریخ وقائع حج" اس سفر نامے میں انھوں نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے بھوپال سے سفر کیا تھا جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے وہ بھوپال کی نواب بیگم تھیں۔ سفر نامہ میں حج کے مناظر کے علاوہ عربی تہذیب کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ منشی امین چند کا سفر نامہ "سفر نامہ امین چند" ہے مذکورہ

سفر نامے میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کا ذکر ہے۔اس سفر نامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں پنجاب، کشمیر وغیرہ اور دوسرے حصے میں بنگال اور کلکتہ کے سفر کے حالات کا ذکر ہے۔شیخ محمد ریاض الدین کا سفر نامہ ''سرور ریاض'' ہے۔انھوں نے شاہ جہاں پور سے دلی کے سفر کے حالات و واقعات کو سفر نامے میں قلم بند کیا۔ پروفیسر دیمبری کا سفر نامہ ''سفر نامہ پروفیسر دیمبری'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اردو سفر نامے میں وسط ایشیا کے ملکوں کے شہروں سمرقند، بخارا، ہرات، طہران، قسطنطنیہ وغیرہ کے اسفار کے تفصیلی حالات لکھے گئے ہیں۔ منشی برج بھوگن لال نے کیپ چارلس والٹر کنگلاک کے سفر نامے کا اردو ترجمہ ''وقائع کیپ'' کے نام سے کیا ہے۔اس سفر نامے میں مختلف ملکوں کے حالات کے ساتھ ساتھ سیر اور شکار کے حالات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔مرزا عویض کا سفر نامہ ''آئینہ حیرت'' ہے جسے طالب حسین نے مرتب کیا تھا۔اس سفر نامے میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے سفر کے حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کاظم برلاس مرزا کا سفر نامہ ''سیر دریا'' ہے۔ یہ سفر نامہ جزیرہ نما ملک سری لنکا کے سفر کے حالات و کیفیات پر مشتمل ہے۔سفر نامہ میں سفر نامہ نگار نے تاریخ نگاری کے اسلوب کو برتتے ہوئے سری لنکا کی تاریخ بھی رقم کی ہے۔نواب کلب علی خاں کا سفر نامہ ''ضمیمہ اودھ اخبار'' میں چھپا تھا اور بعد میں اودھ اخبار والوں نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔اس سفر نامے میں برطانوی دور کے شہر دلی کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔اس میں سفر کا مقصد نواب صاحب کی ڈیوک آف ڈان برا بہادر سے ملاقات تھی۔ جو آگرہ میں موجود تھے۔حکیم فرید الدین کا سفر نامہ ''سعادت دارین'' ہے۔سفر نامے کا زیادہ حصہ طب کے موضوع پر مشتمل ہے۔سفر نامے میں حج کے حالات کے درمیان میں کہیں کہیں ملتے ہیں۔ یہ ایک ضخیم سفر نامہ ہے۔ٹی۔ڈی فورسایتھ کا سفر نامہ ''سفر یارقند'' ترکستان کا سفر نامہ ہے۔سفر نامہ نگار سابق کمشنر جالندھر تھے انھوں نے ترکستان کے سفر کی رپورٹ کو سفر کے عنوان سے مرتب کیا۔محمد زرداد خان حاجی کا سفر نامہ ''سفر حرمین'' ہے۔سفر نامے میں روایت کے حوالے سے یہ سفر نامہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے سفرِ حج کے حالات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔مولوی محمد ایزاد بخش قادری کا سفر نامہ ''منبع الحرمین'' ہے۔مذکورہ سفر نامہ حج کا ہے حج کے سفر نامے کی روایت کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔سفر نامہ نگار نے سفر کے حالات کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔محمد ایزد بخش قادری کا سفر نامہ ''مفید الدارین'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفر نامہ بھی زیارتِ مقامات، مقدسہ بغداد شریف اور کربلا معلیٰ کے سفر کی تفصیلات کیفیات بیان ہوئی ہیں۔سید محمد علی جونپوری نے سفر نامہ ''تبصرۃ المومنین بلفظ رفیق الزائرین'' کے نام سے قلم بند کیا ہے۔سفر نامے کا طریقہ تحریر شماریاتی اسلوب بیان رکھتا ہے جس میں سفر کے واقعات کی خاص طور پر تاریخیں درج ہیں۔پنڈت کنھیا لال کا سفر نامہ ''سفر نامہ کشمیر'' ہے۔کشمیر کے سفر پر ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔اس سفر میں انھوں نے کشمیر میں موجود ہندوؤں کی زیارتوں کے حالات کو تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔مرزا رائیس بخت کا سفر نامہ ''موج سلطانی'' ہے۔

سفرنامہ نگار بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے احوال کو اپنے سفرنامے ''موج سلطانی'' کی صورت میں قلم بند کیا ہے۔ حاجی سید وزیر حسین کا سفرنامہ ''وکیل الغربا'' اپنے اندر حج کے سفر کے واقعات کو سموئے ہوئے ہے۔ مذکورہ سفرنامے کو مرتب کرنے کا مقصد نئے حاجیوں کے لیے رہنمائے سفر کے اصول وضع کرنا تھا۔ سید برکت علی صاحب کا سفرنامہ ''رہنمائے حجاج'' بھی سفرِ حج پر جانے والے نئے حاجیوں کے لیے اہم ہے۔ نیز سفر کے دوران پیش آنے والے عجیب وغریب واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ''سیر ایران'' کے نام سے لکھا۔ سفرنامے کی روایت کے لحاظ سے اس کا بڑا اہم مقام ہے۔ نواب عمر علی خاں کا سفرنامہ ''سفرنامہ رائیس'' ہے۔ یہ سفرنامہ سری لنکا کے حالات و واقعات پر لکھا ہوا ہے اور سفرنامہ کی روایت کے حوالے سے بڑا اہم ہے۔ نواب عمر علی کا ایک اور سفرنامہ ''زادِ غریب'' کے نام سے لکھا۔ اس سفرنامے کے واقعات حج کے لوازمات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ مولانا محمد حفیظ کا سفرنامہ ''سفرنامہ عرب'' کے نام سے لکھا گیا۔ اس سفرنامے میں حج بیت اللہ کے ساتھ ساتھ عرب کی تہذیب وتمدنی زندگی کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے نواب محمد عمر کا ایک اور سفرنامہ ''حضور عالی'' ہندوستان کے مختلف شہروں کے حالات پر مبنی ہے۔ سفرنامے میں دلی، لاہور، پشاور، راول پنڈی اور لکھنؤ وغیرہ کے شہروں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ نواب عمر علی کا ہی ایک اور سفرنامہ ''فرنگ فرنگ'' ہے۔ مذکورہ سفرنامہ یورپ کے ممالک روم، اٹلی برنڈ یری اور جرمنی وغیرہ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ نواب محمد عمر علی نے سفرنامہ لکھنے کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے چین کے سفر پر مبنی سفرنامہ ''ارژنگ چین'' کے عنوان سے سفرنامہ مرتب کیا۔ مذکورہ سفرنامے میں مختصر طور پر چین کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ شبلی نعمانی کا سفرنامہ ''سفرنامہ روم و مصر وشام'' ہے۔ اس سفرنامے میں سفر کے حالات واقعات کے علاوہ تعلیمی معاملات اور تاریخی واقعات کے اعداد شمار بھی درج کیے گئے ہیں۔ حاجی حلیم الدین کا سفرنامہ ''رسالہ حج'' میں حالات مفصل بیان کیے گیے ہیں۔ اس سفرنامے کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مناسک حج، دوسرے حصے میں دعائیں اور تیسرے حصے میں خبروں اور نقشوں کی تفصیل شامل ہے۔ حاجی محمد شاہ اکبر کا سفرنامہ ''سیر دہلی'' ہے۔ یہ سفر انھوں نے اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے تھا۔ تاہم دوران سفر کے حالات و واقعات کو انھوں نے سفرنامے کی صورت میں قلم بند کیا تھا۔ عبدالخالق کا سفرنامہ ''سیر برہما'' کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ نام سے ہر ظاہر ہے کہ یہ سفرنامہ ملک برہما کی سیاحت کے حوالے سے ہے۔ سفرنامے میں علاقے کی تہذیب و معاشرت کو حصہ بنایا گیا ہے۔ مولوی عبید الحیٰ کا سفرنامہ ''دہلی اور اس کے اطراف'' اس سفر کے دوران انھوں نے دہلی کے اطراف و جوانب کی سیر و سیاحت کی کیفیات درج کیں۔ جنرل ٹامس ایڈورڈ گارڈن کا سفرنامہ ''سفرنامہ ایران'' ہے اس سفرنامے میں سفرنامہ نگار نے ایران کے قاچار خاندان کے بادشاہ مظفر کے حالات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ سفرنامے کا انگریزی سے اردو ترجمہ کسی پریس کمپنی نے کرا کے شائع کروایا تھا۔ احمد علی خان شوق حاجی کا سفرنامہ''

شہنشاہ جرمنی کا سفر قسطنطینہ'' ہے۔ یہ سفر نامہ جرمنی اور ترکی کے حالات کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ محمود علی خان نواب (خیاباں) کا سفر نامہ ''موجودہ حالات مصر'' تعلیمی مقاصد کے نکتہ نظر سے تحریر کیا گیا تھا لیکن سفر نامہ نگار نے مصر اور یورپ کی سیاحت بھی کی تھی جس کے واقعات کو سفر نامے میں شامل کیا گیا تھا۔ قاسم علی مرزا کا سفر نامہ زاد الزائرین المعروف بہ معین الزائرین'' بھی حج کا سفر نامہ ہے۔ سفر نامہ نگار مذکورہ سفر نامے میں زیارت مقاماتِ مقدسہ کے حالات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

برِ صغیر کے رہنے والے لوگوں نے جہاں یورپ، افریقہ اور مغربی ممالک کی سیاحت کی غرض سے سفر کیے وہاں پر برِ صغیر کے لوگوں نے ایشیائی ممالک کے اسفار بھی کیے ہیں۔ برصغیر سے دوسرے ممالک کی سیر و سیاحت کا سلسلہ اٹھارویں صدی سے شروع ہوا تھا۔ اہم بات یہ نہیں کہ اہل برِ صغیر نے بیرون ممالک کے اسفار کیے۔ اصل میں اہم واقعہ یہ ہے کہ اہل برّصغیر نے اپنے سفر کے معاملات کو احاطۂ تحریر میں لایا ہے۔ ابتداء میں مسلمانوں نے حصولِ علم کی خاطر سفر کیے یا پھر خالصتاً سیاحت کی نیت سے بھی سفر کیے۔ جس میں عبداللہ ابن بطوطہ کا سفر نامہ شہرت کا حامل ہے۔ یوں سفر نامہ لکھنے یا بیان کرنے کی روایت بڑی پرانی ہے۔ سترویں صدی میں صاحبِ اسفار نے اپنے سفر نامہ فارسی میں تحریر کیے۔ ایشیائی اردو میں سفر نامہ لکھنے کی روایت کا آغاز یوسف کمبل پوش کی وفات (۱۰/اگست ۱۸۶۱ء) کے بعد تاریخِ یوسفی عجائبات فرنگ'' (طباعت ۱۸۴۷ء) اور سیر و سفر ''سفر اودھ'' کے نام سے شائع ہوا۔

ابن خلدون ایک ایسے مورخ گزرے ہیں جنھوں نے تاریخ کے واقعات کو سمجھنے کے لیے کچھ اصول بنائے تھے ان اصولوں کے مطابق تاریخی واقعات میں ردوبدل کا امکان پیدا ہوا۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابن خلدون وہ پہلے تاریخ دان ہیں جنھوں نے تاریخ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھا تھا لیکن ان پہلوؤں پر غور کرنا بھی ضروری تھا کہ معاشروں کے تہذیب وتمدن کے عروج و زوال یا تبدیلیوں کے پیچھے کون کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اس لحاظ سے ابن خلدون جدید مشرقی اور مغربی فلسفیوں اور مورخین سے بدرجہا بہتر ہیں کیوں کہ انھوں نے قوموں اور معاشروں کی زندگیوں میں رونما ہونے والے ان حادثات اور تبدیلیوں کے قوانین دریافت کیے ہیں۔ اس حوالے محمد حنیف لکھتے ہیں کہ:

> ایک مورخ کے لیے اس حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے کہ تاریخ میں اگرچہ اس زمانے کے مخصوص لوگوں کا ذکر ہوتا ہے، متعین واقعات اور بڑے بڑے حوادث کی تفصیلات ہی بیان کی جاتی ہیں، تاہم اس عصر کے تمام حالات، جغرافیہ اور جزئیات اس نوع کی ہوسکتی ہیں جن سے ان کی توضیح ہوسکے، اس لیے ایک محقق کو ان حالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور قدم انھی کی روشنی میں بڑھانا چاہیے، ورنہ لغزش کا سخت امکان ہے۔ (۱۳۰)

وقت کے لحاظ سے قوموں اور معاشرے میں جو تبدیلی کا رجحان رونما ہوتا ہے وہ ایک تسلسل کی صورت اختیار کر لیتا

ہے لیکن وقت کے تقاضے کے مطابق ان واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے جڑی رہتی ہیں۔ اس صورت حال کو ابنِ خلدون تاریخ کو ایک مسلسل عمل قرار دیتا ہے:

> تاریخ ایک ایسا فن ہے جسے اقوام و امم ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں جس لیے حاصل کرنے کے لیے سواریاں اور کجاوے کسے جاتے ہیں۔ اس میں معلومات پیدا کرنے کے لیے عوام و جہلا تک بھی پیش قدمی کرتے ہیں۔ اس کے لیے سلاطین و نواب بھی اپنے پورے پورے شوق کا اظہار کرتے ہیں اور اسے سمجھنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے میں علماء اور جہلا برابر ہیں کیوں کہ تاریخ بظاہر لڑائیوں اور حکومت کی خبروں سے اور سابق صدیوں کے بیتے ہوئے واقعات سے آگے نہیں بڑھتی اور اس میں اقوال کی کثرت اور مثالوں کی فراوانی ہے۔ جب عظیم اجتماع ہوتا ہے تو مجالس اجتماع تاریخ ہی سے آراستہ و پیراستہ کی جاتی ہیں۔ اور تاریخ ہی ہمارے سامنے دنیا کا حال رکھتی ہے کہ کس کس طرح لوگوں کو نازک ادوار سے گزرنا پڑا۔(۱۳۱)

تاریخ دان مختلف جگہوں سے اپنی معلومات حاصل کرتے ہیں جن میں قدیم نسخوں، شہادتوں اور پرانی چیزوں کی تحقیق شامل ہوتی ہے۔ البتہ مختلف ادوار میں مختلف ذرائع معلومات کو اہمیت دی گئی۔ تاریخ کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے اور اس کا مادہ عربی زبان کے لفظ اَرَخ سے ماخذ ہے جس کے معنی دن (عرصہ/ وقت وغیرہ) لکھنے کے ہوتے ہیں۔ مقدمہ تاریخ شاہی میں لکھا ہے کہ:

> تاریخ جامع انسان کے انفرادی و اجتماعی عمال و افعال اور کردار کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں گزشتہ نسلوں کے بیش بہا تجربات آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے، تاکہ تمدن انسانی کا کارواں، رواں دواں رہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس کے توسط سے افراد و قوم ماضی کے دریچے سے اپنے کردہ اور نا کردہ اعمال و افعال پر تنقیدی نظر ڈال کر اپنے حال و استقبال کو اپنے منشاو مرضی کے مطابق ڈھال سکے۔(۱۳۲)

تاریخ کا تصور اتنا ہی قدیم ہے کہ جتنا تصور زماں و مکاں۔ تمدن کے آغاز سے اب تک تاریخ نے کئی روپ دھارے ہیں۔ قصے کہانیوں سے شروع ہو کر آج تاریخ اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اسے تمام علوم انسانی کی رواں دواں تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ: ''اجتماع انسانی کے شعبے میں کوئی واقعہ پیش آتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح کل یا تاریخ گزشتہ سے مربوط ہوتا ہے، اس لیے یہ کہا جائے کہ تاریخ سب کچھ ہے اور سب کچھ تاریخ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔''(۱۳۳)

ملکوں اور قوموں میں مختلف سیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک حالت ہی پر قائم نہیں رہتی ہیں، ان کے مزاج اور رسوم میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی تحریکی تبدیلیوں سے کسی قوم میں نیا تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ایک مورخ کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ کسی خاص حکومت کے آنے سے قوم میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوتی

ہیں۔اس صورت حال کے پیش نظر تاریخی واقعات کو تحقیق کے ساتھ پیش کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔اس طرح تاریخی واقعات کو مرتب کرنے میں غلطیوں کا امکان کم ہوتا ہے۔کیوں کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ حقیقت سے بالاتر باتوں کو ماننے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔بہر کیف اس طرح:''جھوٹے قصے اور عجیب مضحک داستانیں اس وقت تاریخ کے اوراق کی زینت بنتی ہیں کہ مورخ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتا ہے اور وہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتا ہے کہ جو بات بیان کی گئی ہے اس کے تقاضے بھی ہیں یا نہیں اور وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں یا تصدیق۔''(۱۳۴)

منتخب ایشیائی اردو سفرنامے کی روایت تحریر کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ایشیائی سفرنامے کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔گذشتہ سطور میں ایشیائی اردو سفرنامے کی عمومی روایت درج کی گئی ہے۔مقالہ ہذا کی تحدید کے حوالے سے ضروری ہے کہ منتخب ایشیائی اردو سفرنامے کا، جس میں تاریخ عناصر مطلوبہ نکتہ نظر کے مطابق موجود ہوں۔تفصیلی تعارف پیش کیا جائے۔

تاریخ یوسفی، عجائبات فرنگ، یوسف خان کمبل پوش:

تاریخ یوسفی، عجائباتِ فرنگ، یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ ہے۔یوں تو ایک سے زیادہ لوگوں نے سفرنامہ عجائباتِ فرنگ مرتب کیا ہے۔یہاں اُس نسخے پر بات کرنا مقصد ہے جسے محمد اکرام چغتائی نے مرتب کیا ہے۔یوسف خان کمبل پوش نے ۱۸۳۶ میں سفر کا ارادہ کیا تھا۔چھ ماہ کے عرصے تک سفر کی تیاریوں میں مصروف رہے۔۲۰/مارچ ۱۸۳۷ء کو لندن کے لیے روانہ ہوا۔لندن روانہ ہونے سے پہلے وہ ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکھپور، نیپال، اکبرآباد، شاہجہان شہروں کی سیاحت کر چکا تھا۔لندن کے سفر سے واپسی کے بعد سفرنامے کی ترتیب و تنظیم میں بھی کچھ وقت یقیناً صرف ہوا ہو گا۔اس لیے سفرنامہ مطبوعہ صورت میں پہلی بار ۱۸۴۶ء کے آواخر میں مرتب ہوکر منظر عام پر آیا۔تاریخ یوسفی، عجائبات فرنگ ایشیائی سفرنامہ میں تحقیق کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سفرنامے میں جنوبی ہندوستان کے علاقے کی سیر و سیاحت کی بھی تفصیل سیاسی اور تاریخی عناصر کی حامل ہے۔

جس دور میں سفرنامہ تاریخِ یوسفی، عجائبات فرنگ، لکھا گیا اس دور میں سفرنامہ کو وہ عروج حاصل نہیں ہوا تھا۔موجود دور میں اسے نہ صرف اردو کا اوّلین سفرنامہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے بلکہ اس پر بہت سارا تحقیق اور تنقیدی کام بھی ہو چکا ہے۔جہاں تک اردو کے باقاعدہ پہلا سفرنامہ ہونے کا تعلق ہے، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے عجائبات فرنگ کے بارے میں کہتے ہیں کہ:''اردو میں سیاحت نگاری کی تاریخ ڈیڑھ سو سال سے کسی صورت زیادہ نہیں بنتی۔کمبل پوش کی''تاریخِ یوسفی'' یا''عجائباتِ فرنگ'' اردو کا پہلا سفرنامہ ہی نہیں سفرنامے کا اہم ترین سنگ میل بھی ہے۔''(۱۳۵)اردو زبان کا پہلا سفرنامہ ہونے کی بات کو مزید آگے بڑھایا جائے تو تحقیق میں سید فدا حسین عرف نبی بخش کا

نام سامنے آتا ہے۔سید فدا حسین عرف نبی بخش کا سفر نامہ تاریخ افغانستان کو محققین نے اردو کا پہلا سفر نامہ قرار دے چکے ہیں۔اسے پہلا سفر نامہ ہونے کے حوالے سے دیکھا جائے تو سید فدا حسین نے افغانستان کا سفر یوسف خان کمبل پوش سے پہلے ۱۸۳۷ء، ۱۸۳۸ء میں کیا تھا۔ان کا سفر نامہ کے بارے میں اشاعت کے لحاظ سے ایک رائے یہ ہے کہ:''یوسف کمبل پوش نے ۱۸۳۸ء سفر کا آغاز بلا شبہ پہلے کیا لیکن'' تاریخِ افغانستان از سید فدا حسین کا زمانہ تصنیف و طباعت ۱۸۳۹ء ہے۔''(۱۳۶) سید فدا حسین عرف نبی بخش کے سفر نامے کی اشاعت کے متعلق انور سدید کی رائے ہے کہ:''سفر نامہ'' تاریخِ افغانستان'' کے نام ۱۸۵۲ میں لکھا گیا تھا۔لیکن یوسف کمبل پوش کے آراستہ سفر نامے کے مقابلے میں'' تاریخِ افغانستان'' کا چراغ نہ جل سکا۔''(۱۳۷) یوسف خان کمبل پوش کے سفر اور سفر نامے کی اشاعت کے بارے میں اہل نقد کا ادراک بہت حد تک درست ہے۔تاریخِ یوسفی، عجائبات فرنگ کی اشاعت کے متعلق مرزا حامد بیگ کی رائے ہے کہ:''اور تاریخ یوسفی از'' یوسف خاں کمبل پوش'' کا زمانہ تصنیف لگ بھگ ۱۸۴۶ء اور سنِ اشاعت ۱۸۴۷ء۔''(۱۳۸)

اردو کے پہلے سفر نامے کے تعین کے سلسلے میں محققین کی رائے یہ ہے کہ یوسف خاں کمبل کے سفر نامے کو اوّلیت حاصل ہے۔ان کا سفر نامہ اس لیے پہلے آتا ہے کہ یوسف خاں کمبل پوش نے سفر کا آغاز سید فدا حسین سے کوئی سال بھر پہلے ۱۸۳۸ء میں کیا تھا۔سفر نامے کی اشاعت ۱۸۴۷ء میں جا کر مکمل ہوئی۔جہاں تک سید فدا حسین کے سفر کرنے اور سفر نامہ لکھ کر شائع کرانے کا تعلق ہے سید فدا حسین نے سفر ۳۷۔۱۸۳۸ء میں افغانستان کا سفر کیا اور سفر نامہ کی اشاعت بہت دیر بعد یعنی ۱۸۵۲ء میں ہوئی۔اس طرح تاریخِ یوسفی، عجائبات فرنگ ہی اردو کا پہلا سفر نامہ قرار پاتا ہے۔مرزا حامد بیگ کی رائے کو درست تسلیم کرتے ہوئے سید فدا حسین کے سفر نامے کی اشاعت ۱۸۳۹ء درست تسلیم کر لی جائے تو پھر بھی'' تاریخِ افغانستان'' کو اردو کا پہلا سفر نامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سید فدا حسین عرف نبی بخش کے سفر نامے میں سفر نامہ تحریر کرنے کے لوازمات ہی پورے نہیں کرتا ہے۔تاریخی واقعات کی تحریر کی ترتیب کے لحاظ سے سید فدا حسین کا سفر نامہ پہلا تصور ہوگا۔

سیر ملک اُودھ

سفر نامہ''سیر ملک اودھ'' یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ یوسف خان کمبل پوش نے یہ سفر نامہ، سفر کے دوران ہی تحریر کیا ہے۔اس سفر نامہ کی تدوین پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے کی ہے۔سیر'' ملک اودھ'' تدوین و ترتیب کے بعد رسالہ بنیاد شمارہ ۶، ۲۰۱۵ء میں چھپ چکا ہے۔اس سفر نامے کا تعارف اورئینٹل کالج میگزین، جلد ۸۹، شمارہ نمبر ۳ میں چھپ چکا ہے۔مزید یہ کہ پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی کوشش سے یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ مدون بھی ہو چکا ہے بلکہ ترتیب و تنظیم کے بعد مذکورہ رسالے میں سیر اودھ کے نام سے چھپ بھی چکا ہے۔یوسف

خاں کمبل پوش کے دوسرے سفر نامے کے بارے میں درج ذیل اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

> اس سفر نامے کا قلمی نسخہ، جو دستیاب معلومات کے مطابق وحید نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ بولڈلین لائبریری میں انڈین انسٹی ٹیوٹ، اوکسفور کے ذخیرے میں موجود ہے۔ انڈین نسٹی ٹیوٹ کو یہ مخطوطہ رابرٹ کیتھ پرنگل (۱۸۰۲ء۔۱۸۹۷ء) نے ۷رفروری ۱۸۷۹ء کو پیش کیا تھا۔ پرنگل کمبل پوش کے محسنوں میں سے تھے جن کا ذکر انھوں نے اپنے پہلے سفر نامے میں بار بار کیا ہے۔(۱۳۹)

یوسف خاں کمبل پوش نے اپنے دوسرے سفر نامے سیر ملک اودھ میں اپنے پہلے سفر اور سفر نامے کی وضاحت مزید وسعت کے ساتھ کی ہے۔ انھوں نے جس قدر سیر و سیاحت کی ہے، بقول ان کے سیاحت کے اس دورانیے کو احاطہ تحریر میں لایا جائے تو کتابوں کی کئی جلدیں بنتی ہیں۔ مگر انھوں نے اپنی سیر و سیاحت کا معاملہ محققین کے سپرد کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> عاقلان لوگ خود اپنی خرد اور دانائی سے سمجھیں کہ عاصی کو جا بجا انگریزوں کا یعنی کلکتہ اور ولایت، لندن اور مچھلی بندر، گورکھپور، نیپال، اکبر آباد، جہاں آباد، ڈھاکہ، مندراج، بنارس، شاہجہاں آباد اور ملک پرتگیزان اور ملک ابلان [؟] (یمن کا ایک ساحلی علاقہ ہے) اور ملک فرانسیس اور ملک اسپانیز [سپین] ملک عربوں کا اور کوہ طور، زیارت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ملک دکن اور تمام ملک نظام الملک، اور ملک اورنگ آباد، نج پور، ناگ پور، حیدر آباد اور چند ملک و مکانات اور شہر بشہر پھرتا رہا کہ سیاہی [سیاحی] عالم جہاں تک ممکن تھی، بخوبی سیر تماشا دیکھا اور سیر کرتا ہوا ملک لکھنؤ میں داخل ہوا۔(۱۴۰)

یوسف خان کمبل پوش نے مجموعی طور پر سیاحت کا ذکر کیا ہے جس سے اس پہلو کی وضاحت ہوتی ہے کہ انھوں نے جنوبی ایشیا کے زیادہ تر علاقوں کی وضاحت کی ہے اور کچھ ایسے ممالک بھی ہیں جو ایشیاء میں شامل ہیں جیسے عرب کے کچھ علاقوں کوہ طور (مصر)، المخا، ابلان (یمن) اور مکلا (مسقط) وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ ان کے سفر ناموں میں عرب کے علاقوں کی تاریخ کے لحاظ سے نہیں بلکہ تہذیبی لحاظ سے معلومات زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتی ہے۔ تاہم یوسف خان کمبل پوش نے ڈھاکہ اور نیپال کی سیاحت کا ذکر کیا ہے مگر ان کے سفر ناموں میں ان علاقوں کی سیر و سیاحت کی تفصیل نہیں ملتی۔ انھوں نے دوبارہ لنکا کا سفر بھی کیا تھا ایک بار انگلستان جاتے ہوئے اور دوسری بار فوجی خدمات کی انجام دہی کے لیے کپتان، میگنس کی زیر سرپرستی، مگر مذکورہ بالا اقتباس میں انھوں نے ان مقامات کی سیر کا ذکر نہیں کیا۔ تاریخ یوسفی، عجائبات فرنگ اردو ادب میں دنیا کا پہلا اور سفر نامہ قرار دیا گیا ہے۔ ایشیائی اردو سفر نامے میں سفر نامہ سیر ملک اودھ کو پہلا سفر نامہ ہونے کا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ زمانی ترتیب کے لحاظ سے سیرِ اوّدھ اردو ادب کا دوسرا سفر نامہ بھی ہے۔ جہاں اردو کا دوسرا سفر نامے کا تعین کا تعلق ہے تو سید فدا حسین کا سفر نامہ تاریخ افغانستان اردو کی قدیم رودادِ سفر کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ سید فدا حسین نبی بخش کا اردو اور ایشیا کا تاریخی معلومات کی ترتیب کے حساب سے پہلا سفر نامہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ افغانستان، سید فدا حسین نبی بخش:

سید فدا حسین عرف نبی بخش نے ''تاریخ فغانستان'' اردو کا سفر نامہ تحریر کیا۔ ان کا یہ سفر نامہ جنگی مہم جوئی سے متعلق ہے۔ مرزا حامد بیگ نے مذکورہ سفر نامے کو اردو کا اوّلین سفر نامہ قرار دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جس سفر نامے کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے لیے سفر کا ارادہ سفر نامہ نگار نے ۱۸۲۸ء میں اختیار کیا اور اپنے سفر نامے کی روداد ۱۸۳۹ء میں شائع کراتے ہیں۔ ان کے متعلق مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں کہ: ''یہ قدیم ترین سفر نامہ ایک جنگی مہم سے متعلق ہے، اس سفر نامے میں آغاز ۲۵ شعبان ۱۲۵۵ھ مطابق ۳ نومبر ۱۸۳۹ء کو شاہ جہاں آباد سے کابل کی طرف چڑھائی سے ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ داستانوی انگ لیے ہوئے ہے۔ اور روزنامچے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔'' (۱۴۱) سید فدا حسین عرف نبی بخش کا سفر میرٹھ سے غزنی اور پھر واپس غزنی سے میرٹھ تک کے سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ مذکورہ سفر نامے ''تاریخِ افغانستان'' کے بارے میں مندرجہ بالا میں تفصیل کے ساتھ وضاحت ہو چکی ہے، یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یوسف کمبل پوش کے سفر نامے حقیقت نگاری پر مبنی ہیں۔ اور سید فدا حسین کا سفر نامہ داستانی اسلوب میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے سفر نامہ کا متن کا اسلوب تھوڑا ہو گیا ہے۔ مرزا حامد بیگ تاریخ افغانستان اور فسانۂ عجائب موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''سفر نامہ تاریخِ افغانستان سنہ تصنیف و طباعت ۱۲۵۵ء بمطابق ۱۸۳۹ء کا موازنہ فسانۂ عجائب از رجب علی بیگ سرور لکھنؤ سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ بہ مطابق ۱۸۲۴ء سے کیجئے۔ آپ طرزِ تحریر میں اس حد تک مماثلت پائیں گئے کہ پہچان اور تخصیص مشکل ہو جائے گی۔'' (۱۴۲)

کالا پانی، مولانا جعفر تھانیسری:

مولانا جعفر تھانیسری کا سفر نامہ کالا پانی صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین سے ۱۹۲۳ء اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۱۲ میں شائع ہوا ہے۔ اس سفر نامے کا دورانیہ ۱۸۶۶ء کا ہے، مولانا جعفر تھانیسری نے جزیرہ کالا پانی میں سترہ سال دس ماہ کا عرصہ قید میں گزارا، اس کے بعد ان کی رہائی عمل میں آئی تو وہ ہندوستان واپس آئے۔ سفر نامہ کالا پانی کا شمار ہندوستان کے قدیم اور ابتدائی سفر ناموں میں ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ سفر نامہ باقاعدہ کتابی صورت میں ہے اس لیے محققین نے اسے تحقیقی نکتہ نظر سے خصوصی اہمیت دی ہے۔ جیسا کہ اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ سفر نامہ تاریخ یوسفی عجائباتِ فرنگ کے سفر کا آغاز ۱۸۳۸ء میں عمل میں آیا تاہم یہ یورپ کے علاقے میں انیسوی صدی کے نصف اوّل میں کیا جانے والا سفر تھا۔ اس کے مقابلے میں مولانا جعفر تھانیسری کا سفر نامہ کالا پانی ۱۸۵۷ء کے بعد کا سفر نامہ ہے جب حکومت سے غداری کے سلسلے میں حکومت ہند (برٹش گورنمنٹ) نے گرفتاریاں عمل میں لائیں۔ یہ لازمی بات ہے کہ مذکور دونوں سفر ناموں میں جغرافیائی اور زمانی بُعد ہے۔ مگر دونوں سفر ناموں میں ایک قسم کا تاریخی تسلسل بھی موجود ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری کا سفر

یورپ کے بجائے مشرق بعید کے ایک ایسے دور دراز جزیرے کا ہے جسے انگریزوں نے ایک بہت بڑی جیل قرار دے رکھا تھا۔ دوسری جانب یوسف کمبل پوش کا سفر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے علاقوں سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ سفرناموں کے مابین تاریخ، تہذیبی، ثقافتی، زمانی اور جغرافیائی بُعد پایا جاتا ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری کو کالا پانی میں اس لیے قید کیا گیا تھا کہ ان پر انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کرنے الزام تھا۔ ان دنوں جتنے لوگ ہندوستان سے بغاوت کے سلسلے میں قید کیے گئے انگریزوں نے انھیں کالا پانی کے جزیرے کی قید دی، کالا پانی کی قید نہایت سخت تھی۔ جو کوئی ایک بار کالا پانی جا کر قید ہوتا تھا اُسے دوبارہ رہائی کی امید نہیں ہوتی تھی۔ جب یوسف کمبل پوش نے یورپ کا سفر کیا تو اُس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات کچھ اور تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سے جب مولانا جعفر قید ہو کر کالا پانی پہنچے اُس وقت سیاسی حالات بہت زیادہ مختلف ہو چکے تھے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے حالات سنگین ہو گئے تھے۔ اسی بنا پر انگریزوں کے خلاف جگہ جگہ سے بغاوتیں اُٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے ان بغاوتوں کو دبانے کے لیے مختلف طریقے اور حربے استعمال کیے۔ اسی بنا پر ۱۸۶۳ء میں ہندوستان کی مغربی سرحد پر ملک انگریزوں کے خلاف جنگ شروع ہو گئی تھی۔ اُس وقت اس علاقہ کو یاغستان کہتے تھے لیکن آج کل ملک کے اس حصے علاقہ غیر یا قبائلی علاقہ کہتے ہیں جسے حال ہی میں صوبہ خیبر پختونخواہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت، محمد حسین آزاد:

انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ مکتبہ جدید، کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس سفرنامے کا قلمی نسخہ آغا محمد اشرف نے لندن کی لائبریری سے حاصل کرنے کے بعد مرتب کیا تھا۔ محمد حسین آزاد نے وسط ایشیا کا سفر ۱۸۶۵ء میں انگریز حکومت کی جاسوسی کرنے کے لیے کیا تھا۔ اُس وقت وسط ایشیا کی ریاستیں روس کا حصہ تھیں۔ لہٰذا وہ روس کی ریاستوں میں حکومت ہند (برٹش گورنمنٹ) کے لیے جاسوسی کرنے پر معمور ہوئے تھے۔ محمد حسین کا سفرنامہ انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت تاریخی عناصر کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ایک طرف محمد حسین آزاد نے انگریزوں کے لیے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیئے ہیں تو دوسری طرف اپنے سفرنامے میں جہاں ضروری سمجھا تاریخی عناصر کو سفرنامے کا حصہ بھی بنایا۔

سیر ایران، مولانا محمد حسین آزاد:

مولانا محمد حسین آزاد کا سفرنامہ، سیر ایران امیر بخش کریمی پریس، س،ن۔ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ان کے سفرناموں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ تاہم سفرنامہ سیر ایران مولانا کی وفات کے بعد آغا محمد طاہر نے بھی مرتب کیا تھا۔ سفرنامے میں بعض تاریخی شواہد سے سفر کے دورانیے کا پتہ چلتا ہے۔ کیوں کہ مولانا محمد حسین آزاد، ۳۱ را کتوبر ۱۸۸۵ء کو حافظ

کی قبر پر حاضری دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے ۲۳رستمبر ۱۸۸۵ میں سفرا ختیار کیا اور دس ماہ کی سیاحت کے بعد ۲۴رجولائی ۱۸۸۶ء کو واپس لاہور پہنچے۔

اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا سفرنامہ سیر ایران ایک اہم سفرنامہ ہے۔ اگر چہ مذکورہ سفرنامے میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے کہ سفرنامہ میں واقعات کی ترتیب تو موجود ہے لیکن بعض مقامات کی واقعاتی تفصیل غائب نظر آتی ہے۔ سفرنامے کی ترتیب کے بارے میں خالد محمود لکھتے ہیں کہ: ''سیر ایران محمد حسین آزاد کے ان روزناموں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے جو مولانا محمد حسین آزاد دوران سفر میں یادداشت کے طور پر لکھ لیا کرتے تھے، مولانا محمد آزاد کا یہ سفرنامہ ایک سیاحتی مقصد کے تحت وجود میں آیا تھا۔'' (۱۴۳)

سیر برہما، مولوی عبدالخالق موحد:

سیر برہما، مولوی عبدالخالق موحد کا برہما کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ مطبع نامہ لکھنؤ سے ۱۸۹۳ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ سفرنامہ نگار کا برہما جانے کا مقصد تبلیغی تھا نہ کہ سیاحتی۔ انھوں نے برہما کی سیر کرتے ہوئے اس خطے کے مذہبی اور سماجی زندگی اور رسوم پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے تاریخی حالات اور سماجی معلومات جمع کر کے قاری تک پہنچانے کے لیے حقیقت پر مبنی تاریخ نگاری کا انداز اختیار کیا، اس کی یہ وجہ ہے کہ: ''اس سفرنامے کا اسلوب غیر ذاتی ہے اور بیانیہ بے حد سادہ ہے۔ تاہم برہما کے تاریخی حالات اور سماجی معلومات جمع کرنے اور انھیں صداقت سے پیش کرنے میں عبدالخالق موحد کا اسلوب ان کی مناسب معاونت کرتا ہے۔'' (۱۴۴)

روم و مصر و شام، مولانا شبلی نعمانی:

مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم و مصر و شام، قومی پریس، دہلی ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا۔ سفرنامے کی سنہ عیسوی کی اشاعت ۱۹۰۳ء میں بنتی ہے۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ: ''رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ/۱۸۹۴ء میں مَیں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا محض ایک طالب العلمانہ سفر تھا۔ اور چوں کہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا۔ نہ واقعاتِ سفر میں چنداں ندرت تھی۔ سفرنامہ لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا۔'' (۱۴۵) مذکورہ سفرنامے کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں کہ:

> مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ ''روم و مصر و شام'' پہلی بار ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس خالصتاً علمی نوعیت کے سفرنامے کا آغاز ۲۶ راپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے قسطنطنیہ کے سفر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سفر کے دوران عرب دنیا کے کتب خانوں اور درس گاہوں کی سیر کے ساتھ ساتھ علماء سے ملاقاتوں کے سلسلے قابلِ ذکر ہیں۔ (۱۴۶)

ایشیائی اردو سفرنامہ میں تاریخی عناصر کے تناظر میں شبلی نعمانی کے سفرنامے کو دیکھا جائے تو ان کے ترکی شام، فلسطین اور مصر میں سیر کرنے کا مقصد دوسرے سفرنامہ نگاروں سے مختلف تھا۔ علمی کتابوں کی تلاش میں سفر پر گئے جنھیں اہل

مغرب اپنے تصرف میں لے چکے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ: ''شبلی کے سفر روم وشام کا مقصد عام سیاحوں سے مختلف نوعیت کا تھا۔ وہ ملکوں کی سیر کرنے نہیں نکلے تھے ان کا مقصد ان خزانوں تک رسائی حاصل کرنا تھا جنھیں اقوامِ مغرب لوٹ کر لے گئی تھیں اور اب جن کے باقیات تک رسائی بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں۔'' (۱۴۷)

مولانا شبلی نعمانی نے علمی کتابوں کی تلاش کا ذکر تو کیا ہی ہے مگر سفر نامے لکھتے ہوئے انھوں نے جن ممالک کی سیاحت کی وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات اور ماضی کے مستند واقعات، کوائف اور اعداد وشمار بھی تحریر کیے ہیں یہی وجہ واقعات آگے چل کر مولانا شبلی نعمانی کے سفر نامہ میں تاریخی عناصر بن گئے ہیں۔

سیاحت امیری یعنی حالاتِ سفر ہندوستان: منشی آدم خان

سفر نامہ۔ سیاحت امیری یعنی حالاتِ سفر ہندوستان، منشی محمد آدم نے تحریر کیا ہے اور یہ سفر نامہ مطبع ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن سے ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ زیرِ نظر سفر نامہ حبیب اللہ خان (پیدائش ۱۸۲۷ء سمرقند) افغانستان کے بادشاہ تھے، انھوں نے مذکورہ سفر ۱۹۰۷ء میں کیا تھا۔ منشی محمد آدم خان ''جامِ جمشید'' اخبار کے سابق اڈیٹر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں صحافت کے رنگ کی جھلک ملتی ہے۔ سیاحتِ امیری، سفر نامہ لکھ کر مصنف نے نواب میر محبوب علی خان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سفر نامہ نگار کی رائے کے مطابق: ''امیر حبیب اللہ خان'' (۲ جنوری) امیر صاحب رونق افروز ہو گئے ہیں۔ رونق افروزی کی دھوم دھام اور تزک احتشام میدان کے شاہنشاہ [شہنشاہ] کے نائب اور پہاڑوں کے بادشاہ کے شان کے شایان تھی۔'' (۱۴۸)

امیر حبیب اللہ خان کے افغانستان واپسی ۱۰ر اپریل ۱۹۰۷ء ہوئی، اس طرح امیر حبیب خان کے سفر کا دورانیہ تین ماہ اور سات دن ہے۔ اس سفر میں تاریخی واقعات زمانی ترتیب کے ساتھ موجود ہیں۔

۱۹۰۷ء کا جاپان، ڈاکٹر محمد حسین:

سفر نامہ ۱۹۰۷ء کا جاپان، خطوط کی ترسیل کے انداز میں لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسین ماسکو کے سفر پر کسی مقصد کے تحت گئے تھے۔ اس سفر کے دوران جاپان میں بھی ان کا قیام ہوا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے جاپان کے تمام حالات اپنے سفر نامے میں لکھے ہیں۔ یہ سفر نامہ ایک طویل عرصے بعد منظر عام پر آیا۔ اس سفر نامے کو سید الطاف بریلوی نے رسالہ مصنف میں ترتیب کے ساتھ شائع کرایا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران اس کی اشاعت رک گئی اور بعد میں دوبارہ یہ سفر نامہ مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا لاہور سے شائع کیا۔ مذکورہ سفر نامے میں ان کے سفر کرنے کے مقصد کی وضاحت نہیں کی گئی ہے تاہم یہ سفر نامہ اپنے متن میں تاریخی عناصر اور جغرافیائی صورت حال کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ زیر نظر

سفرنامے کے بارے میں انور سدید کی رائے ہے کہ:

> ڈاکٹر محمد حسین نے سفرنامے میں اپنا مقصدِ سفر بیان نہیں کیا۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ماسکو کسی سرکاری کام پر گئے تھے یا ان کا مقصد عالم نوردی یا سیاحت تھا۔ تاہم انھوں نے سفر کی روداد کو جس انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے انداز ہوتا ہے کہ سیاحت ان کے لیے ایک اکتسابی مسرت کا وسیلہ تھی۔ اس سفرنامے میں اگرچہ انھوں نے جغرافیائی نشیب وفراز تاریخی واقعات اور معاشرتی آداب کا تذکرہ بھی پورے التزام سے کیا ہے۔(۱۴۹)

سفرنامہ بغداد، منشی محبوب عالم

منشی محبوب عالم کا دوسرا سفرنامہ ''سفرنامہ بغداد'' ہے اس سفرنامے میں انھوں نے عراق اور عرب کے دوسرے ممالک کی سیر وسیاحت کی اور سفر کے احوال لکھے ہیں۔ مذکورہ سفر انھوں نے مارچ کے مہینے میں ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ کیا تھا منشی محبوب عالم کو پہلی جنگ عظم میں بطورِ صحافی انڈین پریس نے ڈیپوٹیشن پر عرب اور عراق کے حالات معلوم کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ اس کام کے لیے ان کا انتخاب کرنل ریجنالڈ ایڈور ہیری ڈائر (تاریخ پیدائش ۹/اکتوبر ۱۸۶۴ء مری گھوڑا گلی، المعروف سر مائیکل اڈوائر) نے کیا تھا۔ بغداد اور عرب علاقوں کا سفر منشی محبوب عالم نے ۱۷/مارچ ۱۹۱۷ء میں کیا تھا۔ یہ وہی دور تھا جس دور میں ریشمی رومال تحریک کے علما ہندوستان سے باہر افغانستان، ترکی، مصر، مکہ وغیرہ میں اپنی تحریک کو وسعت دے رہے تھے۔ منشی محبوب عالم نے اپنے سفرنامۂ بغداد میں موقع کی مناسبت سے تاریخی اور سیاسی صورت حال کا ذکر بھی کیا ہے جس کی وجہ سے سفرنامہ تاریخی نگاری کے انداز میں ہے تو سہی لیکن اتنا ٹھوس نہیں، منشی محبوب عالم کے:'' سفرنامہ بغداد میں عرب اور عراق کی تاریخی اور جغرافیائی حالات کو بھی نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔ تاہم یہ معلومات سفرنامہ کے مربوط بیانیہ سے یکسر الگ نظر آتی ہیں۔ پیوندکاری کا یہ عمل سفرنامے کی روانی میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔''(۱۵۰) منشی محبوب عالم کے سفرنامہ نگاری کا انداز صحافتی ہے مگر تاریخی واقعات کی طرف جلد مائل ہوتے نظر آتے ہیں۔ خالد محمود کا بیان ہے کہ:''سفرنامہ بغداد میں عرب وعراق کی تہذیب وتمدن کے علاوہ تاریخ وجغرافیہ کو بھی اہمیت دی گئی ہے لیکن یہ سفرنامہ'' سفرنامۂ یورپ'' کا مقابلہ نہیں کرتا نہ اس میں وہ ربط روانی ہے اور نہ حیرت وشوق۔ البتہ دونوں سفرناموں کا اسلوب سادہ ،زبان سلیس اور لب ولہجے میں بے تکلفی ۔''(۱۵۱)

روزنامچۂ سیاحت، خواجہ غلام الثقلین:

روزنامچۂ سیاحت، خواجہ غلام الثقلین کا ایسا سفرنامہ ہے جو تاریخی اور جغرافیائی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ان کے سفر کا سال ۱۹۱۱ء ہے۔ ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کے تناظر مذکورہ سفرنامے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ روزنامچہ سیاحت کے بارے میں انور سدید لکھے ہیں کہ:''خواجہ غلام الثقلین کے ہاں تاریخ کو معاشرتی پس منظر میں

پڑھنے اور جغرافیہ کو موجود تناظر میں دیکھنے کا انداز نمایاں ہے۔ان کا ''روز نامچۂ سیاحت'' بظاہر روس، قسطنطنیہ، عراق، عرب، ایران، مکہ، مدینہ اور انھوں نے دو حوالوں سے پیش کیا ہے۔''(۱۵۲) سفر نامہ روز نامچۂ سیاحت ان ممالک کا سفر نامہ ہے جن کا ذکر مندرجہ بالا اقتباس میں ہوا ہے۔ایشیا کے ان ممالک کی سیاحت کے دوران سفر نامہ نگار نے تاریخی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے بھی وضاحت کی ہے۔سفر نامہ میں یہ خاص بات ہے کہ وہ: ''مناظر اور مظاہر سے بہت جلد بے تکلفی پیدا کر لیتے ہیں۔درمیان سے اجنبیت کے پردے اُٹھانے میں ان کا تاریخی شعور اور جغرافیائی مطالعہ بڑی مدد کرتا ہے۔''(۱۵۳)

روز نامچہ باتصویر، سفرِ مصر و شام و حجاز، خواجہ حسن نظامی:

خواجہ حسن نظامی کے دو سفر نامے ''روز نامچہ باتصویر، سفرِ مصر و شام و حجا'' اور ''سیر افغانستان'' ہیں۔سفر نامہ، سفرِ مصر و شام و حجاز، مکتبۂ قادریہ دہلی سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔خواجہ حسن نظامی نے سفر روانگی کی تاریخ یکم جون ۱۹۱۱ اور واپسی کی ستمبر ۱۹۱۱ء ہے، مذکورہ سفر ناموں میں تاریخی عناصر موجود ہیں۔اس بنا پر خواجہ حسن نظامی کے دونوں سفر نامے ایشیائی اردو سفر ناموں کی تحقیق میں شامل ہیں۔مصر کا دارالحکومت قاہرہ ایسے مقام پر واقع ہے کہ جہاں پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مابین سنگم ہوتا ہے۔یورپ اور وسطی ایشیا کے سفر پر جانے والے سیاحیوں کا یہاں سے اکثر گزر رہتا ہے۔اس لیے ہر آنے جانے والا سیاح اس خطے کی تاریخ کے بارے میں اپنے سفر نامے کا ذکر کرتا ہے۔خواجہ حسن نظامی مصر و شام و حجاز کے سفر کے دوران ان ممالک سے گزرتے ہوئے جدید تہذیب کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور تاریخی عناصر کو بھی اپنے سفر نامے کا حصہ بناتے ہیں۔

مشاہداتِ کابل و یاغستان، مولوی محمد علی قصوری:

مشاہداتِ کابل و یاغستان مولوی محمد علی کا سفر نامہ ہے۔زیرِ نظر سفر نامے ۱۹۱۸ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔مولوی محمد علی قصوری انگلستان سے تعلیم یافتہ تھے انھوں نے ریاضی کے علم میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔افغانستان کا سفر کرنے کے بعد وہ کابل میں حبیبیہ کالج کے نگران مقرر ہوئے۔مشاہداتِ کابل و یاغستان، مولوی محمد علی قصوی کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جو نو آبادیاتی دور کے سیاسی و تاریخی صورتِ حال کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔زیرِ نظر سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے اپنے تاثرات، مشاہدات اور تجربات کو حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔خالد محمود کی رائے ہے کہ: ''مولوی صاحب جہاں کہیں سیاسی فکر سے آزاد ہوتے ہیں تو انھوں نے تاریخ و جغرافیائی اور فطرت کے حسین مناظر پر بھی نظر ڈالی ہے۔''(۱۵۴)

سفر نامہ مشاہدات کابل و یاغستان ایک سیاسی نوعیت کا سفر نامہ ہے جو سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے عمل میں آیا تھا۔سفر نامہ نگار بذاتِ خود اس سفر پر روانہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انھوں نے حکیم محمد اجمل، ابوالکلام آزاد اور مولانا عبداللہ سندھی کے مشورے پر افغانستان کا سفر کیا تھا۔اس سفر کا مقصد افغان حکومت کو انگریزوں کے افغانستان پر حملے کے خطرے

سے آگاہ کرنا اور ہندوستان کے عوام کو آزادی دلانے کے لیے مدد کی ترغیب دینا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر مولوی صاحب کے سفرنامے میں سیاسی اور تاریخی عناصر در آئے۔

سرگزشتِ کابل مولانا عبیداللہ سندھی:

ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کے حوالے سے سرگزشتِ کابل مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفرنامہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے مرتب کر کے قومی ادارہ برائے تاریخ و ثقافت اسلام آباد سے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ کابل میں سات سال کو تحقیق کے لیے بنیادی ماخذ بنایا ہے۔ سفرنامہ کابل میں سات سال سندھ ساگر اکیڈمی لاہور سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ تحقیق سفرنامہ مولانا کی تحریروں اور ظفر خاں ایبک کی سوانح عمری کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے اور ۱۹۲۲ء میں ہندوستان واپس آئے۔ یوں ان کے سفر کا دورانیہ سات سال بنتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا سفر پہلی جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے عمل میں آیا تھا۔ دراصل مولانا موصوف نے ریشمی رومال (بنام ریشمی خطوط) تحریک کے سلسلے میں ایک سرکردہ رہنما کی حیثیت سے سفر کیا تھا۔ یہ تحریک برصغیر کے دیوبند مکتبہ فکر کے لوگوں نے چلا کر خطے کی آزادی کے لیے کوششیں کیں تھی۔ موصوف مولانا محمود الحسن شیخ الہند کی تحریک پر افغانستان کے سفر پر گئے تھے۔ ریشمی رومال تحریک کے زیرِ اثر ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر ردِ عمل ظاہر ہوا۔ بظاہر یہ دین کے علما اور مشائخ تھے لیکن انھوں نے انگریز حکومت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے جن سیاسی مقاصد کے تحت سفر کیا تھا صحیح معنوں میں اس کا حق ادا کر دیا تھا۔ خالد محمود کی اس حوالے سے رائے ہے کہ: ''مولانا عبیداللہ سندھی اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں اس درجہ منہمک رہے کہ انھیں افغانستان کو غیر سیاسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی مجموعی طور پر ان کا سفرنامہ ایک سیاسی ڈائری معلوم ہوتا ہے۔'' (۱۵۵)

سیر حامدی، نواب حامد علی خان:

حامد علی خاں ریاست رام پور ریاست کے نواب تھے، وہ انگریز حکومت کی دعوت پر مختلف ممالک کے سفر پر گئے تھے۔ سیر حامدی سفر کا دورانیہ دس ماہ کا تھا ہے جس کو انھوں نے سفرنامے کی یکجا کیا تھا۔ سفرنامے میں دی گئی معلومات کے مطابق انھوں نے جاپان، ہوائی، امریکہ، انگلستان اور مصر کی سیاحت کی تھی۔ سیر حامدی، نواب صاحب کا ایسا سفرنامہ ہے جس میں کئی ممالک کی سیاحت کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ جس دور میں نواب صاحب نے دنیا کے ممالک کا سفر اختیار کیا اُس دور کے لیے اتنی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اس لیے بیک وقت دنیا کے کئی ممالک کے سفر پر مشتمل اردو کا یہ پہلا سفرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسیرانِ مالٹا، حضرت مولانا سید حسین مدنی:

اسیرانِ مالٹا، حضرت مولانا حسین مدنی کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی کی پیش کش کے لیے ایک اہم سفرنامہ ہے۔ اسیرانِ مالٹا، مکی دارلکتب، لاہور سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا محمود الحسن نے ۱۹۱۵ء میں خود اپنے چند احباب کے ساتھ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا تھا۔ ان کے سفر کا مقصد سیاسی نوعیت کا تھا۔ جب یہ قافلہ مکہ معظّمہ پہنچا تو عرب کے حاکم شریف حسین نے جو انگریزوں کا وفادار تھا، خلافتِ عثمانیہ سے بغاوت کر دی تھی۔ شریف حسین نے ریشمی رومال تحریک سے تعلق رکھنے کے جرم میں مولانا محمود الحسن، سید حسین احمد مدنی اور دیگر ساتھیوں کو گرفتار کر کے حکومتِ برطانیہ کے حوالے کر دیا تھا۔ حکومتِ برطانیا نے مذکورہ مسافروں کو مالٹا کے ایک جزیزے میں قید کر دیا، جہاں وہ عرصہ چار سال تک قید رہے۔ اسیران مالٹا سفرنامہ نہ سفر تاریخی عناصر سے بھرپور ہے بلکہ بذاتِ خود ایک تاریخ ہے۔ محمد ریاض دورانی لکھتے ہیں کہ:

> اسیران مالٹا اکابر دین وسیاست کا تذکرہ ہے اور کیا خوب تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ ہماری تاریخ ہے، ایسی تاریخ جو نصابوں میں پڑھنا ممنوع ہے۔ وہ تاریخ جو ہماری حقیقی تاریخ ہے۔ وہ تاریخ جسے کل کا مورخ تسلیم کرے گا، وہ تاریخ جس نے صدیوں اپنا آپ منوانا ہے۔ ہم وہ تاریخ آپ تک پہنچانے کا شرف اور فخر حاصل کر رہے ہیں۔ (۱۵۶)

دوسری جنگِ عظیم کے آثار اور ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان کا سفر کیا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل مولانا محمد علی قصوری نے مولانا عبیداللہ سندھی کے کہنے پر پہلے سفر کر چکے تھے۔ مولانا محمود الحسن نے سرزمین عرب کا سفر اختیار کیا تھا۔ یہ وہ علمائے اسلام تھے جنھوں نے ریشمی رومال تحریک کے پھیلانے کے لیے سفر کیے تھے۔ ان مسلمانوں کے دیکھا دیکھی ہندو رہنماؤں نے بھی اسی عرصے میں افغانستان، روس، ترکی اور جرمنی وغیرہ کے اسفار کیے۔ اردو سفرنامے کے تاریخی حقائق کے حوالے سے یہ دور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انگریز حکومت جتنا مسلمانوں کی ریشمی رومال تحریک سے خوف زدہ تھی اتنی دیگر سیاسی جماعتوں کی سیاست سے خوف زدہ نہیں تھی۔ اس دور کی تحریکوں کی روک تھام کے لیے انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں ایک قانون بنایا جس کا نام رولٹ ایکٹ تھا۔

سفرنامہ افغانستان، خواجہ حسن نظامی:

خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ افغانستان آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اردو سفرنامے کی روایت میں خواجہ حسن نظامی کی سیاحت کا دوسرا مجموعہ سفرنامہ افغانستان ہے جس میں انھوں نے اپنے سفر کے آغاز، رخصت اور سفر سے واپسی (۲/اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی) کے بارے میں ہے۔ مذکورہ سفر کی غرض و غایت خاص طور پر معلوم نہیں ہوئی تاہم سفرنامہ کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ سفر مزارات کی زیارت کے لیے کیا تھا۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا

جا سکتا ہے۔ کہ خواجہ حسن نظامی نے مصر و شام وحجاز اور افغانستان کے سفر روحانی فیض کی غرض و غایت سے کیے تھے۔ افغانستان کی سیاحت کرتے ہوئے انھوں نے افغانوں کی سماجی اور معاشرتی جدوجہد کا نظارہ کیا ہے۔ افغانستان کے تعلیمی نظامی میں بھی گہری دلچسپی لی۔ مجموعی سیاسی اور سماجی صورتحال کا جائزہ بھی لیا، مزارات کی زیارت میں انھیں تہذیبی پس ماندگی اور عبرت کا احساس بھی ہوا۔

سیر افغانستان، سید سلیمان ندوی:

سفر نامہ افغانستان، سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا۔ سر علامہ محمد اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں مذکورہ سفر کیا تھا۔ سفر نامہ سیرِ افغانستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۰۸ء شائع ہوا تھا۔ افغانستان کے اس سفر پر سید سلیمان ندوی کے ساتھ سر اقبال اور سر راس مسعود بھی شامل تھے جو افغانستان کے حاکم نادر شاہ کی دعوت پر اس سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ اس سفر کا مقصد افغانستان کے تعلیمی نظام کا جائزہ لینا اور اس کے بعد مسائل کا ممکنہ حل تلاش کرنا تھا۔ سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ تاریخ، تہذیب، تمدن، جغرافیہ اور تعلیمی معاملات پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے خالد محمود کی رائے ہے کہ: ''سید سلیمان ندوی نے افغانستان کی سیاسی، سماجی تمدنی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی مجلسی، معاشی، علمی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو بغور دیکھا ہی نہیں بلکہ نہایت خوبی کے ساتھ اپنے سفر نامے میں سمیٹ لیا ہے۔'' (۱۵۷)

جہاں پر ہندوستانی وفد نے تعلیمی صورت حال کا سفر نامے میں ذکر کیا وہاں پر ان کی نظر ماضی کے حالات اور تاریخ کے اوراق پر بھی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ زیرِ مطالعہ سفر نامہ سفر نامہ افغانستان ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

رنگون سے فرار ۱۹۴۱ء، اے حمید:

رنگون سے فرار اے حمید کا سفر نامہ ہے، یہ غالب پبلیشرز، لاہور سے ۱۹۹۶ء، میں شائع ہوا ہے۔ زیرِ نظر سفر نامہ مصنف کی تاریخی انداز میں لکھی گئی آپ بیتی کی صورت میں ہے۔ چوں کہ سفر نامے کا دورانیہ دوسری جنگِ عظیم کا ہے مصنف کو دوران سفر جو جو واقعات پیش آئے انھیں زمانی ترتیب کے ساتھ قلم بند کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ تاریخ عناصر کی تفصیلات کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء میں یورپ میں شروع ہو چکی تھی اور اس کے اثرات ۱۹۴۱ء تک ہندوستان میں پہنچ چکے تھے۔

ترکی میں دو سال، ڈاکٹر عبادت بریلوی:

ڈاکٹر عبادت بریلوی ترکی میں درس و تدریس کے لیے گئے تھے۔ پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ انھوں وہاں کی تہذیب و ثقافت کے پہلو کی عکاسی تو کی ہے مگر واقعات کو بیان کرنے کی ایک شعوری کوشش بھی کی

ہے۔ جہاں روداِدِ سفر کا انھوں نے حقیقی واقعات سے آشنا کرایا ہے وہاں پر انھوں نے تاریخ کے پسِ منظر میں جا کر تاریخی عناصر کو سفر نامے کا حصہ بنایا۔

بجنگ آمد اور بسلامت روی کرنل محمد خان

کرنل محمد کے بجنگ آمد اور بسلامت روی سفر نامے ہیں۔ بجنگ آمد دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کا سفر نامہ ہے۔ جنگ کے دوران کرنل محمد خان بصرہ، بغداد، موصل، قاہرہ اور طبرق کے مقامات پر تعینات ہوئے تھے۔ اس لیے بجنگ آمد میں زیادہ تر جنگ کے واقعات کو سفر نامے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان کا دوسر سفر نامہ بسلامت روی ہے۔ یہ سفر تو انگلینڈ کا تھا مگر دوران سفر ان کا قیام تہران اور بیروت میں ہوا تھا۔ اس لیے ان شہروں کا تفصیلی ذکر بسلامت روی میں ملتا ہے۔ وہ فلش بیک یا تلمیحاتی انداز میں تاریخ کے واقعات کو سفر نامے کا حصہ بناتے ہیں۔ تحسین فراقی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''بجنگ آمد کا بیشتر حصہ تو ''نیم لفظین'' جنگ بستی پر مشتمل ہے اور اس میں بصرہ بغداد موصول قاہرہ اور طبرق کے ہلکے پھلکے نقش دیکھے جا سکتے ہیں۔ یا پھر ایک اور جگہ عربوں کے مدتوں پر لطف طنز بھی ملتا ہے۔'' (۱۵۸)

ابن انشا کے سفر نامے:

ابن انشا کے چلتے ہو تو چین کو چلئے، آوارہ گرد کی ڈائرہ، دنیا گول ہے، ابن بطوطہ کے تعاقب میں اور نگری نگری پھرا مسافر مشہور سفر نامے ہیں جن میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگار نے تاریخی عناصر بھی بیان کیے ہیں۔ سفر نامہ نگری نگری پھر مسافر میں زیادہ تر معلومات یورپی ممالک کی ہیں، بہت کم معلومات ایسی ہیں جو ایشیا کے بارے میں ہیں اس لیے مذکورہ سفر نامہ ایشیائی اردو سفر نامے کی صف سے باہر ہے۔ تاہم ڈاکٹر عقیلہ شاہین کا بیان ہے کہ: ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) ''آورہ گرد کی ڈائری'' (مطبوعہ ۱۹۷۱ء) ''دنیا گول ہے'' (مطبوعہ اگست ۱۹۷۲ء) ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) ابن انشا کے سفر نامے ہیں۔'' (۱۵۹)

قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے سفر ناموں میں ابن انشا کا نام سامنے آتا ہے۔ مگر ان کے سفر نامے طنزیہ اور مزاحیہ نوعیت کے ہیں۔ جہاں تک ان کے سفر ناموں میں تاریخی عناصر در آنے کا تعلق ہے تو چلتے ہو تو چین کو چلئے میں انھوں نے چین اور جاپان کے مابین جنگی واقعات اور دیگر تاریخی حقائق کو تاریخ نگاری کے انداز میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین لکھتی ہیں کہ: ''ابن انشا نے پیکنگ کے عجائب گھر کے حوالے سے چین کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے وہ ایک مورخ کی طرح ۲۰۶ قبل از مسیح سے لے کر ۱۹۶۶ء تک چین کی کہانی مستند انداز میں بیان کرتے ہیں۔'' (۱۶۰) ابن انشا کے سفر نامے میں جن معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کے بارے میں سعید احمد لکھتے ہیں کہ: ''ابن انشا نے چین کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور معاشی زندگی کو بڑی مہارت سے بیان کیا اور چینوں کو زندگی کے ہر شعبے

میں بہترین پایا ہے۔"(۱۶۱)

سفر نامہ چلتے ہوتو چین کو چلیئے، پہلی بار لاہور اکیڈمی سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اب تک یہ سفر نامہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ زیرِ نظر سفرنامے ابن انشا نے چین کی تاریخ اپنے انداز میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ: "ابن انشاء چین کی تاریخ، تہذیب وتمدن سے متاثر نظر آتے ہیں۔"(۱۶۲) جاپان کے چین پر حملے اور چینوں کی مذمت کا ذکر مذکورہ سفر نامے میں تاریخ وار واقعات کی صورت میں موجود ہے۔ اہل چین نے جاپان کے چین پر قبضہ کرنے کے منصوبے کو بالکل ناکام کر دیا۔ تحسین فراقی کے بقول: "کینٹین جیسے شہر جس کو قدیم تاریخ اور انقلابی تحریکوں کا گہوارہ تسلیم کیا جاتا ہے اس سرزمین پر ابن انشا پنچ کراس کے الناک ماضی کی تاریخ کو جذباتی اندازِ بیان میں کرتے ہیں۔"(۱۶۳)

سفر نامہ نگری نگری پھرا مسافر لاہور اکیڈمی سے پہلی بار ۱۹۷۴ء شائع ہوا۔ سفر ناموں کی ترتیب وتنظیم اور اشاعت کے تسلسل کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن انشاء نے لگاتار سفر اختیار کیے تھے۔ جیسے ہی ایک سفر اختتام پذیر ہوا ن کا سفر نامہ منظرِ عام پر آ گیا۔ ایشیائی اردو سفر ناموں میں نگری نگری پھرا مسافر ایسا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے مشرقِ بعید کے کئی ایک ممالک کا سفر کیا ہے۔ سفر نامے میں مشرقِ بعید کی تہذیب و، ثقافت اور تاریخی واقعات کا موازنہ پاکستان کے حالات وواقعات سے کیا۔

سفر نامہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں لاہور اکیڈمی سے اپریل ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ لندن جرمنی، جاپان اور سری لنکا اور ایران کے اسفار شامل ہیں۔ زیرِ نظر سفرنامے میں غالب حصہ ایشیائی ممالک کے سفر پر مشتمل ہے اس لیے تحقیقی مطالعہ میں شامل ہے۔ ابن انشا کے سفر نامے کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جنگِ عظیم اول کے بعد ایشیائی ممالک میں بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے:

ماسکو کی سفید راتیں مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ سنگِ میں، لاہور سے متعدد بار چھپ چکا ہے۔ زیرِ نظر سفرنامے کا دور ۸۰ کی دہائی کا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ سفر نامہ روس کی تہذیب وتمدن، معاشرت وتعلیم کی عکاسی کرتا ہے۔ روس کے سفر کا مقصد ادبی تقریب میں شرکت کرنا تھا۔ اس سفر کے دوران مصنف نے جہاں دیگر عناصر کو سفر نامے کا حصہ بنایا وہاں پر تاریخ کے واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔ محمد سلیم میاں لکھتے ہیں کہ: "مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں قدیم، جدید تاریخ، جغرافیہ، سیاحت، مشاہدہ اور رومانی کہانیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو آتی رہتی ہے۔"(۱۶۴)

سفر نامہ نیپال نگری مستنصر حسین تارڑ کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں فطرتی مناظر کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت اور تاریخ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سفر نامے میں تاریخ کو رمز، کنایہ اور تلمیح کے انداز میں بیان کیا

ہے۔ بہت کم ایسے مقامات ہیں جہاں انھوں نے ایک سطر سے زیادہ الفاظ میں تاریخی واقعات بیان کیے ہوں اسے بیک سیکر ینگ کہتے ہیں۔اسی لیے ان کی بات کی گہرائی اور گھیرائی عام قاری کو بہت کم سمجھ میں آتی ہے۔ تحسین فراقی لکھتے ہیں کہ:''تارڑ کی تاریخ قدیم پر خاصی نظر ہے۔ چنانچہ مقامات دیدہ اسے ماضی کی طرف کھینچے لیے جاتے ہیں۔وہ تاریخ کی دولابیت کا قائل معلوم ہوتا ہے اسے چاہیں تو تاریخ کی جبریت بھی کہ لیں۔''(۱۶۵)

ممتاز مفتی کے سفرنامے

لبیک، ہندیاترا اور شاہراہ ریشم ممتاز مفتی کے سفرنامے ہیں۔حج کے سفرناموں میں لبیک کی اپنی اہمیت ہے۔ انھوں نے حج کے لیے ۱۹۶۸ء میں سفر کیا۔حج کے دوران پیش آنے والے واقعات کو انھوں نے موازناتی انداز میں تحریر کیا ہے۔جہاں عرب کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، مذہبی صورت حال تحریر کی وہاں پر تاریخی حوالے سے بھی خاصی تفصیلات درج کیں۔ ہندیاترا میں بھارت کے دوسرے مذاہب کے ساتھ مذہبی امتیازات سے پردہ اُٹھایا ہے۔''شاہراہ ریشم'' پاکستان اور چین کے مابین رابطے کے لیے بنی ہوئی سڑک پر سفر ہے۔یہ سفر پاکستان کی سرحد کے اندر پاک چین بارڈر تک کا سفر تھا۔ ممتاز مفتی کی سفرنامہ نگاری کے حوالے سے ممتاز مفتی لکھتے ہیں کہ:''لبیک سفرِ حج کے واقعات پر مشتمل ہے۔...... ہندیاتر اصل ہند کے چہرے سے نقاب کشائی ہے......''شاہراہ ریشم'' یہ اس سفر کی روداد ہے جو مفتی صاحب نے چین اور پاکستان کی سرحد تک طے کیا ہے۔''(۱۶۶)

محمد سعید حکیم کے سفرنامے:

ماہ روز، روزنامچہ سفرِ روس، ایک مسافر چار ملک، کوریا کہانی کی محمد سعید کے سفرنامہ ہیں۔ ماہ روز ہمدرد اکیڈمی کراچی سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔روس کے سفر کے دوران حکیم محمد سعید نے روس کے تاریخ اور جغرافیہ کو سفرنامے کا حصہ بنایا۔ایک مسافر چار ملک بھی حکیم محمد سعید کا سفرنامہ ہے۔ یہ ہمدرد فاونڈیشن کراچی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرے سفرناموں کی طرح یہ سفرنامہ بھی تاریخی عناصر کے حوالے سے اہم ہے۔حکیم محمد سعید نے سری لنکا، بنگلہ دیش، ملائیشیا اور آسٹریلیا کا سفر کیا۔وہ جس ملک میں پہنچتے ہیں اُس ملک کے تاریخی عناصر اور سماجی صورت حال کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔اسی طرح سنگاپور میں قیام کے دوران وہاں کی تہذیب و تاریخ کو بھی ایک خاص پیرائے میں بیان کیا ہے۔

کوریا کہانی حکیم محمد سعید کا ایک اور سفرنامہ ہے جس میں ایشیا کے حوالے سے تاریخی عناصر موجود ہیں۔ یہ سفرنامہ ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی سے ۱۹۸۳ء میں چھپا تھا۔حکیم محمد سعید نے کوریا کی تاریخ کے عناصر ایک تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔تاریخ کے یہ عناصر دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو کوریا، پاکستان، چین اور روس جیسی ایٹمی طاقتوں کے انتہائی مشرق میں واقع ہے۔کوریا ایک ایسا جزیرہ ہے جسے اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت

بیرونی واقعات سے نبرد آزما رہنا پڑھتا ہے۔کوریا کہانی میں تاریخی عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔سفرنامہ نگار نے سفرنامے میں تاریخ اور جغرافیہ کے حقیقی واقعات اور صورت حال کو بیان کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ڈاکٹر انور سدید سفرنامہ کوریا کہانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:''حکیم محمد سعید کے سفرنامے میں تاریخ کو جغرافیہ اور سیاست میں ضم کرنے کی پوری کاوش کی ہے اور تحقیق کا زیور اکثر اوقات غالب آجاتا ہے سفر رک جاتا ہے۔''(۱۶۷)

حکیم محمد سعید کے ایشیا کے حوالے سے دیگر سفرناموں میں ''یہ ہے ترکی ہے'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۰ء؛''یہ جاپان ہے''؛ کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۱ء؛''دورانِ روس'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۱ء؛''سعید سیاح ترکی میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۲ء؛''سعید سیاح چین میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۲ء؛''سعید سیاح تہران میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۳ء؛سعید سیاح ڈھاکہ میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۳ء؛''سعید سیاح سری لنکا میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۳ء؛''استنبول کا آخری سفر'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۴ء؛''سعید سیاح سلطنت عمان میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۴ء؛''دہلی کی سیر'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۴ء؛''ڈھاکہ میں سعید سیاح کے چار دن'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۵ء؛''سعید سیاح جاپان میں'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۵ء؛''جاپان کہانی'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۶ء اور ''پرواز فکر'' کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۸ء؛

علی سفیان آفاقی کے سفرنامے

ایران یاترا اور دوران سفر علی سفیان آفاقی کے ایسے سفرنامے ہیں جو بطور ایشیائی سفرنامے کے تحقیقی مطالعہ میں شامل ہیں۔سفرنامہ ایران یاترا کے دو حصے ہیں۔علی صفیان آفاقی نے ایران کا ایک سفر انقلاب سے کچھ عرصہ پہلے کیا اور پھر دوسرا سفر انقلابِ ایران سے کچھ عرصہ بعد میں کیا تھا۔ایران یاترا ایسا سفرنامہ جس میں اسلامی انقلاب کی تاریخ سفرنامے کا محور نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مذکورہ سفرنامے میں ایران کے تاریخی عناصر اور عوامی رویوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔

علی سفیان آفاقی کا سفرنامہ دوران سفر سارنگ، لاہور سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔علی سفیان آفاقی نے یہ سفر بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بیگم خالدہ کے ابتدائی دور میں کیا تھا۔۱۹۶۹ء میں سفرنامے نگار نے بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا جس کا ذکر انھوں نے زیر نظر سفرنامے میں کیا تھا۔اُس وقت بنگلہ دیش مشرقی پاکستان ہی تھا۔یہ بعد میں الگ ہو کر بنگلہ دیش بنا۔ایک عرصے تک پاکستان کے سفارتی تعلقات منقطع رہے۔تعلقات استوار ہونے پر علی سفیان آفاقی نے بنگلہ دیش کا سفر کرنے کے بعد دوران سفر سفرنامہ لکھا۔زیرِ نظر سفرنامہ سری لنکا، بنگلہ دیش، بنکاک(تھائی لینڈ) اور جاپان کے ممالک کا ہے۔سفرنامہ نگار نے جن ملکوں کی سیر کی ہے اس سفرنامے میں ان کی تاریخی اور تہذیبی عناصر وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔سیاحت کے

دوران سفر نامہ نگار نے جہاں دوسرے ممالک کی تاریخ اور معاشرت کو موضوع بنایا ہے وہاں پر بنگلہ دیش کی مجموعی صورتِ حال، سیاحت اور پاکستان کے ساتھ سفارتی صورت حال اور عوامی رویوں کو ترجیحی بنیادوں پر موضوع بنایا ہے۔

تذکرہ چین از بریگیڈیئر گلزار احمد:

تذکرہ چین بریگیڈیئر گلزار احمد کا سفر نامہ ہے۔ جو انٹرنیشنل پبلیشرز، لاہور سے شائع ہوا تھا۔ گلزار احمد بریگیڈیئر چین کے لیے سفر کا آغاز ۱۹۸۲ء کے شروع میں کیا تھا۔ تاریخ کے واقعات کا سیاحت کے دوران اندراج باقاعدہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ مگر سفرنامے میں کسی کسی مقام پر آمد و رفت کی تاریخ کا تعین ملتا ہے۔ بریگیڈیئر گلزار احمد چین کی ایک یونیورسٹی کی سیاحت کا ذکر کرتے ہیں کہ: ''۳ مئی ۱۹۸۲ء مس نانکنگ یونیورسٹی ۸۰ ویں سالگرہ منائی جائے گی۔'' (۱۶۸) سفرنامے میں جہاں پر تہذیب، ثقافت، سیاست معاشرت اور تعلیم پر قابلِ تعریف بحث کی ہے وہاں پر تاریخی عناصر کو بھی بیان کیا ہے۔

سفر تین درویشوں کا، محمد اختر ممونکا:

سفر تین درویشوں کا، محمد اختر ممونکا سفر نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ سفر انھوں نے ٹورسٹ کمپنی کی طرف سے کیا تھا۔ سفر تین درویشوں کا سفرنامے میں محمد اختر ممونکا نے تھائی لینڈ، سنگاپور، کوالالمپور، انڈونیشیا، آسٹریلیا، جاپان اور فلپائن کے ممالک کے اسفار کی تفصیل درج ہے۔ ان کے سفر کا مقصد پاکستانی سیاحوں کے لیے ہوٹل کے کرایوں کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھے کرنا تھا۔ سفرنامے میں غالب حصہ ایشیائی ممالک کی سیاحت کا ہے۔ جس میں مذکورہ ممالک کے تاریخی واقعات کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے میں تاریخی عناصر بڑی تعداد میں حصہ بن گئے ہیں۔

امجد اسلام امجد کے سفر نامے

شہر در شہر، ریشم ریشم اور چلو جاپان چلتے ہیں، امجد اسلام امجد کے سفر نامے ہیں۔ کتاب شہر در شہر میں دو سفر نامہ شامل ہیں۔ پہلے سفرنامے میں پیرس، مانڑیال، واشنگٹن، ٹورنٹو، لاس اینجلس، شکاگو اور لندن کے سفری حالات شامل ہیں۔ زیر نظر کتاب کے دوسرے سفرنامے میں بھارت کے شہر انبالہ، سہارنپور اور دہلی کے سفر کے حالات شامل ہیں۔ بھارت کے سفر کے دوران امجد اسلام امجد نے تاریخی واقعات کو جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امجد السلام سفر میں تاریخی عناصر کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

امجد اسلام امجد کا دوسرا سفر نامہ ریشم ریشم ہے جو سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سفرنامے میں مصنف نے جہاں چینی قوم کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے وہاں پر ماؤ کی شخصیت کے گرد اگرد گھومنے والے تاریخی عناصر کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ بیسویں صدی کے تاریخی عناصر کے حوالے سے ماؤزے تنگ کی شخصیت کو تاریخ

عالم کے عظیم ترین انسانوں میں بڑا مقام حاصل ہے۔

چلو جاپان چلتے ہیں امجد اسلام امجد کا تیسرا سفرنامہ ہے جو دوست پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ زیرِنظر سفرنامہ جاپان کے علاوہ بھارت، مسقط اور دبئی کے ملکوں کے اسفار پر مشتمل ہے۔ سفرنامے میں مصنف نے جاپان کی تاریخی اور تہذیبی عناصر کو لاشعوری انداز میں بیان کیا ہے۔ امجد اسلام امجد نے پاکستان کے تاریخی عناصر اور سماجی صورت حال کا جاپانی اور چینی معاشرے کے ساتھ تاریخی پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے موازنہ کیا ہے۔ مصنف تہذیبی او معاشرتی پہلوؤں سے بھی متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ جاپان میں امریکہ کی جدید ثقافت کے نمایاں آثار اور جاپانی معاشرے کی قدامت پسندی کا خاص طور ذکر کیا گیا ہے۔

ہمالہ کے اُس پار ۱۹۷۷ء انور راجا:

ہمالہ لے اُس پار انور راجا کا ہے جو کلاسیک لاہور سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو ہانگ کانگ، کوریا اور چین کے سرکاری دورے پر گئے تو اپنے ساتھ وفد بھی لے کر گئے تھے۔ انور راجا، ذوالفقار علی بھٹو کے خصوصی مشیر ہونے کے باعث وفد کا حصہ تھے۔ ہمالہ کے اُس پار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ سفرنامہ کمیونسٹ دور کے تاریخی واقعات کو سموئے ہوئے ہے۔ سفرنامے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر سفرنامے پر کمیونزم کے اثرات غالب ہیں۔ ایک جگہ بھٹو صاحب سکول کے بچوں کا شاندار پی ٹی شو دیکھتے ہیں تو انور راجا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ پاکستان میں بھی آ کر رہے گا۔ ان کا اشارہ کمیونزم کی طرف تھا۔

حقیقت جاپان محمد بدرالاسلام فضلی:

محمد بدرالاسلام جاپان میں ۱۹۳۰ء میں گئے تھے۔ حقیقت جاپان ان کی زندگی کا پہلا سفرنامہ تھا۔ وہ جاپان میں اردو اور فارسی پڑھانے کے لیے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ یعنی جاپان کا سفر تدریسی مقاصد کے تحت کیا گیا تھا۔ سفرنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامے میں تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی بحث کی نسبت سفر کے مسائل کم کرنے کے طریقوں پر زیادہ زور دیا گیا۔ تاہم سفرنامے میں مذکور تاریخی عناصر اہمیت کے حامل ہیں۔

جہاں نما ۱۹۶۳ء، ممتاز احمد خان

جہاں نما ممتاز احمد خان کا سفرنامہ ہے، یہ مکتبہ اقدام گلبرگ لاہور سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ایشیائی ممالک میں تاریخ کے حوالے سے سفرنامے کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ سفرنامے میں موجود تاریخی عناصر اہمیت کے حامل ہیں۔ مصنف نے اپنے سفر کے دوران ایران کے شہر تہران، مشہد، رامسر، بابسر، شیراز، اصفہان، عراق کے شہر بغداد، بابل مدائن کے علاوہ سلوکیہ ٹیسی فون Ctesiphon کربلا، نجف جیسے شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے اپنے سفرنامے میں سفر

کے واقعات قلم بند کیے۔ اسی طرح ترکی کے شہر استنبول، بھارت کے شہر دہلی کا سفر قابل ذکر ہے جہاں پر ممتاز احمد خان دوران سیاحت گئے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید سفر نامہ کے کی تاریخی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> معنوی طور پر ممتاز احمد خان خواجہ احمد عباس اور محمود نظامی کے قبیلے کے سفر نامہ نگار نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں تلاش کرتی ہے۔ ان کا سفر نامہ جہاں نما ایران، عراق ترکیہ، ہالینڈ، جرمنی فرانس جیسے شہروں کے سفر پر محیط ہے اور مشاہدات اور تاثرات کی بنت میں تاریخ کو یوں سمیٹتا ہے کہ حال اور ماضی آپس میں ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔(۱۶۹)

ارض خیام وحافظ، ۱۹۶۳ء منظور ممتاز

ارض خیام وحافظ منظور ممتاز کا سفر نامہ ہے جو ممتاز پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۶۳ء میں پہلی بار اور ۶۴ء میں دوسری بار شائع ہوا۔ سفر نامے میں زاہدان، مشہد، طوس نیشا پور، تہران، اصفہان اور شیراز کے شہروں کے تاریخی عناصر کو سفر نامے کا حصہ بنایا۔ موضوع ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کے حوالے سے مذکورہ سفر نامہ شامل تحقیق ہے۔

دنیا میرے آگے، ۱۹۷۵ء جمیل الدین عالی

دنیا میرے آگے جمیل الدین عالی کا سفر نامہ ہے جو شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سفر نامہ میں فرانس، برطانیا، روس، مصر، لبنان، ایران بھارت کے بارے میں ہے۔ سفر نامے میں انہی ممالک کے تاریخ، تہذیب اور سیاسی حوالے سے تفصیل درج کی ہے۔ چوں سفر نامے کا زیادہ حصہ ایشیائی ممالک کی سیر پر مشتمل ہے اس لیے سفر نامے دنیا میرے آگے کو تحقیقی مطالعہ حصہ کا بنایا گیا ہے۔ تحسین فراقی لکھتے ہیں کہ: ”انھوں نے اپنے سفر نامے میں خاصی تاریخی تفاصیل دی ہیں جن کے باعث کہیں کہیں انداز سپاٹ ہو گیا ہے۔“(۱۷۰)

چین ہے تو چین ہے، تاج محمد لنگا:

چین ہے تو چین ہے تاج محمد لنگا کا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ نظریاتی نوعیت کا ہے۔ تاج محمد لنگا نے ۱۹۷۶ء میں وزیر اعظمِ پاکستان کے ساتھ سفر کیا تھا۔ سفر کے اختتام پذیر ہوتے ہی انھوں نے اسے کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کرا دیا۔ مصنف ایک سوشلسٹ سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے پسندیدہ مقامِ سیاحت بھی کوریا اور چین ہی تھے۔

ایک ہفتہ چین میں، کوثر نیازی

مولانا کوثر نیازی بھی سوشلسٹ سیاسی جماعت کے ایک متحرک رہنما تھے۔ انھوں نے چین کے سفر کے دوران سیاسی صورت پارٹی کے رہنما کے حوالے سے سفر کی روداد لکھی۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ: ”مولانا کوثر نیازی ۱۹۷۳ء میں

ایک سیاسی پارٹی کے رہنما کی حیثیت میں چین کا دورہ کیا۔ان کا سفرنامہ ''ایک ہفتہ چین میں'' بظاہر سیاسی نوعیت کا سفرنامہ ہے لیکن مولانا کوثر نیازی اسے سفر بیتی بنانے کی کاوش کی ہے۔''(۱۷۱)

سفرِ مینا،۱۹۸۳ء اشفاق احمد:

سفرِ مینا اشفاق احمد کا سفرنامہ ہے جو کتابی صورت میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے میں چین، اٹلی، سپین اور امریکہ کے علاوہ دو ایک اور اسفار کا ذکر ہے۔اشفاق احمد جس سال چین کے سفر پر تھے اُسی سال ماؤ کی وفات ہوئی تھی۔سفر مینا کے سفرناموں میں رومۃ الکبریٰ، عرش منور (سپین) چنگوا پاچستان (چین) خوابوں کے جزیرے (امریکہ) کے سفرنامے ہیں۔سفر مینا میں موجود سفرنامہ ''چنگوا پاچستان تحقیق کا حصہ ہے۔زیرِ نظر نامے میں چین کے عظیم ہنما ماؤ کے بارے میں تاریخی عناصر کی ہلکی سے جھلک ہی ملتی ہے۔ان سفرناموں میں اشفاق احمد: ''اپنے مشاہدے کو آپ کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ تاریخ کی ہیئت اور جغرافیے کی معنویت تبدیل ہو جاتی ہے اور آپ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔''(۱۷۲)

اے آب رودِ گنگا،۱۹۷۸ء محمد رفیق ڈوگر:

اے آب رودِ گنگا،۱۹۷۸ء محمد رفیق ڈوگر کا سفرنامہ ہے جو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر سفرنامہ اے آبِ رودِ گنگا کا عنوان سے مصنف رفیق ڈوگر نے علامہ اقبال کے ترانہ ہندی کے ایک شعر کے مصرعے ''اے آب رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو'' سے لیا ہے۔جب کہ اس شعر کا دوسرا مصرع: ''جب اترا تھا تیرے کنارے کارواں ہمارا'' ہے۔بھارت کے سفر کے دوران مصنف نے وہاں کے شہروں کی تہذیب، ثقافت اور تاریخی عناصر کا ذکر بھی کرتے ہوئے ہیں۔

ذوق دشت نوردی۱۹۹۱ء۔۱۹۹۰ء، اے بی اشرف، ڈاکٹر

ذوق دشت نوردی اے بی اشرف، ڈاکٹر کا سفرنامہ ہے جو سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔اے بی اشرف نے برطانیا، ترکی، قبرس، یونان، اٹلی، آسٹریا، چیکوسلاویکیہ، ہنگری، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، ترکی، شام، اُردن اور عراق وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ان کے سفرنامے ''شوق صحرانوردی'' میں تقریباً تمام ملکوں کے تاریخی عوامل کو قدرِ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

دلی دور ہے،۱۹۸۸ء قمر علی عباسی:

دلی دور ہے قمر علی عباسی کا سفرنامہ ہے جو شبلی پبلی کشنز، کراچی سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔اردو سفرنامہ نگاری میں قمر علی عباسی کا نام بھی اہم ہے۔انھوں نے بہت سے سفرنامے لکھے ہیں جن میں ''دلی دور ہے''، ''بغداد زندہ باد'' اور ترکی

میں عباسی'' اہم ہیں۔قمر علی عباسی کے سفر ناموں میں تاریخی عناصر غیر ارادی طور پر سفر نامے کا حصہ بنتے ہیں۔ بغداد زندہ باد فضلی سنز کراچی سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مصنف کا عراق کے حوالے سے دوسرا سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے میں تاریخی اور معاشرتی حقائق کو نئے سرے سے بیان کیا ہے۔

ترکی میں دو سال، ڈاکٹر عبادت بریلوی:

ترکی میں دو سال، ڈاکٹر عبادت بریلوی کا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ مشاہداتی انداز کا ہے۔متعارف سفر نامے میں مصنف کے مشاہدات زیادہ گہری نوعیت کے ہیں۔عبادت بریلوی سفر کے مشاہدات کہیں نہیں لکھتے بلکہ اپنے سفر نامے تاریخی حقائق کا ذکر بھی کرتے ہیں۔وہ یوں تو ترکی میں تدریسی مقاصد کے لیے گئے تھے۔دو سال تک اپنی تدریس کی خدمات سر انجام دیں۔اس دو سال کے عرصے میں انھوں نے ترک قوم کی تاریخ، تہذیب، معاشرت اور ثقافت کے ان گنت پہلوؤں کا مشاہدہ کیا اور سفر نامے کی صورت میں قلم بند کیا۔ جنھیں قاری: ''پڑھ کر اس ملک کی تاریخ، جغرافیہ، سیاست، تہذیب، معاشرت، اور دیگر سماجی حالات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔''(۱۷۳)

حوالہ جات

۱۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ادبی اصناف، گجرات اردو اکادمی گجرات ۱۹۸۹ء ۱۳۸

۲۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اورینٹ پبلشرز، لاہور۔ ۱۹۹۹ء۔ ص ۱۰

۳۔ سہیل احمد خان، منتخب ادبی اصطلاحات، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور: ۲۰۰۵ء۔ ص ۳۳

۴۔ عبدالرحمٰن نوری (مرتب)، اردو اصناف ادب، رحمانی پبلیکیشنز، اسلام پورہ، مہاراشٹر ۲۰۱۶ء، ص ۵۶

۵۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ادبی اصناف، ۱۳۹۔۱۴۰

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۰)

۷۔ عبدالرحمٰن نوری (مرتب)، اردو اصناف ادب، ص ۵۸

۸۔ ایضاً، ص ۵۵

۹۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ۱۹۹۹ء۔ ص ۹

۱۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء۔ ۱۸۸۔۱۸۹

۱۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء،
ص ۱۲۱

۱۲۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۹

۱۳۔ عطاالرحمان نوری، اردو اصنافِ ادب، رحمانی پبلی کیشنز، اسلام پورہ مالیگاؤں، مہاراشٹر، ۱۹۱۶ء ص ۵۵، ۵۶

۱۴۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۹

۱۵۔ سید شہاب الدین دسنوی، فہمیدہ بیگم، (مرتبین) اردو جامع اللغات، جہلم بک کارنر شوروم، س ن، ص ۶۱۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۸۹

۱۷۔ مولوی سید احمد، دہلوی (مرتب) فرہنگ آصفیہ (جلد سوم) لاہور، مرکزی اردو بورڈ گلبرگ، ۱۹۷۷ء ص ۸۰

۱۸۔ Advanced Learner's Dictionary, Oxford University Press Great clareden street oxford.P# 1384 ox 2,6 d)

۱۹۔ مولوی سید احمد دہلوی (مرتب) فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، ص ۱۴۷)

۲۰۔ Tim Buckwalter, Dilwortj Parkinson, A Freqanecy Dictionary of Arbic, RoutledgeTaylorand Francis Group.Landon and new yourk2011, page no.101

۲۱۔ As , page no.466

۲۲۔ مولوی سید احمد دہلوی (مرتب) فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم۔۳۴۴

۲۳۔ Tim Buckwalter, Dilwortj Parkinson, A Freqanecy Dictionary of Arbic,page no.198

۲۴۔ Advanced Learner's Dictionary,P# 1385)

۲۵۔ https://www.ldoceonline.com/dictionary/travelle(مورخہ ۱۷رنومبر ۲۰۲۰ء بوقت دن ۱۲:۰۰)

۲۶۔ https://www.merriam- webster. com/dictionary/traveler
(مورخہ ۲۰ردسمبر ۲۰۲۰ء بوقت دن ۱۰:۰۰)

۲۷۔ سید شہاب الدین دسنوی، فہمیدہ بیگم، (مرتبین) اردو جامع اللغات، جہلم بک کارنر شوروم، س ن ص ۵۸۹

۲۸۔ مولوی سید احمد دہلوی (مرتب) فرہنگ آصفیہ، ص ۱۴۱

۲۹۔ The New International Webster's comprehensive dictionary, tredent press international(USA),1996 edition P#1336

۳۰۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے، سہ ماہی ۹۸۔۱۹۹۷ء، سفرنامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶، ۳۷، مدیر شاہد حسن رضوی اردو اکادمی بہاولپور، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴

۳۱۔ ایضاً، سفرنامہ نمبر، ص ۶۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۴

۳۳۔ http//www.collins dictionary.com/dictionary/english/travelogue
(مورخہ ۲۱رنومبر ۲۰۲۰ء بوقت دن ۱۱:۰۰)

۳۴۔ https://www.lexico.com/definition/travelogue (مورخہ ۲رنومبر ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۱:۰۰)

۳۵۔ https:// www. ldoceonline.com/dictionary/ travelogue
(مورخہ ۱۳رنومبر ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۰:۰۰)

۳۶۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے، ص ۶۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۶۵

۳۸۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۱

۳۹۔ یوسف خان کمبل پوش، تاریخ یوسفی عجائبات فرنگ، (مرتب) مظہر احمد، ڈاکٹر، کارنر بک، جہلم،

ص۲۰۱٦ء،ص ۱۱

۴۰۔ ایضاً،ص۱۰۔۱۱

۴۱۔ انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفرنامہ،ص۲۸

۴۲۔ ایضاً،ص۵٦

۴۳۔ مولوی سید احمد دہلوی(مرتب)فرہنگ آصفیہ،جلد اول۔ص۵۸۴

۴۴۔ Offline Urdu Lughat,Urdu to Urdu Dicyionary intrernet(مورخہ ۱۳/نومبر ۲۰۲۰ء بوقت رات ۹:۰۰)

۴۵۔ محمد صادق علی گل،ڈاکٹر،فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک،ص۱

۴٦۔ غلام رسول مہر،(مترجم،انسائیکلوپیڈیا تاریخ،ص۷

۴۷۔ ایضاً،ص۷

۴۸۔ محمد صادق علی گل،ڈاکٹر،فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک،ص۱

۴۹۔ ایضاً،ص۱۔۲

۵۰۔ غلام رسول مہر(مترجم)انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم،(جلد اوّل)ص۷

۵۱۔ ایضاً،ص۷

۵۲۔ ایضاً،ص۷۔۸

۵۳۔ ایضاً،ص۸

۵۴۔ ایضاً،ص۱۰

۵۵۔ ایضاً،ص۱۰

۵٦۔ ایضاً،ص۱۰

۵۷۔ ایضاً،ص۱۰

۵۸۔ ایضاً،ص۱۱

۵۹۔ ایضاً،ص۱۲

٦۰۔ ایضاً،ص۷

٦۱۔ محمد صادق علی گل،ڈاکٹر،فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک،ص۱٦

٦۲۔ غلام رسول مہر،(مترجم)''انسائیکلوپیڈیا تاریخ''ص۱۰

٦٣۔ ایضاً،ص ۱۰

٦٤۔ ایضاً،ص ۱۰

٦٥۔ ایضاً،ص ۱۰

٦٦۔ ایضاً،ص ۱۰

٦٧۔ محمد صادق علی گل، ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک، ص ۹

٦٨۔ ایضاً،ص ۱۱

٦٩۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون، مقدمہ، مولانا راغب رحمانی (مترجم) نفیس اکیڈیمی، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۲

٧٠۔ تاریخِ طبری، جلد اوّل، ص ۲۰۸، ۱۹۹، بحوالہ محمد صادق علی گل، ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک، ص ۳۰۰

٧١۔ محمد صادق علی گل ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک، ص ۳۰۰)

٧٢۔ ایضاً،ص ۳۰۱

٧٣۔ ایضاً،ص ۱۱۷

٧٤۔ ایضاً،ص ۱۱۷

٧٥۔ ایضاً،ص ۱۲۲

٧٦۔ ایضاً،ص ۱۳۲

٧٧۔ ایضاً،ص ۱۳۵

٧٨۔ https://www.tripsavvy.com›Destinations›Asia(مورخہ ۱۹/اگست ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۰:۳۰)

٧٩۔ https://www. tripsavvy.com›Destinations›Asia(مورخہ ۱۹/اگست ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۰:۳۰)

٨٠۔ SearchOnlineEtymologyDictionary".www.etymonline.com(مورخہ ۲۵/اگست ۲۰۲۰ء بوقت رات ۸:۲۰)

٨١۔ https://en.wikipedia.org›wiki›List_of_continent_name_etymologies/(مورخہ ۱۹ اگست ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۰:۳۰)

٨٢۔ SearchOnlineEtymology Dictionary".www.etymonline.com(مورخہ ۹/ستمبر ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱:۰۰)

٨٣۔ https://www. tripsavvy.com›Destinations›Asia(مورخہ ۱۹/اگست ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۰:۳۰)

۸۴۔ https//:en.wikipedia.org›wiki›List_of_continent_name_etymologi/(مورخہ۱۹ اگست۲۰۲۰ء بوقت رات۱۰:۳۰)

۸۵۔ SearchOnlineEtymologyDictionary".www.etymonline.com(مورخہ۹ ستمبر۲۰۲۰ء بوقت رات ۱:۰۰)

۸۶۔ محمد صادق علی گل، ڈاکٹر، فن تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک۔ص ۲۱۷

۸۷۔ ایضاً،ص ۲۲۲

۸۸۔ ایضاً،ص ۲۱۹

۸۹۔ ایضاً،ص ۲۱۷

۹۰۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نصرت پبلیشر، دہلی: ۱۹۸۷۔ص ۲۲۵

۹۱۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے،ص ۶۵

۹۲۔ ایضاً،ص ۷۶

۹۳۔ ایضاً،ص ۵۷

۹۴۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نصرت پبلیشر، دہلی: ۱۹۸۷۔ص ۲۲۴

۹۵۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے،ص ۷۶

۹۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۶۹

۹۷۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے،ص ۷۶

۹۸۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۶۹

۹۹۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے،ص ۶۵

۱۰۰۔ محمود خالد، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ جامعہ دہلی ۲۰۱۱ء،ص ۲۴

۱۰۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۷۰

۱۰۲۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ،ص ۲۵

۱۰۳۔ سید جاوید اقبال، ''اردو سفرنامے کے مطالعات''، مشمولہ الزبیر سفرنامے،ص ۶۶

۱۰۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۵۶

۱۰۵۔ ایضاً،ص ۵۴

۱۰۶۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں،ص ۲۱۷

۱۰۷۔ سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفرنامہ، (تنقید و تجزیہ) عرشی پبلیشرز، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۶۔۲۷

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۸۳، بحوالہ، اردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان از ذوالفقار علی احسن۔ ص ۱۶۵

۱۰۹۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، ص ۲۳۰

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۸

۱۱۱۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۳۵

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۱۳۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نصرت پبلشر، دہلی: ۱۹۸۷ء۔ ص ۲۱۹

۱۱۴۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۹

۱۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردوادب میں سفرنامہ، ص ۱۲۷

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۵۰۔۵۱

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۱۹۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی، اردوسفرنامے انیسویں صدی میں، ص ۳۱

۱۲۰۔ محمود خالد، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۶۵

۱۲۱۔ سعید احمد، آزادی کے بعداردو سفرنامہ، ص ۳۰

۱۲۲۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامہ کی مختصر، اورینٹ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵

۱۲۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۸۱

۱۲۴۔ محمد خالد، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۷۱

۱۲۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۸۳

۱۲۶۔ محمد خالد، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۷۳

۱۲۷۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۱۶

۱۲۸۔ خالد، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۷۷

۱۲۹۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۱۶

۱۳۰۔ مولانا محمد حنیف ندوی، افکارِ ابن خلدون، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور: ۱۹۹۵ء۔ ص ۸۴

۱۳۱۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون، مقدمہ، مولانا راغب رحمانی (مترجم) کراچی، ۲۰۰۱ء۔ص ۱۱۱۔۱۱۲

۱۳۲۔ آفتاب اصغر، ڈاکٹر، مقدمہ تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۱

۱۳۳۔ آفتاب اصغر، ڈاکٹر، مقدمہ تاریخ مبارک شاہی۔ https//:ur.wikipedia.org/wiki
(مورخہ ۲ رنومبر ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۱:۰۰)

۱۳۴۔ مولانا محمد حنیف ندوی۔ افکار ابن خلدون، ص ۷۹ https//:ur.wikipedia.org/wiki
(مورخہ ۲ رنومبر ۲۰۲۰ء بوقت رات ۱۱:۰۰)

۱۳۵۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائباتِ فرنگ، تحسین فراقی (مرتب) مکہ بکس، لاہور، ۱۹۸۳ء۔ص ۴۷

۱۳۶۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۵۴

۱۳۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۲۰

۱۳۸۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۵۴

۱۳۹۔ یوسف خان کمبل پوش، سیرِ ملک اُودھ، مشمولہ، بنیاد، جلد ۶، شمارہ، ۲۰۱۵ء، مرتب، ڈاکٹر نجیبہ عارف،
لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۷

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۴۱۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۵۳

۱۴۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۴۳۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۴۰

۱۴۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۴۰

۱۴۵۔ مولانا شبلی نعمانی، سفرنامہ روم و مصر و شام قومی پریس، دہلی ۱۳۱۹ھ۔ص ۶

۱۴۶۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۶۸

۱۴۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۵۹

۱۴۸۔ منشی محمد آدم خان، سفر نامہ افغانستان حالاتِ سفر ہندوستان، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۰۹ء،
ص ۱۶

۱۴۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۹۴

۱۵۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۸۷۔۱۸۸

۱۵۱۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۶۳

۱۵۲۔ انورسدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفرنامہ،ص۲۰۷

۱۵۳۔ خالدمحمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ،ص۱۶۷

۱۵۴۔ ایضاً،ص۱۷۹۔۱۸۰

۱۵۵۔ ایضاً،ص۱۸۳

۱۵۶۔ مولاناسیدمیاں،اسیرانِ مالٹا،جمیۃ پبلی کیشنز،لاہور۱۹۹۹ء ص۱۵

۱۵۷۔ خالدمحمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ،ص۱۸۶

۱۵۸۔ تحسین فراقی،''جدیداردوسفرنامہ کااجمالی جائزہ''،سہ ماہی،الزبیر ص۴۲

۱۵۹۔ عقیلہ شاہین،ڈاکٹر،''ابن انشا کے سفرنامے''،مشمولہ،الزبیر،ص۲۲۹

۱۶۰۔ ایضاً،ص۲۲۹

۱۶۱۔ سعیداحمد، آزادی کے بعد اردو سفرنامہ،ص۲۲۶

۱۶۲۔ ایضاً،ص۲۲۷

۱۶۳۔ ایضاً،ص۲۲۷

۱۶۴۔ محمدسلیم میاں،مستنصرحسین تارڑ کے سفرنامے ایک جائزہ''،مشمولہ، الزبیر،ص۲۴۹

۱۶۵۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر،جدیداردوسفرنامہ نگاریا یک جائزہ''،مشمولہ، الزبیر،ص۳۶

۱۶۶۔ غفورشاہ قاسم،پاکستان میں سفرنامہ ایک اجمالی مطالعہ،مشمولہ، الزبیر،ص۴۹۔۵۰

۱۶۷۔ انورسدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفرنامہ،ص۳۷۰

۱۶۸۔ بریگیڈیئرگلزاراحمد،تذکرہ چین،ص۱۸۷

۱۶۹۔ انورسدید،ڈاکٹر،اردادب میں سفرنامہ،ص۳۰۲

۱۷۰۔ تحسین فراقی،''جدیداردوسفرنامہ کااجمالی جائزہ''،الزبیر ،سہ ماہی،ص۴۰

۱۷۱۔ انورسدید،ڈاکٹر،اردادب میں سفرنامہ،ص۳۹۴

۱۷۲۔ ایضاً،ص۴۱۳

۱۷۳۔ غفورشاہ قاسم،''پاکستان میں سفرنامہ''،مشمولہ، الزبیر،ص۴۷

باب: دوم

انیسویں صدی کے منتخب ایشیائی اردو سفرناموں میں سیاسی اور سماجی تاریخی عناصر

الف: اردو سفرنامہ اور نوآبادیات کا آغاز تاریخ کے تناظر میں: پس منظری مطالعہ

برطانوی ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ بہت سی ریاستوں اور فیڈریشن پر مشتمل ایک حکومت تھی۔ اس میں ریاست سوات، قلات، بہاولپور، بنگال، بہار، آڑسیہ، آسام، اودھ، مرہٹہ راج، میسور، نظام دکن وغیرہ شامل تھے۔ مشرقِ بعید کے ممالک ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آچکے تھے اور باقی ممالک پر بتدریج قبضہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایشیا میں صرف جاپان ہی ایسا ملک تھا جو آزاد اور خود مختار تھا۔ سیام (موجودہ تھائی لینڈ) کا نصف رقبہ خود مختار تھا۔ جب کہ نوآبادیاتی عہد میں جنوبی ایشیا کا غالب حصہ: ''برما، ہند چینی، ملایا، جاوا، سماٹرا، بورنیو اور فلپائن یورپی اقوام کے تسلط میں تھا۔ البتہ سیام کا کچھ علاقہ خود مختار تھا۔'' (۱) ایران پر برطانیا اور روس دونوں قابض تھے۔ اس کے علاوہ عراق، شام، فلسطین، مصر اور عرب بھی کچھ عرصہ بعد برطانوی حکومت کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔ چین نے جب آزادی حاصل کی تو برطانیہ، فرانس، امریکا، جاپان اور روس اس پر قابض تھے۔ یعنی چین ایک ہی وقت میں پانچ نوآبادیاتی ممالک کی جاگیر تھا۔ اس نے ایک ساتھ ان ممالک کی سفا کی کا مقابلہ کر کے آزادی حاصل کی۔ ایشیا میں صرف ترکی، افغانستان، جاپان اور روس ایسے ممالک تھے جو کسی کے زیرِ قبضے نہیں تھے۔ اور نہ ہی کسی ملک کی نوآبادی کا حصہ رہے۔ بلکہ افغانستان کے علاوہ مذکورہ ممالک کی اپنی نوآبادیاں تھیں۔ ترکی کا ایشیا اور افریقہ کے عرب ممالک پر قبضہ تھا۔ جاپان کا کوریا، فاموسا (تائیوان) برما، ملائیشیا اور انڈونیشیا پر قبضہ تھا۔ روس کا وسط ایشیائی ریاستوں کے علاوہ ایران اور چین (منچوریا) پر قبضہ تھا۔

برصغیر میں انگریز کی حکومت کسی حد تک انیسویں صدی کے نصف تک مستحکم ہو چکی تھی۔ سلطان حیدر علی کے

بعد سلطان ٹیپو سے تخت چھینا جاچکا تھا۔نواب سراج الدولہ سے بھی دغا بازی کے ذریعے تخت چھینا جاچکا تھا۔مگر ہندوستان کے راجا،مہاراجا اور مرہٹے پہلے ہی انگریزوں کے آلہ کار بن چکے تھے۔دیگر ہندوستانی حکمرانوں کو شکست دینے یا پھر اپنا تابع فرمان بنا لینے کے بعد پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔اسی دور میں انگریزوں کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کے لیے فورٹ ولیم،ایک قلعہ جو ۱۶۹۰ء میں کالی کٹ یعنی کلکتہ کے مقام پر ولیم نامی ایک انگریز نے تعمیر کرایا تھا،اس میں کالج قائم کیا گیا۔اگر چہ اس کالج کے توسط سے اردو سفرنامے نے فروغ حاصل نہیں کیا۔تاہم اس کالج کے زیرِ نگرانی جہاں قواعد وانشاء،شاعری کی کتابیں لکھی گئی وہاں پر ایسی داستانیں لکھی گئی جن کی بنیاد زیادہ تر اسفار پر ہی تھی۔اس دوران ہندوستان میں بہت سے واقعات رونما ہوئے جن کا ذکر سفرنامے میں نہیں ہے اگر چہ تاریخ میں تفصیل سے موجود ہے۔لیکن یہاں ایسے واقعات کا ذکر کرنا مصود ہے جن کی تفصیل سفرنامے میں ملتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو ۱۶۰۸ء تا ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت رہی ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں جہاں سفارتی،سیاسی اور عسکری مسائل کا شکار رہی۔اسی طرح کمپنی کو خود برطانیا کے اندر بھی سیاسی تبدیلیوں کی بنا پر کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔برطانیا کے تاجروں نے تجارتی کمپنی قائم کی جس کا مقصد ملک کے اندر اور باہر،ہر دو سطحوں پر تجارتی اجارہ داری قائم کرنا تھا۔شروع میں برطانیا کے تاجروں کے ذریعے:''۱۶۰۰ء میں لندن ایسٹ انڈیا کمپنی......سٹی مرچنٹس کمپنی کی بنیاد رکھی گئی۔''(۲) یورپی تاجر اب تک سمندر کے ذریعے تجارت کرنے کی تمام تر سہولتیں حاصل کر چکے تھے۔دور دراز کے ممالک کی جانب طویل سفر اختیار کر کے نہ صرف سمندروں کو تسخیر کر رہے تھے بلکہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر قبضہ بھی کر رہے تھے۔ان تاجروں کو برطانوی حکومت کی طرف سے زیادہ تر حمایت حاصل ہوتی تھی۔کیوں کہ حکومتِ برطانیا کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو رہا تھا۔ان تاجروں نے ملکہ الزبتھ کی خدمت میں درخواست کی کہ:''تجارتی کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دی جائے،ملکہ کے ایک فرمان کی رو سے اس کمپنی کو پندرہ سال کے لیے ہندوستان سے تجارت کرنے کا اجارہ مل گیا۔''(۳) ملک وقوم کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے پہل:''۳۰ ردسمبر ۱۶۰۰ء ملکہ ایلزبتھ کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرق کے ساتھ ریشم،سوت اور قیمتی پتھروں کی تجارت کا استحقاق دے دیا گیا۔''(۴) اس طرح کمپنی کے تاجروں کو ملکہ الزبتھ کا اجازت نامہ ملنے کے بعد:''۱۶۰۱ء میں انگریزوں کا پہلا تجارتی جہاز ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔''(۵)

برطانیا کے تاجروں کو ہندوستان میں تجارتی اجازت نامہ حاصل کرنے کی اس لیے ضرورت پیش آئی ہے کہ پرتگیز، ولندیزی اور برطانوی تاجر بحرِ ہند،بحرہ فارس (خلیج فارس) اور بحرِ عرب میں جس کو جہاں موقع ملتا ایک دوسرے کا تجارتی مال بمعہ جہازوں کے لوٹ لیتے تھے۔وجہ یہ تھی کہ ہندوستان اور مشرقی ایشیا سے مال خریدنے کے بعد وہ کسی جگہ مال کو گودام نہیں کر سکتے تھے۔اس لیے برطانوی تاجروں نے ہندوستان میں کوٹھیوں،منڈیوں اور فیکٹریوں کے قیام کے لیے تجارتی

اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس کی وضاحت باری علیگ نے یوں کی ہے کہ: ''ملکہ الزبتھ کے عہد میں انگریز تاجروں نے ہندوستان سے تجارت تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی اس زمانہ کے لیے باہمی لڑائی ایک یقینی بات تھی۔ تاجروں کے تجارتی قافلے ایک دوسرے کو لوٹ لینا تجارت خیال کرتے تھے۔'' (۶)

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی تگ و دو سولہویں صدی کے اختتام سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں تجارت کرنے کے لیے برطانوی تاجروں نے پہلے ملکہ سے اجازت نامہ لیا۔ یہ ۱۶۰۰ء کی بات ہے۔ یہ اجازت نامہ پندرہ سال کے لیے تھا۔ پھر ہندوستان آ کر مقامی ناظمِ ریاست یا صوبے دار سے جازت لے کر تجارتی کوٹھی قائم کی گئی۔ یہ ولیم ہاکنس کی سورت، ہندوستان آمد ۱۶۰۸ء کا واقعہ ہے۔ پھر سر طامس رو نومبر ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا۔ قریباً مارچ ۱۶۱۷ء میں جہانگیر کے دربار سے انھیں باقاعدہ یہ اجازت نامہ مل گیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم ہونے تک اسے کئی ایک مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ:

> ۱۶۰۰ء میں لندن میں کوئی سو تاجروں نے منصوبہ کیا کہ ہند کے ساتھ تجارت جاری کی جائے۔ اس لیے انھوں نے ایک کمپنی بنائی جس کا نام انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ کمپنی نے الزبتھ ملکہ انگلستان سے اجازت حاصل کی کہ ہندوستان کو جہاز روانہ کرے۔ اکبر اس وقت ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ ۱۶۱۱ء میں کمپنی نے سورت میں جو سلطنت مغلیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ ایک تجارتی کوٹھی بنائی۔ (۷)

دراصل انگریز تاجروں نے مشرقی ایشیا میں مل جل کر تجارت کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے انھوں نے ملکہ الزبتھ سے اجارت نامہ کا اجرا کروایا۔ ملکہ الزبتھ کے اس اجازت نامہ کی رو سے انگریز تاجروں نے ۳۱ر دسمبر ۱۶۰۰ء سے ہندوستان میں تجارت کرنے کی مکمل اجازت مل چکی تھی۔ اس اجازت نامہ کی رو سے ایک انگریز تاجر ولیم ہاکنس، برطانیا کے بحری جہاز ''ہیکٹر'' کا کپتان اگست ۱۶۰۸ء میں: ''جہانگیر کے آغازِ حکومت (یعنی ۱۶۰۸ء = ۱۰۱۷ھ) میں پہلے کپتان ہاکنس شاہ انگلستان کا ایک خط اور قیمتی تحائف لایا تھا۔'' (۸) اس سفارتی خط وخطابت کا مقصد ہندوستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنا تھا۔ اس طرح ولیم ہاکنس کی کوششوں سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کی راہ ہموار ہو گئی۔ اس کی وضاحت ذکاء اللہ نے اس طرح کی ہے کہ: ''ایک اور انگریز کپتان ہاکنس جہانگیر کے دربار میں تھا۔ وہ ترکی زبان جانتا تھا جہانگیر سے جو اپنی آبائی زبان ترکی بولنی جانتا تھا بے تکلف باتیں اس زبان میں ہوتی تھیں۔ وہ ۱۶۰۸ء میں سورت میں ہیکٹر جہاز میں آیا جیمس اوّل شاہ انگلستان کا خط جہانگیر کے نام لایا تھا۔'' (۹)

اوکسفورڈ کی تاریخ کے مطابق ایک جہاز سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، یہ کسی بھی کپتان کا ہندوستان میں تیسرا سمندری سفر تھا۔ یعنی برطانیا سے مختلف جہاز ہندوستان آتے رہے جو مختلف کمپنیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جس نے بھی ہندوستان کی تجارت کے بارے میں سنا سمندری سفر پر روانہ ہوا اور ہندوستان پہنچ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ طامس رو تین سال

ہندوستان میں قیام پذیر رہا تھا۔ مگر اس کی ملاقات کپتان ہاکنس سے نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان کی مختلف تاریخوں میں کپتان ہاکنس کا نام اور ذکر ملتا ہے۔ لیکن اوکسفورڈ کی تاریخ میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ''تیسرا جہاز سمندری سفر سے ۱۶۰۸ء میں سورت تجارت کے لیے پہنچا۔'' اُوکسفورڈ کا بیان ہے کہ:

> A ship of the Third Separate Vovoge in 1608 reached Surat and did some trade, but portuguese opposition was strong; and it was not until 1612 that the English obtained by treaty with the Mughul governer of Gujarat the right to trade at Surart, Combay, and two other place.(۱۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز ہندوستان میں نئے اور اجنبی تھے، انھیں نہ صرف ہندوستان والوں کی مخالفت کا سامنا تھا بلکہ پرتگیز بھی جگہ جگہ ان کی مخالفت کرتے تھے۔ جہاں تک ولیم ہاکنس کو جہانگیر کے دربار سے تجارت کرنے کے لیے اجازت نامہ مل جانے کی بات ہے تو اس اجازت نامے کی رو سے کسی قسم روک ٹوک کرنے اور محصول لینے سے منع کیا گیا ،مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ: ''جہانگیر ہاکنس کی بڑی خاطر کرتا تھا اُس کی ہر ایک درخواست کو منظور کر لیا۔ سورت میں انگریزوں کو تجارت کی کوٹھی بنانے کی اجازت دیدی اور اُن سے وعدہ کیا کہ کوئی اُن پر زور و ظلم نہیں کرے گا، اور محصول نہیں لے گا۔''(۱۱)

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کپتان ولیم ہاکنس کی پہلی سفارت ابتدائی مراحل میں ناکام ہوگئی تھی۔ اس کے بارے میں سید ہاشمی فرید آبادی کی ایک رائے ہے کہ: ''کئی دفعہ پرتگیزوں پھر ولندیزوں سے آویزشیں ہوئی۔ جب موقعہ ملا بحری قزاقی کرتے پھرتے۔ البتہ پُرتگال کے زوال اور ولندیزوں کے ملایا، جاوا میں مصروف ہونے کے بعد تجارت کرنے کی صورت نکلی، کپتان ہاکنس شاہ انگلستان (جیمس اوّل کا) کا خط اور بہت سے تحائف لے جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔''(۱۲)

کپتان ہاکنس کوئی کامیاب سفیر نہ تھا۔ اگر چہ اُس نے کلکتہ کے ساحل پر اُترتے کمپنی قائم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ جو سراسر غیر مناسب تھا۔ کیوں کی دوسرے ملک میں اُس ملک کی ناظم سے اجازت کے بغیر کسی قسم کی اجارہ داری قائم کرنا آسان نہیں تھا۔ برطانیا کی طرف سے ایک اور سفیر ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ اس کی سفارت کسی حد تک کامیاب رہی۔ اس کی سفارت بارے سید ہاشمی کہتے ہیں کہ: ''طامس رو، پہلا باقاعدہ سفیر ہے جسے جیمز اوّل نے ۱۶۱۵ء=(۱۰۲۴ھ) میں روانہ کیا اور وہ بندر سورت سے اجمیر گیا۔ جہاں شاہی لشکر مقیم تھا۔ اس کے ہمراہ ایک پادری ٹیری تھا جس نے وطن واپس جانے کے تیس برس بعد اپنا سفرنامہ یا ''بیان'' شائع کیا تھا۔''(۱۳) سر طامس رو ہندوستان سفیر بن کر تجارتی اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔ اُسے آسانی سے اجازت نامہ نہیں ملا۔ اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے اُسے ہندوستان

میں طویل عرصہ قیام کرنا پڑا۔ اسے اس مرتبہ: "۱۶۱۵ء میں انگلینڈ کے بادشاہ جیمس اوّل نے جہانگیر کے پاس سفیر بھیجا جس کا نام سر ٹامس رو تھا مقصد یہ تھا کہ انگریز تاجروں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل جائے۔ اس زمانے میں بندر سورت میں انگریزی سوداگروں کی ایک کوٹھی تھی۔ سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں تین سال رہا۔" (۱۴) برطانوی سفیر کے ہندوستان میں طویل قیام کے متعلق باری علیگ کا بیان ہے کہ:

> جیمز نے جہانگیر کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا تا کہ دونوں ملکوں میں کوئی تجارتی معاہدہ ہو جائے۔ انگریزی سفیر سر طامس رو تین سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس مدت میں شاہی فرمان کی رو سے انگریزوں کی تجارتی کمپنی کو سورت میں فیکٹری اور اس کے اردگرد فصیل بنانے کی اجازت مل گئی۔ ایک دوسرے فرمان کی رو سے جہانگیر نے انگریزوں کو اپنی سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ (۱۵)

جیمز اوّل نے درحقیقت اپنی ذاتی خواہش پر سفارتی تعلقات کے فروغ کے لیے طامس رو کو ہندوستان کا سفیر بنا کر روانہ کیا تھا۔ جیمز اوّل نے سر طامس رو کو سفیر کے طور پر جہانگیر کے دربار میں بھیجا، انڈیا میں تین سالہ قیام کے دوران طامس رو اپنے ملک کے لوگوں کے لیے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وقتاً فوقتاً دوسرے سفیر کارخانے، تجارتی مراکز اور کوٹھیاں قائم کرتے رہے۔ اُوکسفورڈ کی تاریخ میں ذکر ہے کہ:

> In 1615 James sent Sir Thomas Roe as his ambassaddor to the emperor Jahangir.During his stay of about thrice years in India, Sir Thomas, although he could privileges for his countrymen. From time to time British adventurers established many factories or trading stations at various points along the western coast, including one at anjengo in thavancore. But thier activity was not confined to that coast,the more easily accessible.(۱٦)

برطانیا کے سفیروں کے لیے بندرگاہوں پر قدم جمانا اور بندرگاہوں تک رسائی کو آسان بنانا بہت مشکل کام تھا۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیروں نے جہاں تک ممکن ہو سکا اس مرحلے کو آسان بنایا۔ دوسری طرف برطانوی سفیر کی ہندوستان آمد کے بارے میں کارل مارکس کا بیان اس طرح ہے کہ: "۱۶۱۵ء میں، سر تھامس رو پہلا انگریز تھا جو دہلی کے دربار میں انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل کی سفارش لے کر آیا۔ یہ سفارش نوازئیدہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے سے تھی۔" (۱۷)

ابتدا میں طامس رو کی ملاقات بادشاہ سے نہیں بلکہ درباریوں سے ہوتی رہی ہے۔ پھر کہیں جہانگیر کے قریبی رشتہ داروں سے جنھیں قیمتی تحائف دے کر وہ بادشاہ تک پہنچ سکا۔ بڑے انتظار کے بعد بادشاہ سے ملاقات ممکن ہوئی اور تجارتی

اجازت نامہ نہ ملنے کی وجہ سے طامس روتین سال تک ہندوستان میں قیام پذیر رہا تھا۔ طامس رو کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اُس نے: ''ہند میں تجارت کی اجازت چاہی تو بادشاہ نے جواب دیا کہ ملکہ سے کہو۔ وہی ملک کی فرمانروا ہے۔ اس سبب سے لازماً آیا کہ نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کو ایک بیش قیمت جڑاؤ زیور نذر کیا جائے۔ نذر کرانے پر طامس رو کو مدعا حاصل ہو گیا۔ یعنی ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔'' (۱۸) طامس رو نے جہانگیر کے دربار میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے آصف جاہ کو رشوت کے طور پر جو تحفہ دیا اس کے ذکر میں ذکاء اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ: ''اسی زمانے میں آصف خان کو طامس رو نے بڑا موتی رشوت میں دیا جس نے سحر کا سا اثر پیدا کیا کہ آصف خاں انگریزوں کا دوست ہو گیا۔'' (۱۹) اس سے پہلے خسرو اور آصف خان سر طامس رو کے مخالف تھے۔ اس کے علاوہ دربار کے کئی ایک وزرا اور امرا بھی سفیر طامس رو کی مخالفت کرتے رہے۔

جہانگیر کے ساتھ طامس کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہونے کی صورتِ حال کو سید ہاشمی نے بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''البتہ انگریزوں کے اپنے ملکی مصنوعات اور تحائف پیش کرنے کا ذکر آتا ہے۔ ان حالات میں یہ یقین کرنا بہت دشوار ہے کہ بادشاہ طامس رو کو خلوت کے جلسوں میں بلاتا اور حریف مے کشی بناتا تھا، جن کی انگریز سفیر نے بہت مزے لے کر کیفیت لکھی ہے۔ روزنامچے میں بہت سی باتیں سریحاً غلط اور منصوعی ہیں۔'' (۲۰) حقیقت میں طامس رو نے زیادہ تر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ جس ملک اور معاشرے کے بارے میں وہ جانتا نہیں اُس کے بارے میں کیسے رائے قائم کر سکتا تھا۔ ہندوستان کے بارے میں اُس کا علم سطحی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہانگیر کے دربار کے روزنامچوں، تزکِ جہانگیری یا ہندوستان کی کسی تاریخ میں سر طامس رو کی وقعت معمولی تھی۔ اس امر کی وضاحت ذکاء اللہ دہلوی کرتے ہیں کہ:

> ''انگریزوں اور خاص کر سر طامس رو نے جو اپنے اعزاز و احترام میں باتیں لکھی ہیں کہ لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ کسی اور سفیر کا آپ کے برابر احترام بادشاہ نے نہیں کیا۔ ان میں سے کسی ایک بات کا پتا بھی مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں لگتا۔ سر طامس رو کی سفارت کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں۔ جہانگیر کو تو بعض انگریزی مورخ بھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ اُس نے اپنی مستانہ نوشی اور کاہلی کے سبب سے اس انگریزی سفارت عظیم کا حال نہیں لکھا۔ مگر اور مورخوں کو کیا ہوا تھا جو انھوں نے اس کا نام تک نہیں لیا، اس سے مسلمانوں کا مغرور ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں انگلستان کی سفارت ہی نہیں سمجھی گئی کہ کوئی مورخ یا بادشاہ جو اپنی سلطنت کے جز و کل حالات اور ایران و توران وغیرہ کی سفارت کو مفصل بیان کرتا ہے، اُس کو لکھتا سفیر بادشاہ کے لیے بیش قیمت تحائف نہیں لایا تھا سوا اس کے وہ تجارت کے باب میں عہد نامہ چاہتا تھا۔'' (۲۱)

مذکورہ باتوں کی وجہ سے طامس رو کی سفارت کو اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اگر جہانگیر کو یہ معلوم ہوتا کہ مستقبل قریب میں انگریز قوم پورے ہندوستان پر قابض ہو جائے گی تو وہ اس سفارت کو سرے سے ہی اہمیت نہ دیتا اور

اپنی تزک میں اس کا ذکر ضرور کرتا۔

برطانوی سفیر تھامس رو نے جہانگیر کے ہندوستان میں بد انتظامی کی کیفیت بیان کی ہے۔ ایسا ممکن بھی ہے لیکن اگر تزک جہانگیری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر انتظامی امور درست کرنے کے لیے آگرے سے لے کر کابل تک سفر کرتا ہے۔ ہر جگہ انتظامی کاروائی کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ بغاوت کا تدارک کرتا ہے۔ طامس رو نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جہانگیر کے ساتھ کھانے میں شامل رہتا تھا اور بادشاہ کے لیے شراب کے پیالے تیار کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ممکن ہو۔ کیوں کہ شراب نوشی کی زیادتی کی وجہ سے اکبر نے ایک مرتبہ دس دن کے لیے جہانگیر کو حرم میں نظر بند کر دیا تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں خوبیاں اور خامیاں سب بیان کر دیں ہیں۔ اتنے بڑے ملک میں جس کی کئی ریاستیں اور کئی صوبے تھے، کہیں نہ کہیں بد نظمی ہونے کا امکان تو بنتا ہے۔ تاہم ای مارسڈن بیان کرتا ہے کہ:

> اس نے جو حالات ہند میں دیکھے یا سنے تھے۔ سب قلم بند کیے۔ سر طامس رو کا بیان ہے کہ انتظامِ سلطنت ایسا اچھا نہ تھا جیسا کہ اکبر کے عہد میں تھا۔ جب تک حفاظت کا کافی سامان ساتھ نہ ہو۔ سفر میں جوکھوں اور خطرہ رہتا تھا۔ سر طامس رو حضور میں مجرا بجالانے کے لیے اکثر دربار میں جایا کرتا تھا۔...... کبھی کبھی بادشاہ سر طامس رو کو کھانے میں شامل کر لیتا تھا اور اتنی شراب پیتا تھا کہ نشے میں مدہوش ہو جاتا تھا۔ (۲۲)

یہاں دلائل دینے کا یہ مقصد نہیں کہ جہانگیر شراب پیتا تھا کہ نہیں، جہانگیر شراب نوشی کرتا تھا مگر شراب کی اُس نے مقدار مقرر کر رکھی تھی جہانگیر نے جوانی اور پچھلی عمر میں شراب پینا کم کر دی تھی۔ طامس رو جہانگیر کی تخت نشینی کے پہلے عشرے میں ہندوستان آیا تھا۔ جہانگیر اُس وقت جوان تھا۔ اس طرح وہ شراب معمول کے مطابق پیتا تھا۔ جہانگیر نے پہلی مرتبہ کابل کے سفر کے دوران، اٹک کے مقام پر شراب تھکاوٹ دور کرنے کے لیے پی۔ وہ بھی مشیروں کے مشورے اور اصرار پر، اس سے پہلے جہانگیر شراب نہیں پیتا تھا۔ جیسا کہ اُس نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ:

> اس کے بعد میں نے رفتہ رفتہ شراب پینا شروع کر دیا۔ اور اتنی کثرت ہوگئی کہ انگوری شراب سے مجھے نشہ ہونا بند ہو گیا تو میں نے زیادہ تیز شراب پینا شروع کر دیا۔ اور اس سے بھی کثرت سے پینے لگا۔ ان دنوں میری غذا مرغ، نان اور مولی تھی۔ کسی شخص کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ مجھے شراب سے منع کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرتِ شراب نوشی سے میرے جسم میں رعشہ آنے لگا۔ اور پیالہ پکڑنا محال ہو گیا۔ (۲۳)

جہانگیر نے شراب نوشی ضرور شروع کی مگر جس طرح سر طامس رو نے اپنے سفری یادداشتوں میں دروغ گوئی کی ہے۔ اس طرح جہانگیر نے جھوٹ نہیں بولا۔ ویسے بھی جہانگیر بادشاہ تھا اور طامس رو ادنیٰ سفیر، جس کی سفارت کی ہندوستان میں خاص اہمیت نہیں تھی۔ اسے دربار میں کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا جس کی وجہ سے وہ دربار کے بیانات کو بڑھا

چڑھا کر لکھتا اور انگلستان روانہ کرتا تھا۔اس طرح جہانگیر کی شراب نوشی میں جو مبالغہ آرائی طامس رو نے کی ہے اس کا ایک منظر قارئین کے پیش نظر ہے کہ:

> جہانگیر نے خود اُن کو کھولا جو چیز اُس کو پسند آئی وہ لے لی۔ بہت سی چیزیں اُس نے ایسی لے لیں کہ وہ اس کے لیے نہیں آئی تھیں۔ رو غسل خانہ میں جہانگیر سے فریاد کرنے گیا۔ جہانگیر نے کہا کہ سب کچھ تمھارے لیے بھلا کیا جائے گا، میں شاہ انگلینڈ کے ساتھ بھی درست کام کروں گا، میں نے کوئی بات اُس کی درست نہ چاہئی۔ جہانگیر نے بہت شراب پی لی وہ کہنے لگا کہ میں عیسائیوں، مسلمانوں اور یہویوں کا محافظ ہوں پھر وہ رونے لگا۔اور بہت جذبوں میں آ گیا۔غسل خانے میں آدھی رات تک جلسہ رہا۔اُس پر یہ حاشیہ چڑھایا گیا کہ وہ ولیعد کی مداخلت سے ناراض ہوا اور اُس کو میرے پاس معذرت کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ نیک بادشاہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی شریعت کے باب میں مباحثہ کرنے لگا۔ اور شراب کے نشہ میں ایسا مہربان ہوا کہ اُس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں بادشاہ ہوں یہود انصاریٰ و مسلمان، اپنے تئیں مبارک باد دیں میں کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں اُن کی حفاظت کرتا ہوں اس نے مسٹر ٹری سے کہا کہ پادری صاحب خوش آمدید یہ گھر تمھارا ہے تم اُس کی قدر کرو، ۱۱ر مارچ ۱۶۱۷ء۔(۲۴)

سر طامس رو کے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بادشاہ حد سے زیادہ شراب پیتا تھا وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔اُس کی کوئی بات اعتبار کے قابل نہیں ہوتی تھی۔اوّل تو خود جہانگیر نے کہا کہ شراب زیادہ پینے لگا تو شراب نے اسے نشہ دینا چھوڑ دیا۔ پھر طامس رو کا ایک موٹا سا بیان ہے کہ جہانگیر یہویوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا بادشاہ اور محافظ ہے۔ظاہری بات ہے کہ بادشاہ تمام رعایا کا بادشاہ اور محافظ ہوتا ہے۔طامس رو یہ بھول گیا کہ ہندوستان میں عیسائی اور مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی آباد تھے۔اور سکھ مذہب اسی عرصے میں کہیں پروان چڑھا تھا۔طامس رو کی کئی ایک جزئیات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

جہاں تک جہانگیر کی شراب نوشی کا ذکر ہے تو خود جہانگیر نے اپنا کوئی پردہ نہیں رکھا، وہ تزک میں لکھتا ہے کہ:

> چناں چہ اُسی دن میں نے شراب کی مقدار کم کر لی اور فلونیا کی مقدار زیادہ کر دی۔ میں نے حکم دیا کہ شراب انگور میں شراب دو آتشہ ملا کر پیش کیا جایا کرے۔جس میں دو حصے آتشہ اور ایک حصہ شراب انگوری کی مناسبت کر دی گئی۔اور پینے کی مقدار بیس پیالے روزانہ سے گھٹا کر چھ پیالوں تک کر دی۔ ہر پیالے میں وزن کے لحاظ سے ایک پیالہ اور چار تولہ شراب ہوتی ہے۔میں آج کل اتنی ہی مقدار میں شراب پیتا ہوں وہ بھی رات کے وقت۔(۲۵)

جس طرح سر طامس رو ایک راشی نوعیت کا سفیر تھا۔اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے طرح طرح کے حیلے بہانے کیے۔درباریوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے رشوتیں دی۔اپنے سفرنامے میں غلط معلومات لکھیں۔

اگر طامس برطانیا کا اتنا اہم سفیر تھا تو جہانگیر نے اُسے اہمیت کیوں نہ دی۔ اور تزکِ جہانگیری میں ذکر کیوں نہیں کیا۔ جن دنوں طامس رو ہندوستان آیا تھا جہانگیر اجمیر میں تھا۔ وہ اجمیر میں: ''پانچ دن کم تین سال مقیم رہا۔'' (۲۶) اس دوران بہت سے واقعات پیش آئے۔ جہانگیر سے بہت سے درباریوں اور سفیروں کی ملاقاتیں ہوئیں جن کا جہانگیر نے اپنی تزک میں ذکر کیا ہے۔ اکبر کے دور سے ہی بادشاہوں، درباریوں اور حرم سراوالوں کی ہر ہر بات کو خبر کے طور پر تحریر کرنے کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ پھر جہانگیر خود بھی مصنف اور صاحبِ کتاب بادشاہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات کو وہ اپنی تزک میں تحریر کرتا تھا۔ طامس رو کس طرح فراموش ہو گیا جو بادشاہ کے ساتھ ضیافتیں اُڑاتا تھا۔ پوری تزکِ جہانگیری میں دو مقامات پر انگریزوں کا ذکر آیا ہے۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ:

> انہی ایام میں مجھے اطلاع ملی کہ فرنگیوں نے سورت کی بندگاہ پر مال متاع سے بھرے ہوئے چار جہازوں کو لوٹ لیا ہے۔ اس بات کو ناگوار محسوس کرتے ہوئے میں نے مقرب خان کو جس کے سپرد بندرگاہ ہے۔ ہاتھی اور خلعت عنایت کرتے ہوئے روانہ کیا تاکہ وہ ایسے افسوس ناک واقعات کی روک تھام کرے۔ یوسف خان اور بہادر الملک کی صوبہ دکن میں اچھی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے انھیں جھنڈے بھجوائے اور فرمان بھیجا کہ میں نے یہ سفر اس مقصد کے لیے اختیار کیا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کے روضۂ مبارک کی زیارت سے مشرف ہوں اور رانا کی مہم کی طرف از سرِنو توجہ دوں۔ (۲۷)

اجمیر کے قیام کے دوران ہی ایک اور وقعہ پیش آیا جس کا ذکر جہانگیر نے اپنی تزک میں یوں کیا ہے کہ

> تیسری خوشخبری ایک مرزا کی شکست کے متعلق تھی جس نے سورت کی بندرگاہ اور اس کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے پوری طاقت سے حملہ کیا مگر انگریزوں نے اکثر جہاز تباہ کر دیئے۔ آخر کار مرزا نے مقابلے کی تاب نہ لا کر گجرات اور سورت کے حاکم مقرب خان کے پاس صلح کا پیغام بھیج کر کہا کہ ہم سورت میں امن و دوستی کے ساتھ آئے تھے مگر انگریزوں نے ہمارے ساتھ جنگ کر کے ہمارے جہاز تباہ کر دیے۔ (۲۸)

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ انگریزوں نے مرزا کے حملے کا جواب اس وجہ سے دیا تھا کہ اگر بندر سورت پر مرزا قابض ہو جاتا تو انگریزوں کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہوتا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے تحفظ کے لیے مذکور مرزا کو شکست نہیں دی تھی اور نہ ہی جہانگیر کے خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے، بلکہ انگریزوں نے تو صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھا اور مرزا مذکور کو شکست دی۔ سورت بندرگاہ پر انگریز چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ نہ صرف جہانگیر کے زمانے میں بلکہ اورنگزیب کے زمانے میں بھی اس طرح کی صورتِ حال قائم رہی۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی بد اعمال میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ سورت میں کمپنی کی بد انتظامی کی وجہ سے اورنگزیب عالم کے ایک سپہ سالار نے روک تھام کی۔ اس کے بعد انگریزوں نے اورنگزیب عالم گیر سے معافی مانگ کر دوبارہ تجارت کی اجازت حاصل کی، لیکن اس صورت میں کمپنی کی

ساکھ خراب ہوگئی تھی۔ یوں کئی ایک کمپنیاں اور وجود میں آ گئی جن کو یک جا کر کے ''متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی'' نام رکھا گیا اسی مارسڈن کی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ:

> انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قدر منافع ہوا کہ انگریزوں نے اور کمپنیاں بنالیں۔ اور ہند کے ساتھ تجارت کرنا شروع کی۔ آخر کار سو سال کے بعد ۱۷۰۰ء میں یہ سب کمپنیاں ملا کر ایک کر دی گئیں۔ اس بڑی کمپنی کا نام متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی قرار پایا اور بادشاہ انگلینڈ نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا اختیار تمام و کمال بلاشراکت غیرے اس کمپنی کو دے دیا۔ (۲۹)

دراصل انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کا جو پورے ہندوستان میں چرچا تھا اس کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ اس وجہ سے کے اس کے مقابلے میں صرف ایک کمپنی وجود میں آئی تھی۔ یہ بیان درست نہیں ہے کہ بہت سے کمپنیاں وجود میں آ گئی تھی۔ حقیقت میں ہندوستان صرف کسی ایک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تجارتی رابطہ رکھ سکتا تھا۔ ہندوستانی شہنشاہ کا نظم ونسق ایسا تھا کہ زیادہ کمپنیوں کی دیکھ بھال کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں انگلش کمپنیوں کو ضم کر کے ایک ہی ''متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی'' بنائی گئی۔ باری علیگ کا بیان ہے کہ: ''ہندوستان انگریزوں کی دو کمپنیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں کمپنیوں کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس نقصان نے دونوں کو متحد کر دیا۔ اب ''متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے دوبارہ کاروبار شروع ہوا۔'' (۳۰)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم ہونے میں کئی ایک مراحل سے گزرنا پڑا۔ دراصل یورپ میں انگریزوں کی دشمنی پرتگیزوں کے ساتھ ہندستان میں بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ ایک طرف انگریز شہنشاہ کے دربار تک رسائی حاصل کرتے تھے تو دوسری طرف پُرتگیز، شہنشاہ کو انگریزوں کے بارے میں بدظن کر دیتے تھے۔ انگریز سفیر سر طامس رو کو شہنشاہ جہانگیر کے دربار تک کئی بار رسائی حاصل کرنا پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ: ''۱۶۱۵ء میں انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل کا سفیر طامس رو، جہانگیر کے دربار تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے شہنشاہ سے تجارت کے لیے مراعات حاصل کر لیں اور ہندوستانی ساحلوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیادیں رکھ دیں۔'' (۳۱) جہاں انگریزوں نے سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے: ''ہندوستان کے ساحلی شہروں مدراس اور سورت کے قریب فیکٹریاں قائم کر لیں۔'' (۳۲) اگرچہ ملکہ برطانیانے یہ اجازت ملک وقوم کی فلاح کے لیے دی تھی۔ انگریز تاجروں نے دنیا کے ممالک میں تجارتی منڈیاں اور فیکٹریاں قائم کر کے لوٹ گھسوٹ کر کے ان ممالک کا دیوالیہ نکال دیا اور اپنے ملک کو لوٹ مار کی دولت سے ترقی دی۔ ہندوستانی عوامی بدحالی کا شکاری ہوئی۔ کمپنی کی ناقص پالیسیوں اور کسانوں کے لیے غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے ہندوستان بدترین قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ جواہر لال نہرو کا کہنا ہے کہ: ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس قوت اور اختیار تو تھا لیکن اسے لوگوں کی ابتری کی پرواہ نہ تھی۔ وہ تو بس ایک ہی کام جانتے تھے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹی جا سکتی

ہے۔''(۳۳) جیسا کہ جواہر لال نہرو نے کہا ہے کہ ہندوستان والوں کی حالت بدتر ہونے کی بہت ساری وجوہات تھی۔ کمپنی ہندوستان والوں پر ظلم وستم کرتی تھی۔ ہندوستان میں کمپنی نے اجارہ داری حاصل کرنے کے لیے اس نے قانونی اختیارات حاصل کیے۔ کارل مارکس کا کہنا ہے کہ:

> ۱۶۲۴ء، کمپنی نے کسی پارلیمانی مداخلت کے بغیر درخواست کی اور جیمز اوّل سے ہندوستان میں اپنے ملازموں کو عسکری اور شہری قوانین کے تحت سزا دینے کے اختیارات حاصل کر لیے۔ اس طرح کمپنی کو شہریوں کی زندگیوں اور قسمت سے کھیلنے کے لامحدود اختیارات مل گئے (جیمز اوّل) شاہ برطانیا کی طرف سے کمپنی کو دیا جانے والا یہ پہلا عدالتی اختیار تھا۔ اس کے دائرے کار میں صرف یورپی اور برطانوی باشندے آتے تھے۔(۳۴)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تو دکن میں قدم جم چکے تھے لیکن سلطان حیدر علی کے بعد سلطان ٹیپو کا انگریزوں کو خطرہ لاحق تھا۔ اس طرح انگریزوں کو: ''ٹیپو سلطان کو ختم کرنے کے لیے ۹۲۔۱۷۹۰ء ۱۷۹۹ء میں تین جنگ جنگیں کرنا پڑیں۔ ٹیپو لڑتے ہوئے مارا گیا۔''(۳۵) سلطنت میسور کی طرح مرہٹوں کی گوالیار میں ایک مضبوط حکومت تھی مرہٹوں کی حکومت ختم کرنے کے لیے انگریزوں کو ان سے کئی جنگیں لڑنی پڑیں جس کے بعد مرہٹوں کی حکومت انگریزوں کو ملی، جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ: ''مرہٹوں کی قوت گوالیار کے مہاداجی سندھیا (۱۷۹۴ء) اور پیشوا کے وزیر فرنویس (۱۸۰۰ء) کی موت کے بعد پارہ پارہ ہوگئی۔ لیکن مرہٹے لوہے کے چنے ثابت ہو رہے تھے۔ اور برطانویوں کو متعدد شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر مرہٹے ۱۸۱۹ء میں زیر ہو گئے۔''(۳۶) مرہٹوں کو شکست دینے سے پہلے انگریزوں کو: ''۱۸۱۴ء سے ۱۸۱۶ء تک نیپال سے جنگ کرنا پڑی۔ انھیں پہاڑی علاقے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر وہ جیت گئے۔''(۳۷) میسور، نظام، گوالیار اور نیپال کی طرح پنجاب کو بھی انگریزوں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔ پنجاب میں سکھوں اور انگریزوں کے مابین: ''دو جنگیں ہوئیں۔ پہلی ۴۶۔۱۸۴۵ء میں اور دوسری ۴۹۔۱۸۴۸ء میں ہوئی دوسری جنگ میں انگریزوں کو چیلیانوالہ مقام پر بدترین شکست ہوئی بالآخر انگریز مکمل طور کامیاب ہو گئے اور پنجاب کو انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔''(۳۸) ہندوستان میں پنجاب کے بعد دوسری بڑی سلطنت اُوّدھ کی تھی۔ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریز سلطنتِ اُوّدھ کے داخلی معاملات میں حد سے زیادہ دخیل ہو گئے۔ بادشاہ اُوّدھ کوئی فیصلہ انگریزوں کی مرضی کے خلاف نہیں کرسکتا تھا۔ آخر کار اُوّدھ کا الحاق ایسٹ انڈیا کمپنی سے: ''۱۸۵۶ء میں کیا گیا۔''(۳۹)

جنگ آزادی کے بعد کمپنی کی طرف سے ہندوستانی عوام پر سختی برتنے کے لیے راہیں ہموار ہو رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں کی آئے روز حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ یوں تو ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص پالیسیوں اور بے پناہ ظلم وستم کے بڑھ جانے کی بنا پر ہندوستان کے

مسلمانوں نے انگریز تاجروں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی لڑی۔ اس جنگ میں اگرچہ مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اس طرح ہے کہ ۱۸۵۸ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں نیا انتظامی ڈھانچہ متعارف کرایا۔

> ۱۸۵۸ء میں عظیم بغاوت کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے براہ راست فرائض سنبھال لیے۔ اب بادشاہ یا ملکہ قیصرِ ہند تھے۔ ہندوستان میں پہلے گورنر جنرل ہوا کرتے تھے جو وائسرائے بن گئے۔ وائسرائے کے نیچے حکام کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کو تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے موجودہ صوبے تشکیل پائے۔ مقامی حکمرانوں کے تحت ریاستیں نیم خودمختار قرار پائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام ریاستیں انگریزوں کے دستِ نگر رہیں۔ (۴۰)

اس طرح ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں باقاعدہ برطانیا کی حکومت رہی۔ ایست انڈیا کمپنی کے پیچھے بھی حکومتِ برطانیا کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ کیوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاطر خواہ فائدہ حکومتِ برطانیا کو پہنچتا تھا۔ اس نو آبادتی عہد میں جہاں اردو زبان وادب کو فروغ ملتا رہا وہاں پر اردو سفرنامہ بھی پروان چڑھتا رہا۔ نو آبادیاتی عہد میں اگر صرف ہندوستانی سفرنامے پر نگاہ ڈالی جائے تو ہندوستان سے بیرونِ ملک سب سے پہلا سفرنامہ منشی اسماعیل کا تاریخ جدید ہے۔ یہ سفرنامہ فارسی میں لکھا گیا تھا۔ اسے ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ نے دریافت کیا اور ڈاکٹر جواد ہمدانی نے اس سفرنامے کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا۔ منشی اسماعیل نے ۱۷۷۱ء میں ہندوستان سے برطانیا کا سفر اختیار کیا۔ ۱۷۷۳ء میں سفر سے لوٹ کر آئے۔ سفرنامہ 'تاریخ جدید' ہندوستان کے پہلے سفرنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سفر منشی صاحب نے کن مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سر انجام دیا، اس بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں کہ: ''منشی اسماعیل نے ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۳ء کے دوران بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک اعلیٰ اہل کار مسٹر کلاڈ رسل (پ ۱۷۳۲ء) کے منشی کے طور پر، ان کی معیت میں کلکتہ سے انگلستان کا سفر کیا۔'' (۴۱) منشی اسماعیل نے سفرنامہ لکھنے کے بعد مسٹر کلاڈ رسل کی خدمت میں پیش کیا۔ کلاڈ رسل نے ایک طویل عرصے تک اس نسخے کو باحفاظت اپنے پاس رکھا۔ جس کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف کی رائے یہ ہے کہ:

> یہ نسخہ ۱۸۵۶ء میں کسی طور سر ٹامس فلپس (Sir Thomas Phillipps) کے ذخیرہ کتب (نمبر ۱۸۲۲۵) میں شامل ہو گیا اور محققین کی نظروں سے اوجھل رہا۔ ۱۹۶۸ء میں جب سائمن ڈگبی نے سر ٹامس فلپس کے ذخیرے کا کچھ حصہ خریدا تو یہ نادر خطی نسخہ بھی ان کے ہاتھ آیا اور انھوں نے پہلی بار اہل علم کو اس سفرنامے سے متعارف کرایا۔ (۴۲)

ایشیائی اردو سفرنامے کا آغاز ۱۸۳۸ء میں ''تاریخ یوسفی، عجائبات فرنگ'' کی صورت میں ہوا۔ یوسف خاں کمبل پوش کا ایک اور سفرنامہ سیر ملک اُدّدھ ہے جو انھوں نے براہِ راست اردو زبان میں لکھا ہے۔ ویسے بھی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان سے باہر انگلستان کا سفر اختیار کیا اور سفر کے حالات کو سفرنامہ کی صورت میں مرتب کیے۔ سفرنامے

میں جہاں انھوں نے انگلستان کی سماجی، سیاسی اور تاریخی احوال لکھے وہاں پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی پس ماندہ حالات کا ذکر بھی کیا ہے۔''تاریخِ یوسفی، عجائباتِ فرنگ'' کا اچھا خاصا حصہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات پر مشتمل ہے۔ مذکورہ سفرنامے میں قائم ہونے والی انگریزوں کی اجارہ داری کے بارے میں بھی یوسف کمبل پوش نے بیان کیا ہے کہ: ''انگریزوں کی شکایت سے نظام الملک نے حفاظتِ راہ کے لیے جابجا سوار مقرر کیے ہیں۔.....انگریزوں کی عقل کو سراہا چاہیے کہ انھوں نے اپنی عملداری اور غیروں کے ملک سے رہزن اور ڈکیٹ نکلوا دیے۔''(۴۳) ایک اور جگہ یوسف کمبل پوش ہندوستانیوں سے حکومتی انتظامات میں انگریز کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''اگر اس قلعہ میں مثل انگریزوں کے بندوبست کرتا، کسی کو یارا مقابلہ اُس سے نہ ہوتا۔ اب اُس قبضہ نظام الملک کا ہے۔ ویران اور خراب پڑا ہے۔ حفاظت کے لیے برائے نام سوسپاہی نجیب دروازہ پر بیٹھے ہیں۔''(۴۴)

ایشیائی سفرنامے میں ہندوستان سے فارسی کا پہلا سفرنامہ ''تاریخ جدید'' ہے۔ تو تاریخِ یوسفی اردو کا پہلا سفرنامہ ہے۔ جنوبی ایشیا سے ایک پادری ٹیری کا انگریزی زبان میں پہلا سفرنامہ ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیر سر طامس رو کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ اُس نے برطانیہ واپس جا کر ہندوستانی سفر کے حالات تحریر کیے۔ منوچی نکولائی وینس کا ایک سیاح تھا جو اورنگزیب کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ کسی طرح اورنگزیب کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اُس نے ''مغلوں کا ہندوستان'' کے نام سے اپنا سفرنامہ فارسی میں لکھا۔ لیکن راقم کی رائے یہ ہے کہ مونچی نکولائی کا سفرنامہ چند مافوق الفطرت عناصر، اور داستانی اسلوب کی وجہ سے سفرنامے کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اُسے ایک تاریخی یادداشت تو کہا جا سکتا ہے لیکن سفرنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سفرنامے کی بنیادی خوبی حقیقت نگاری ہے۔

ایشیا کے ابتدائی اردو سفرنامے میں نواب کریم خاں کا **سیاحت نامہ** بھی ایک باقاعدہ سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کیا ہے۔ نواب کریم خان جھجھر کے نواب حسن علی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے والد نے اپنی ریاست کے دوبارہ حصول کے لیے انگریزی عدالت کلکتہ میں مقدمہ دائر کرانے کے لیے بھی کلکتہ اور وہاں سے برطانیا بھیجا تھا۔ نواب کریم کے برطانیا سفر کرنے کے لیے بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے مشورہ دیا تھا۔ اس مقدمے کی پیروی کے لیے انھوں نے پہلے موضع جوگی سے کلکتہ اور پھر کلکتہ سے لندن تک کا سفر کیا۔ ان کی بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں روایتی پیشی ہوئی۔ اس کے بعد وہ برطانیا کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے برطانیا کے سفر کا آغاز ۱۸۴۰ء میں کلکتہ سے کیا۔ وہ کب برطانیہ روانہ ہوئے، کب واپس آئے، ''سفرنامے کے مقدمے'' میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کی تفصیل یوں لکھی ہے:

> آخری تاجدار ہندوستان ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے انھیں اپنے سفیر خاص کی حیثیت سے لندن بھیجا۔ وہ یکم دسمبر ۱۸۳۹ء کو کشتی کے ذریعے کلکتہ روانہ ہوئے اور وہاں سے ۱۴/مارچ ۱۸۴۰ء کو بحری جہاز میں سوار ہو کر لندن کے لیے روانہ ہوئے ۲۷/جولائی ۱۸۴۱ء کو لندن پہنچے۔ اس سفر کی تفصیل اور

لندن کی روزانہ کی مصرفیتوں کا حال انھوں نے اس کتاب میں لکھا ہے۔ یہ نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کسی طرح گارساں داتاسی کے پاس پہنچا اس نے اس کے پہلے حصے یعنی اس کے سفرِ ہندوستان کے حالات کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے FOR REVUE DEORIENT 1865 میں شائع کیا تھا۔(۴۵)

سیاحتِ نامہ، نواب کریم خاں میں ہندوستان کے حال کا بھی تفصیل سے ذکر ہے۔ لیکن نواب کریم خاں کے سفر نامے میں تاریخی شعور کی بہ نسبت تہذیبی شعور زیادہ واضح ہے۔ وہ دریائے گنگا سے کشتی کے ذریعے کلکتہ جاتے ہوئے، جب بنگال کے مضافات میں پہنچتے ہیں تو کسی گاؤں کے رہن سہن کو وہ اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''اور گھر ملک بنگالے میں اکثر چھپر کے ہیں اور باسن اُن اشخاص کے اکثر گلی، تھوڑے سے برنجی۔ بستیاں بھی یہاں کی بیشتر درختوں میں ہوتی ہیں یعنی اس جگہ گھر بناتے ہیں ادھر اُدھر درخت ہوں۔ خدا نخواستہ اگر ایک گھر کو آگ لگ جائے تو گاؤں کا گاؤں پھنک جاتا ہے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کے نشان کسی کو معلوم نہیں ہوتے۔ مگر ان درختوں کے آثار سے۔(۴۶)

سیاحتِ نامہ نواب کریم خاں جب ہندوستان کے علاقوں سے گزرتے ہیں تو اپنے سفر نامہ میں اورنگزیب عالم گیر اور اکبر کے دور کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، سیاسی اور تاریخی حالات و واقعات کو آرائش محفل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ سفر نامے میں اکثر جگہوں پر انھوں نے آرائش محفل سے اقتباسات نقل کیے ہیں تاہم صفحہ نمبر نہیں لکھتے۔ مگر سمجھنے میں اور تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوتی، ان کے نقل کیے ہوئے واقعات کو آرائشِ محفل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سفر نامے کی صف میں منشی اسماعیل کے سفر نامے کے بعد سفر نامہ'' سیرِ ملک اودھ'' ہے ایک اور اہم اضافہ ہے۔ یہ سفر نامہ یوسف خاں کمبل پوش نے لکھا ہے۔ ان کا اب تک کا یہ دوسرا سفر نامہ ہے اور ہندوستان میں سلطنتِ اودھ کے مفصل حالات کا پہلا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا ہے۔ مذکورہ سفر نامہ بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ نے مرتب کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامے کا نسخہ:'' بودلیین لائبریری میں انڈین انسٹی ٹیوٹ، اوکسفرڈ کے ذخیرہ میں موجود ہے۔''(۴۷) سفر نامے کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ سیر ملک اودھ میں ریاستِ اودھ کے سماجی، سیاسی، عسکری اور مذہبی صورت حال کا ذکر ہے۔ یوسف کمبل پوش ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:'' عجب حال سرکار اُوّدھ ہے۔ لاکن صورت عمل داری ناممکن۔ علاقہ نہ علاقہ سوائے ظلم و بدعت کے دوسرا امر نہیں۔ یہ رواج البتہ لاحق حال ہے۔، کیا سبب کہ بالائے چند حال علاقہ ملک اُوّدھ کا تحریر ہے۔ چکلہ دار بخوبی لوٹ رہے ہیں۔ اور شنوائی ندارد۔''(۴۸)

سید فدا حسین کا سفر نامہ تاریخِ افغانستان بھی نو آبادیاتی عہد کا ایک اہم سفر نامہ ہے۔ سید فدا حسین بھی یوسف کمبل

پوش کی طرح انگریزوں کی فوج میں تھے۔ یا انگریز کے زیرِ کمان فوج کے ساتھ افغانستان کے محاذ پر گئے۔ انھوں نے جتنا وقت اس مہم میں گزارا، تفصیلات جمع کرتے رہے۔ اس کے بعد سفرنامہ ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا۔ اگرچہ انھوں نے مذکور سفر یوسف خان کمبل پوش سے پہلے اختیار کیا تھا۔ مگر سفرنامہ دیر سے لکھنے کی وجہ سے سید فدا حسین کا سفرنامہ ''تاریخِ افغانستان'' اردو سفرنامے کی صف میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ کسی بھی سفرنامے میں تاریخی واقعات، حالاتِ حاضرہ کے پیش نظر، اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے زیرِ تحقیق مقالہ میں سفرنامے کی زمانی ترتیب تاریخ اشاعت سے نہیں بلکہ سفر کے واقعہ ہونے کی تاریخ سے تصور کی جائے گی۔ جہاں تک تاریخ افغانستان کا تعلق ہے تو یہ سفر پہلے کیا گیا اور سفرنامہ خاصی دیر بعد لکھا گیا۔ زیرِ نظر اقتباس کے بارے انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> سید فدا حسین کی میرٹھ کی انگریزی فوج میں جمعداری کے عہدے پر فائز تھا، نومبر ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے کابل پر چڑھائی کے لیے جو مہم روانہ کی فدا حسین اس مہم میں شامل تھا۔...... یہ سفرنامہ تاریخ افغانستان کے نام سے ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا۔ لیکن یوسف کمبل پوش کے سفرنامے کے آگے آراستہ سفرنامے کے مقابلے میں تاریخ افغانستان کا چراغ نہ جل سکا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے کہ سفرنامہ داستانی آہنگ لیے ہوئے ہے۔(۴۹)

نوآبادیاتی دور کا ایک اور اہم سفرنامہ سیرِ محتشم ہے۔ یہ سفرنامہ محتشم الدولہ غوث محمد خان کے سفری حالات کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ محتشم نے اپنے سفرنامے میں ریاستِ اُودھ کے سیاسی، تاریخی اور سماجی حالات قلم بند کیے ہیں۔ تاریخِ اودھ کے مصنف نجم الغنی نے اُودھ کے بعض واقعات کے پیش نظر سیرِ محتشم کو تاریخ اُودھ کا حصہ بنایا ہے۔ یہاں اس بات کی یاد دہانی ضروری ہے کہ تاریخِ یوسفی میں بھی ریاست اُودھ کے سیاسی، انتظامی اور تاریخی حالات موجود تھے۔ نجم الغنی نے تاریخِ اُودھ لکھنے کے لیے تاریخِ یوسفی کو بنیاد نہیں بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مذکورہ سفرنامہ اُن کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ تاریخ اُودھ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی اس سے ستر سال پہلے یوسف کمبل پوش کا ایک اور سفرنامہ بھی لکھا جا چکا تھا جو منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اس کے علاوہ نوآبادیاتی دور کا ایک اور سفرنامہ ''سفیرِ اُودھ'' ہے۔ یہ سفرنامہ مسیح الدین علوی کا ہے۔ انھوں نے یہ سفر واجد علی شاہ کی معزولی (۱۸۵۶) کے پیش نظر ۱۸۵۶ء میں کیا تھا۔ برطانیہ جاتے ہوئے مسیح الدین علوی مکہ مکرمہ گئے اور عمرہ کرنے کے بعد برطانیہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ انھوں نے کتاب 'سفیرِ اُودھ' ہندوستان واپس آنے کے بعد ۱۸۶۵ء میں لکھی۔ انگلستان پہنچنے کے بعد دو سال تک اپنے گھر میں قیام کیا۔ اس دوران سقوطِ اُودھ ہو چکا تھا: ''قریب دو برس کے میں خانہ نشین رہا کہ اتنے میں اُودھ کی سلطنت سرکار انگریز نے ضبط کر لی جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا...... بتاکید میری طلب ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا۔'' (۵۰) ریاست اودھ کی ایک سفارت اس سے پہلے ۱۸۴۰ء کے قریب بھی لندن جا چکی تھی۔ اس

سفارت کا مقصد سفارتی روابط کو فروغ دینا تھا جو کچھ عرصہ پہلے کسی وجہ سے معطل ہو چکی تھی۔ اس سفارت میں مولوی اسماعیل بھی گئے تھے۔ جن کی نازیبا حرکت کی وجہ سے حکومتِ برطانیا نے اپنے ملک سے بدر کر دیا تھا۔ اس سفارت کے بارے میں تاریخ اُودھ میں لکھا ہے کہ: ''کرنیل ڈلو اصاحب فرانسیس کو بادشاہ کا سفیر بنا کر لندن کو بھیجنا تجویز کیا اور مولوی محمد اسماعیل کو جن کے گھر میں ایک عیسائی عورت تھی اور اس سبب سے انگریزی زبان خوب جانتے تھے۔ اس سفیر کی ہمراہی میں مقرر کیا۔'' (۵۱)

مولوی اسماعیل وطن واپس آنے کے کچھ عرصے بعد فوت ہو گئے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امکان ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے سفر کے حالات قلم بند کیے ہوں۔ اور وہ کسی جگہ محفوظ ہوں۔ اور مسودہ ملنے پر تاریخ کے نئے گوشے کھل جائیں۔ جیسا کہ موجودہ دو ایسے ابتدائی سفر ناموں کی بازیافت ہو چکی ہے جن میں ایک اردو اور ایک فارسی کا سفر نامہ ہے۔ گزشتہ سطور میں ان کا ذکر آیا ہے۔

ایشیا کے ابتدائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر انوکھی صورت حال لیے ہوئے ہیں۔ کہیں پر تاریخی واقعات عصرِ حاضر کے پیش نظر ہیں۔ کہیں ماضی اور حال کا موازنہ کی صورت میں ہیں۔ کسی جگہ سفر ناموں کے متن میں تاریخ کی طرف صرف ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔ جس کے پس منظر میں پوری تفصیل موجود ہوتی ہے۔ اس طرح ابتدائی اردو سفر نامے کو تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ، سیاحت نامہ، عجائبات فرنگ، سیر ملک اُودھ، سیر المحتشم، تاریخ افغانستان اور سفیر اودھ ایسے سفر نامے ہیں جو جنگِ آزاد سے پہلے کے ہیں۔ ان سفر ناموں میں جنگِ آزادی کے آثار تو نظر نہیں آتے۔ لیکن ان سفر ناموں میں ''پورے ہندوستان پر انگریز کا قبضہ ہو جائے گا'، جیسی قسم کی صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کے مطالعہ کے پیشِ نظر مذکور سفر ناموں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

سفر نامہ تاریخِ یوسفی، عجائباتِ فرنگ میں یوسف کمبل نے بڑے انوکھے اسلوب اور ادبی پیرائے میں تاریخ بیان کی ہے۔ لندن جانے سے پہلے یوسف کمبل پوش شاہ نصرالدین حیدر بادشاہ اُوّدھ کے ملازم تھے۔ جس وقت کمبل پوش اودھ واپس پہنچے تو انھیں مرے ہوئے کوئی چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جن دنوں بادشاہ فوت ہوئے تو اُس وقت یوسف کمبل پوش مصر میں ہملٹن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک عہدہ دار کے ساتھ موجود تھے۔ اُوّدھ پہنچ کر یوسف کمبل پوش نے سب سے پہلے اپنا سابقہ عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یوسف کمبل پوش کی ملازمت پر دوبارہ تقرر کرانے میں کپتان منگنس نے بہت زیادہ مدد کی۔ بادشاہ اُوّدھ سے تقرر نامہ جاری کرایا۔ حالاں کہ کرنل 'لو' اور 'پاٹن' دونوں سے یوسف خاں کمبل پوش کی ملاقات تھی۔ کرنل لو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز افسر تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاستِ اُوّدھ میں مداخلت برقرار رکھنے کے لیے ریزیڈنسی (برطانوی جہاں جہاں قبضہ کیا وہاں پر تسلط قائم رکھنے کے لیے ریزیڈنسیز بنائی ہوئی تھی) قائم کر رکھی تھی۔ یوسف

خاں کمبل پوش کو مذکور دونوں انگریز افسروں نے ملازمت پر دوبارہ تقرری کرانے سے معذرت کر لی تھی۔ عجائباتِ فرنگ میں کمبل پوش لکھتے: ''میں نے یہ حال کپتان مینگلس صاحب سے کہہ کر رخصت ہونے کا قصد کیا۔ اُنھوں نے اپنے مکان کے نزدیک ایک مکان کرایہ کا میرے رہنے کے لیے ٹھہرا دیا اور جدا ہونا میرا ہرگز گوارا نہ کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد تدبیر کر کے سرکار شاہی میں عرضداشت کی اور اسامی قدیمی بحال کروائی۔'' (۵۲) یوسف کمبل پوش سفرنامہ نگاری کے حوالے سے بہت مشہور ہیں لیکن تاریخ میں نام اس لیے نہیں آیا کہ ان کا سفرنامہ تا دیر پس منظر میں رہا۔ تاہم کپتان مینگلس کا تاریخِ اَوَدھ میں کئی ایک مقام پر ذکر موجود ہے۔ اپنے عہد پر فائز ہونے کے بعد یوسف خاں کمبل پوش نصیر الدین حیدر کے مزار پر جاتے ہیں اور بہت غم زدہ ہوتے ہیں۔ جن الفاظ میں یوسف خاں کمبل پوش نے بادشاہ کے متعلق اپنے غم کا حال بیان کیا ہے اُس کی مثال ان کی تحریر ہی سے دی جا سکتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: ''بندہ نواز سلیمان جاہ کا مقبرہ اور حال بے کسی ان کا دیکھ کر سخت ملول ہوا اور دیر تک سرہانے قبر کے کھڑے ہو کر روتا رہا۔ حال وفات ان کی کا اس طرح سنا کہ نمک حراموں نے زہر پلا کر مارا۔ افسوس ان کم بختوں نے غضب کیا کہ ایسے بادشاہ فیاض کو یوں برباد کیا۔'' (۵۳) نصیر الدین حیدر بادشاہ اَوَدھ کو زہر دے کر مارا گیا تھا۔ بادشاہ کو شراب پلانے والے خدمت گار نے شراب میں تھوڑا تھوڑا زہر ملا کر دیتے تھے۔ بادشاہ کی صحت جب زیادہ خراب ہوئی تو پھر صحت دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔ یوسف خاں کمبل کی بات کی تائید کرتے ہوئے مولوی نجم الغنی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ:

> ۴ ربیع الثانی ۱۲۵۳ء ہجری موافق ۸ جولائی ۱۸۳۷ء کو بعد انقضائے چار ساعت نجوم کے سنیچر کی رات میں طائر روح نے قفس تن خاکی سے پرواز کی۔ پچیس برس کی عمر میں تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا تھا اور دس برس پانچ یوم حکمرانی کی، چھ کروڑ روپے سے زیادہ خزانے میں جمع و جواہرات اور آمدنی ملک کا روپیہ سب صرف کیا۔ جیتے جی سلیمان جاہ لقب تھا مرنے کے بعد خلد منزل کہلائے۔ جب نصیر الدولہ اُن کی جگہ مسند نشین ہو چکے تو جنازہ حسبِ آئین شاہانہ اُٹھا کر کربلا مکارم نگر میں جو گومتی کے پار اُنھوں نے تعمیر کرائی تھی اور نیم تیار موجود اور شبیہ کربلا اُس کا نام رکھا تھا مزار قدسیہ بیگم کے پاس مدفون ہوئے۔ (۵۴)

نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد مرزا فریدوں اَوَدھ کے تخت پر بیٹھے۔ نصیر الدین حیدر کا یہ دعویٰ تھا کہ مرزا فریدوں ان کی اولاد نہیں۔ جب کہ مرزا فریدوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ بادشاہ ہی کی اولاد ہے۔ فریدوں کو تخت پر بٹھانے کا سارا کام نصیر الدین حیدر کی والدہ بادشاہ بیگم کا تھا۔ نصیر الدین حیدر نے اپنی زندگی میں اس بارے میں کرنل لو کو تفصیل لکھ کر بھیج دی تھی کہ مرزا فریدوں ان کی اولاد نہیں ہے لہٰذا اسے تخت نشین نہ ہونے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کرنل لو صاحب نے مرزا فریدوں کے تخت نشین ہونے پر کہا تھا کہ: ''تم کو مناسب نہیں تخت پر بیٹھنا۔ اس لیے کہ تم بموجب نوشتہ شاہ مغفور کے اُن کے نطفہ سے ثابت نہیں ہو۔ پس ارادہ سلطنت کا کس دعوے سے رکھتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اس خیال سے باز آؤ۔ خیریت

سے آپ اپنے گھر جاؤ۔ نہیں تو بعد دو گھڑی کے گرفتار ہو گئے۔ نہایت ذلیل و خوار ہو گئے۔'' (۵۵) نصیر الدین حیدر اپنی زندگی میں ایک خط کرنل لو کو بھیج چکے تھے جس میں فریدوں کے تخت نشین ہو جانے کی صورت میں معزول کرنا اور نصیر الدولہ کو تخت نشین کرنے کا ذکر تھا۔ یوسف خاں کمبل پوش نے اپنے سفر نامے میں اس بارے میں لکھا ہے کہ: ''بعد انتقال مرزا فریدوں بخت عرف منا جاں جو اپنے تئیں صلبِ شاہِ خلد آرام گاہ سے جانتے تھے اور شاہ سلیمان جاہ حالت حیات اپنی میں نوشتہ مہری اپنا اپنا متضمن ابطال دعوئ فرزندی کی سرکار کمپنی میں بھجوا چکے تھے۔'' (۵۶) نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد بادشاہ بیگم جس کا دربار کے راجوں مارجوں پر اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا، چالاکی اور زور زبردستی سے فریدوں بخت منا جاں کو تخت نشین کرا دیا۔ جب کہ نصیر الدین حیدر اُسے اپنا فرزند ماننے سے انکار کر چکے تھے۔ اس بارے میں کرنل لو سے مشاورت بھی جاری تھی۔ لوگوں کے درمیان اس بات کو مشہور کر دیا کہ بادشاہ کا اصل وارث بخت فریدوں نہیں ہے، چناں چہ اس بارے میں نجم الغنی لکھتے ہیں کہ:

> بادشاہ نے ایک خط بھی جس میں لاولدیت کا بیان تھا رزیڈنٹ کے پاس بھیجا چناں چہ رزیڈنٹ نے بادشاہ کی استدعا کے مطابق تمام کیفیت گورنر جنرل کو لکھ بھیجی اور وقت مراجعت کے سپاہیان انگریزی متعینہ بیگمی گارڈ کو حکم دیا کہ آئندہ منا جاں کو سلامی ندیا کریں۔ گورنر جنرل نے جواب دیا کہ اس مضمون کو خلق میں مشتہر کرینا چاہئے۔ چناں چہ قلمرو اودھ میں اس مضمون کے اشتہار جابجا چسپاں ہوئے اس وقت سے ولی عہدی اور شاہزادگی کا لفظ اُس کے نام سے محکوک ہوا لیکن بادشاہ بیگم کی وجہ سے اس مضمون کے سدِ باب میں اکثر نکتہ چینیاں کہیں اور مُنا جاں کو اپنے پاس سے جُدا نکیا۔ (۵۷)

کرنل لو کے کہنے پر بادشاہ نصیر الدین ایک اشتہار شائع کرایا جس میں مرزا فریدوں کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ اُس اشتہار کا مضمون یہ ہے کہ:

> چوں جناب والدہ صاحب آں طفل معروف بہ منا جاں را کہ موسوم بہ محمد مہدی و ملقب بہ فریدوں بخت کردہ انداز قریب زماں تولید پرورده وازبطن یک اسامی مشہور نمدہ و ارا منسوب بفرزندی مابدولت ساختہ بودند بارہا گفتہ شد کہ ایں خلاف ناموس نام و ننگ ایں دودماں رفیع الشان موجب قباحت عظیم است و جناب علیین مآب اعلیٰ حضرت خلد مکان طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ نیز بعد تحقیقات و تفتیش تمام و دریافت حال واقعی ہرگز ثبوت ایں طفل را نسبت بمابدولت قبول نفرمودند چناں چہ بر کہ و مہ ظاہرست مگر جناب ممدوحہ نشنیدند و اُو را ملقب بالقاب مخصوص فرزندان ساختند و حالاں کہ ایں طفل مجہول حال را علاقہ بمابدولت نیست و مستحق نمیگردد کہ جناب ممدوحہ ایں طفل را چگونہ پیدا کردند۔ احتمال قوی ایں ست کہ زنے کہ ایں طفل را ازبطن او میگویند دیگر خواصاں بخانۂ فضل علی میر فتند ہر چند منع کردہ شد ازیں امر مستکرہ ناز نماند ند پس غالباً نطفۂ فضل علی یا درین بیقیدی از نطفۂ دیگر بہم۔ رسانید باشد ایں احتمال در صورتی ست کہ ایں

طفل ازبطن آن زن پیدا شہدہ باشد والا چناں چہ مشہور ست زن کا ذرا کہ حاملہ بود بخانہ داشتہ بودند و ہر گاہ او وضع حمل کرد تولید از بطن زن مذکور شہرت دادند باز ما بدولت بخدمت بیگم صاحبہ دہم بخدمت والد ماجد خلد مکان گفتہ بودیم کہ این طفل اجنبی را با بنوت من علاقہ نیست۔ لہٰذا حضرت ماجد خلد مکاں مبطل نسب ایں مجہول النسب بود بدوز یادہ از ہمہ ایں کہ سن حضور در آوانے کہ تکوین ایں طفل را بیگم صاحبہ موصوفہ مشہور کردہ بودند بحد بلوغ نرسید بود کہ احتمال نبوت نسبت بحضور را مکانے داشتہ باشد وقباحت وشناعت اشرف الامرا ابواب گورنر جنرل صاحب بہادر خلد اللہ ملکہ کہ حفظ وحراست این سلطنت حالاً و مآلاً متعلق بذات بابرکات نواب ممدوح واہالیاں سرکار کمپنی انگریز بہادر ست آگہی دادہ شد داین معنی از رہگذر یکتا دلی وحق پسندی وکفالت وحفظ ایں ریاست مطبوع طبع ودقیقہ سنج نواب معظم الیہ افتاد در جواب اطلاع از بطلان نسبت و بنوت آں طفل معنی اشد ضرور لہٰذا برائے اطلاع خاص وعام اشتہار ہذا از پیش گاہ جاہ و جلال صادر گردید تا جملہ منتسیاں ایں دولت عظمیٰ وعمائد وامرا جمیع ملازماں سرکار والا ورعایا برایا۔ ایں طفل را ازیں دودمان عالیشان اجنبی محض ومجہول النسب پندارند وگاہے وہم بنوت مبروہ نسبت بحضور قدس واعلیٰ بخاطر راہ ندہند۔(۵۸)

ریاست اُوّدھ میں ایک بادشاہ کی تخت نشینی کے لیے ایک قاعدہ مقرر تھا کہ جس دن مرحوم بادشاہ کا جنازہ ہوگا۔ اسی دن نماز جنازہ سے پہلے رسم تاج پوشی اور اگلے بادشاہ کی تخت نشینی ہوگی۔ نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد بادشاہ بیگم اور ان کے ہم نواؤں نے مل کر منّا جاں کو تخت نشین کرا دیا۔ منّا جاں کے بارے میں نصیر الدین حیدر پہلے ہی کرنل لو کو آگاہ کر چکے تھے۔ دراصل فریدوں بخت، عرف منّا جاں نصیر الدین حیدر کا منہ بولا بیٹا تھا۔ اس ساری کاروائی کے پیچھے بادشاہ بیگم یعنی نصیر الدین حیدر کی والدہ کا ہاتھ تھا۔ چوں کہ مرزا فریدوں بخت جدی وارث نہیں تھا اس لیے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ زبردستی تخت نشین ہونے کی وجہ سے سلطنت اُوّدھ میں بدنظمی پیدا ہوئی گئی تھی جس کے بارے میں یوسف کمبل پوش لکھتے ہیں کہ:

بڑے صاحب یعنی کرنیل لو صاحب نے کہا تم کو نہیں مناسب تخت پر بیٹھنا۔ اس لیے کہ تم بموجب نوشتہ شاہ مغفور کے اُن کے نطفہ سے نہیں ثابت ہوتے ہو۔ پس ارادہ سلطنت کا کس دعوے سے رکھتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اس خیال سے باز آؤ خیریت سے اپنے گھر جاؤ نہیں تو بعد دو گھڑی کے گرفتار ہو گئے، نہایت ذلیل وخوار ہو گے۔ مرزا فریدوں بخت نے کہنا بڑے صاحب کا نہ جانا اور اپنے تئیں مستحق سلطنت جانا۔(۵۹)

جیسا کہ نصیر الدین حیدر مسند نشینی کے لیے تجویز کر گئے تھے کہ مرزا فریدوں بخت عرف منّا جاں تخت نشینی کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کلکتہ نے انگلستان سے تقرری نامہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ریزیڈنٹ ڈیوس کرنل لو نے: ’’ان کے پاس پہنچ کر بہت کچھ سمجھایا کہ آپ یہاں سے لوٹ جائیں ریاست فریدوں بخت کو نہ ملے گی نصیر الدولہ مسند

نشین ہوں گے۔''(۶۰) یوسف خاں کمبل پوش نے اپنے سفرنامے میں چشم دید تاریخی حقائق قلم بند کیے ہیں۔ اس طرح کے حقائق تاریخ اودھ میں مولوی نجم الغنی نے بھی بیاں کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ کرنل لو نے: ''پھر میعاد کے اندر اُس مضمون کو تین مرتبہ دھرایا کچھ سماعت نہ ہوئی اور کلکتے کی چٹھی جو ہاتھ میں تھی اُس کو مرزا علی خان کو دکھا کر فرمایا کہ یہ حکم نامہ کلکتہ کا موجود ہے۔''(۶۱) لیکن دوسری طرف منّاں جاں اور بادشاہ بیگم اپنی زد پر اڑے رہے جس کا ذکر یوسف خاں کمبل پوش کے مطابق کرنل لو نے دو گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ درحقیقت یوسف خاں کمبل پوش نے کسی قدر تاریخی کو ادبی اسلوب میں بیان کیا ہے۔ جب کہ نجم الغنی لکھتے ہیں کہ: ''رزیڈنٹ نے کہا کہ کونسل کلکتہ سے سلطنت نصیر الدولہ کے واسطے قرار پائی ہے اس لیے پاؤ گھنٹے کی اور بقولے دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہے اور یہ گھڑی اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ منّا جاں کی اگر جان کی خیر منظور ہے تو تخت سے اُٹھاؤ۔''(۶۲) منّاں جاں اور بادشاہ بیگم کو کرنل لو نے جو مہلت دی تاریخ اُوّدھ کے مصنف نے دس سے پندرہ منٹ بتائی ہے اور تاریخِ یوسفی کے مصنف نے دو گھڑی بیان کی ہے۔ دراصل کرنل لو نے پندرہ منٹ کی ہی مہلت دی تھی جس کے بعد حملہ کرنے کی دھمکی دے دی تھی: ''رزیڈنٹ نے مصطفیٰ خان قندھاری کی معرفت بیگم صاحبہ کو کہلا بھیجا کہ اب پاؤ گھنٹے کی تمھیں مہلت دیتے ہیں بعد اس کے توپ چلے گی۔''(۶۳) تاریخ اودھ جلد چہارم کے بیان اور تاریخ یوسفی کے تاریخی واقعات اور تاریخی واقعات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کرنل لو نے نصیر الدولہ کے مخالفین پر حملہ کرنے کی دھمکی دیتے ہیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف خان کمبل پوش کسی اُونچی جگہ پر بیٹھ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس لیے تو انھوں نے ایسا لکھا ہے کہ:

> لاچار بڑے صاحب نے ہمراہی پلٹنوں اور توپ خانہ کو حکم دیا۔ یکا یک گولی چلی اور مصطفیٰ خان قندھاری رسالہ دار اسی جھگڑے میں مارے گئے۔ بہت ناحق مفت کام آئے۔ تختِ زرنگار اجلاسِ شہر یار گولے توپ سے پرزے پرزے ہوا۔ فریدوں بخت مع بادشاہ بیگم دادی اپنی کے گرفتار ہو کر آیا بعد اس کے لو صاحب نے بموجب حکم شہنشاہ انگلستان نصیر الدولہ بہادر کو تخت پر بٹھالایا۔ تمام اختیار سلطنت کا اُن کو دیا چنانچہ یہاں کے اب وہی فرماں روا ہیں۔(۶۴)

مرزا فریدوں بخت اور بادشاہ بیگم نے جب کرنل لو کی بات نہ مانی تو کرنل لو نے مقررہ وقت کے بعد حملہ کر دیا جس کی وجہ سے مخالفین کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ اسی وجہ سے: ''مصطفیٰ خان نے جو منّا جاں کا سینہ سپر تھا سینے میں گراب کے دو ٹکڑے کھا کر جاں دی موہن سنگھ اور لالتا پرشاد بھی مارے گئے رزیڈنٹ نے منّا جاں کو تخت وست کہ کر جھڑکی کے ساتھ کہ جلد تخت سے اُٹھ تیرے مارے جانے میں دیر نہیں ہے۔''(۶۵) حملہ کی صورت حال میں یوسف خاں کمبل پوش نے بیان کیا تھا کہ تخت زرنگار توپ کا گولہ لگنے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن نجم الغنی کہتے ہیں کہ تخت کے ہیرے اور جواہرات تلنگوں نے لوٹ لیے تھے۔ ہوا یوں کہ: ''سیکڑوں آدمی بھاگ گئے اور چالیس آدمیوں کے قریب مارے گئے

تلنگوں نے سیڑھیاں رکھ کر آدمیوں پر چھرے مارنا شروع کیے اور تخت کے جواہرات کو اس جلدی میں جتنا بن سکا لوٹ لیا۔" (۶۶) ریاستِ اُوّدھ میں ایک تلنگا نام کی فوجی یونٹ یا دستہ ہوتا تھا۔ البتہ تاریخ اُوّدھ کے مصنف نے بارہ دری کے تباہ ہونے کا حال لکھا ہے کہ: "ابھی مصطفیٰ خاں اُس ملٹری میں پیام کہنے نہ پائے تھے اور اس بات کی اُن کو خبر بھی نہ ہونے پائی کہ رزیڈنٹ کے حکم سے توپیں چلنے لگیں چند گرابوں میں بارہ دری پاش پاش ہوگئی۔" (۶۷) جنگ میں بادشاہ بیگم کے اہم آدمیوں میں مصطفیٰ خان قندھاری مارے گئے جس کا ذکر تاریخِ یوسفی میں بھی آیا ہے۔ اس کے علاوہ جانی نقصان کے بارے میں عدادوشمار میں اختلاف موجود ہے۔ بہر کیف تاریخ اُوّدھ میں لکھا ہے کہ: "سلطان الاخبار میں بیگم کے ہمراہی مقتولوں کی تعداد ساٹھ لکھی ہے جن میں مصطفیٰ خاں اور موہن سنگھ اور لالتا پرشاد راجپوت شامل ہیں انگریزی فوج کا صرف ایک تلنگا مارا گیا اور دو تلوار سے زخمی ہوئے تھے۔" (۶۸) اس طرح کرنل لو کو اپنا مقصد حاصل ہوا۔ انھوں نے مرزا مناّں جاں کو تخت سے اترنے اور ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ اس وقت منّا جاں نے: "بندوق کو ہاتھ سے پھینک دیا اور تخت سلطنت سے اُتر کر اپنے آپ کو نشیب کی طرف گرا دیا کہ پانوں میں صدمہ بھی آیا۔ بیگم صاحبہ کے خاص بردار اور برقنداز بھی بندوق زنی سے بند نہ تھے رزیڈنٹ کے گرد سپاہیوں نے حلقہ باندھ لیا۔" (۶۹) مرزا فریدوں بخت کو تخت سے اتارنے کے بعد کرنل لو نے نصیر الدولہ کو تخت حاصل کرنے کی پیشگی مبارک دی جسے تاریخ اُوّدھ جلد چہارم میں یوں لکھا گیا ہے کہ: "اُس وقت رزیڈنٹ نے بادشاہ کے پاس جا کر اُن کو مبارک باد دی کہ یہ سلطنت حضور کو مبارک ہو کچھ خطرہ اب نہیں رہا بادشاہ بیگم اور منّا جاں گرفتار ہیں اُن کی نسبت کیا حکم ہوتا ہے۔ نصیر الدولہ نے کہا کہ آپ کی حفاظت میں رہیں۔" (۷۰) نصیر الدولہ کی اسی مسند نشینی کو سفرنامہ تاریخِ یوسفی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: "بعد اس کے کرنل نے بموجب حکم شہنشاہ انگلستان نصیر الدولہ بہادر کو تخت سلطنت پر بٹھلایا۔ تمام اختیار امور سلطنت کا اُن کو دیا۔ چنانچہ یہاں کے اب وہی فرماں روا ہیں۔" (۷۱) ریزیڈنٹ کرنل لو چاہتے یہ تھے کہ نصیر الدولہ کی تخت نشینی کے حوالے سے ان کی بات مان لی جائے۔ جنگ کرنے سے گریز کیا جائے۔ خواہ مخواہ خون خرابہ ہوگا۔ اس لیے جب وہ: "نصیر ولدولہ کی مسند نشینی سے فارغ ہو کر کلاں کوٹھی میں آئے تو بیگم صاحبہ اور منا جاں کو زرد کوٹھی میں بھیج دیا گیا جو مکان رزیڈنسی سے ملحق تھی، دو روز مناں جاں بادشاہ بیگم سے جدا رہا بعد اس کے رزیڈنٹ نے ان کی گریہ وزاری پر رحم کر کے دونوں کو ایک جا رہنے کا حکم دیا۔" (۷۲)

تاریخِ یوسفی، عجائبات فرنگ کا مصنف، سلطنتِ اُوّدھ کے تاریخی واقعات کا بڑے قریب سے مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی سرکاری مہم میں حصہ نہیں لے رہے تھے بلکہ کہیں لشکر کے درمیان میں رہ کر تاریخ نویسی کر رہے تھے۔ بہت سی فوجی مہمیں ایسی پیش آئی جن میں یوسف خاں کمبل پوش خود مہم سر کرنے کے لیے شامل رہے۔ کپتان منگنس جب کبھی کسی سرکاری مہم پر جاتے تو یوسف خاں کمبل پوش کو اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ اسی طرح کی ایک

مہم جس میں وہ قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے گئے تھے تو اس مہم میں یوسف خاں کمبل پوش بھی شامل تھے۔ وہ اپنے چشم دید واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: ''ان دنوں بندی بھی دو تین دفعہ ہمراہ کپتان منگنس صاحب اور راجہ درسن سنگھ غالب جنگ زمینداروں اور رہزنوں کے پکڑنے کو گیا تھا۔'' (۷۳) درشن سنگھ زمیندار قلعہ نما، پختہ اور مضبوط مکان میں قیام پذیر تھا۔ اس کے علاوہ سلطنت اُوّدھ کے انتظامی امور میں شامل تھے۔ دستور کے مطابق سلطنتِ اودھ، زمینداروں کو زمین اور دیگر اخراجات نقدی دیتی تھی کہ جب حکومت کو فوج کی ضرورت پیش آئے تو زمیندار حسبِ ضرورت فوج مہیا کر سکیں۔ حکومت انھیں با قاعدہ خطاب عطا کر کے کئی کئی دیہات کے رقبے دیتی تھی۔ اسی طرح درشن سنگھ کو حکومت نے غالب جنگ خطاب دے رکھا تھا اس کے پاس ناظم کا عہدہ تھا۔ درحقیقت یوسف خاں کمبل پوش نے درشن کا خطاب درج کیا ہے اور نجم الغنی نے: ''علاقہ گونڈہ و بہرائچ راجا درشن سنگھ ناظم۔'' (۷۴) کا عہدہ یا مرتبہ درج کیا ہے۔ درشن سنگھ کے بعد کمبل پوش، امام بخش کی گوشمالی کے لیے بھی گئے تھے جس کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے کہ:

''ایک دن موضع سریان میں گڈھی کھودنے اور گرفتاری امام بخش زمیندار کے واسطے گیا۔ دیکھا کہ گڈھی بہت مضبوط بنی ہے مگر اس کے مضبوط خندق گہری کھدی۔ ہر سمت اس کے جنگلا تھا۔ دیکھنے والے کا دم رکتا۔ اس گڈھی میں آٹھ سو آدمی بندوقچی تھے۔ ملازم بادشاہی اُس کے نے اُس کو سمجھایا کہ تو لڑائی سے باز آ۔ مقابلہ فوج بادشاہی نہ کر سکے گا۔ اُس کوتاہ اندیش نے ہرگز نہ مانا۔ ہمراہی اُس کے سب گڈھی سے نکل گئے۔ فقط سولہ آدمی امام بخش کے ساتھ گڈھی میں رہ کر یوں گولیاں مارتے۔ ادھر تین ہزار آدمی مستعد تھے۔ اُن کے سوا دس ضرب توپ کے گولے پڑتے۔ آخر سولہ آدمی مام بخش سمیت مارے گئے اور فوج بادشاہی سے دو آدمی کام آئے اور کتنے زخمی ہوئے۔ حق یہ کہ گڈھی والوں نے بڑی جرأت کی۔ لیکن فوج بادشاہی کے سامنے ان کی کیا حقیقت تھی۔ (۷۵)

یہاں اس بات کا ذکر ناضروری ہے کہ نصیر الدولہ نے درشن سنگھ کو جائیداد سے معزول کر کے ان کی جگہ سلطنت اُوّدھ کی ایک معزز خاتون: ''وجیہ النسا بیگم زوجہ سیف الدولہ عرف میر ہادی بن زین العابدین خاں کے تفویض (کی)۔'' (۷۶) اس بات کا ذکر یوسف کمبل پوش نے نہیں کیا۔ یا پھر یہ کام اندرونِ محل ہوا جس کی خبر اُن تک نہ پہنچ سکی۔ ایشیائی اردو سفر نامے میں ایسے چشم دید واقعات موجود ہوتے ہیں کہ بعض اوقات مورخ کے پیشِ نظر نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ نگار اور مورخ تاریخی حقایق کی سچائی کے درمیان خاصہ فرق موجود رہتا ہے۔ محمد علی شاہ، بادشاہ اُوّدھ نومبر ۱۸۳۸ء میں تخت نشین ہوئے تو سب سے پہلے روشن الدولہ کو وزارت سے ہٹا دیا تھا۔ چوں کہ وہ فسادی مزاج اور مرزا فریدوں بخت کا ہمدرد تھا یہی وجہ ہے کہ: ''محمد علی شاہ نے ابتدائے جلوس اپنے سے روشن الدولہ نائب شاہ خلد منزل کو عہدۂ نیابت سے معزول کیا اور سبحان علی کمبو مشیر کو اُس کے کو بسبب مفسدی طینت اس کی کے مع اہل وعیال گنگا ہ پار کر دیا۔'' (۷۷) بقول یوسف خاں

کمبل پوش بادشاہ نے وزارت کے عہدہ پر:

> حکیم مہدی علی خان منتظم الدولہ بہادر کو فرخ آباد سے بلا کر بجائے روشن الدولہ کے عہدہ وزارت پر سرفراز کیا۔ چند روز خان مسطور نے نہایت خوش سلیقگی سے کاروبارِ وزارت بنایا۔ پر افسوس اجل نے مہلت نہ دی۔ تھوڑے دنوں کے بعد قضا کی۔ بعد اُن کے بھتیجے اُن کے منورالدولہ بہادر نے خلعتِ نیابت سربلندی پائی اپنے چچا کے طور پر انھوں نے بھی یہ خدمت انجام دی۔(۷۸)

محمد علی شاہ، حکیم مہد کو وزارتِ سلطنتِ اُوّدھ دی تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد تیز بخار کی وجہ سے اُن کی وفات ہوگئی۔ جس کی وضاحت تاریخ اودھ کے مصنف نے یوں کی ہے کہ:

> حکیم صاحب امور سلطنت کی اصلاح منظور تھی اور خواہش اُن کی یہ تھی کہ جب کانپور جا کر گورنر جنرل کی ملاقات کر کے لوٹ آئیں تو ایسا بندوبست کریں کہ کسی وقت میں نہوا ہو۔ جو خرخشہ کہ بعضے سببوں سے بادشاہ اور سرکار کمپنی کی سرکاروں میں ہو جاتا ہے، اُسے جڑ سے اُکھیڑ دیں۔ مگر اجل نے مہلت ندی اور تپ محرقہ میں ایک ہفتہ علیل رہ کر اس دنیا سے سفر کیا۔(۷۹)

جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ حکیم مہدی علی خان بڑے قابل اور ماہر نائب السلطنت تھے۔ وہ امور سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ مگر موت نے انھیں زیادہ وقت نہ دیا۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے بھانجے وزارت معظّمہ پر فائز ہوئے تو وہ بھی ہر وقت سلطنت کے امور میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے بارے میں یوسف خاں کمبل پوش لکھتے ہیں کہ: ''منورالدولہ اگر چہ مستعد رہتے ہیں۔ پر اجرائے کار میں اپنے چچا کو نہیں پہنچتے ہیں۔''(۸۰) حکیم مہدی کے بعد منورالدولہ وزیر نہیں بنے بلکہ ظہیر الدولہ وزیر بنے تھے۔ ظہیر الدولہ کا ذکر یوسف خاں کمبل پوش نے نہیں کیا۔ امکان ہے کہ اس دوران وہ اُوّدھ میں نہ ہوں۔ کیوں کہ ان کے سفرنامہ سیــرِ مــلك ادوه سے علم ہوتا ہے کہ: ''یہ عاجز بعد انقضائے سفر سیلون اور سلطان پور اور بیسواڑہ قریب سات برس کے مع سب افواج سوار و، پیادگان ہمراہی، جانثاروں خان، کپتان منگنس صاحب بہادر کے لکھنؤ وارد ہوا۔''(۸۱) اس طرح سلطنت اُودھ کے یک بعد دیگرے دونوں وزراء کی وفات ہو چکی تھی۔ ظہیر الدولہ کی وفات کے بعد منورالدولہ وزیرِ سلطنت مقرر ہوئے۔ تاریخ اُوّدھ کے مصنف نے لکھا ہے کہ: ''اب ظہیر الدولہ کو جو عہدۂ سفارت پر مامور تھے وزارت منصب ہوئی۔ موت خانۂ وزارت دیکھ ہی چکی تھی۔ دو تین مہینے کے بعد یہ بھی رہگرائے ملک آخرت ہوئے۔ اس کے بعد منورالدولہ نے خانہ وزارت کو روشن کیا۔''(۸۲) وزارت کے محکمے کے علاوہ بادشاہ نصیر الدولہ نے اپنے ایک دوست کو اپنا مخصوص کے داروغہ بھی مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں کئی دوسرے عہدے بھی دیے تھے جن کا ذکر یوں ہے کہ: ''عظیم اللہ خان جو قدیم سے رفیق شاہ حال تھے۔ ابتدائے تخت نشینی شاہ زمان سے مالا مال اور نہال ہوئے۔ داروغگی دیوان خانۂ سلطانی کی انھیں کے نام ہے۔ سوا اُس کے اور کارخانجات کا انھیں

کے حوالہ سرانجام ہے۔''(۸۳)عظیم اللہ خان بادشاہ کے رفیق اور قابلِ اعتماد آدمی تھے۔بادشاہ ان کی ہر بات مانتے تھے۔ عظیم اللہ خان اور ایک اور عہدار ابراہیم خاں، منورالدولہ کے خلاف سازشوں میں مصروف رہنے لگے۔اس بنا پر وہ وزرات چھوڑ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے۔جس کی وضاحت نجم الغنی نے یوں بیان کی ہے کہ:''شرف الدولہ،مظفر الملک محمد ابراہیم خاں بہادر مستقیم جنگ سفارت کا کام کرتے تھے اور عظیم اللہ خان کا دور تھا۔ان لوگوں کی موشگافیوں کی وجہ سے منورالدولہ نے کئی مہینے کے بعد استعفا دے کر اپنے لواحقوں سمیت زیارت عتبات عالیات کے واسطے سفر اختیار کیا۔''(۸۴)

سلطنتِ اودھ میں ایک ایک قصبہ سنڈیلہ میور تھا۔اس علاقے میں ایک ہندو حکمران تھا۔اس کے علاقے میں بدانتظامی بہت زیادہ تھی۔اس کی رعایا پریشان حال تھی، یوسف کمبل پوش نے جس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ:''جب سے مرلی دھر نامی ایک شخص یہاں کی نظامت لے کر آیا تب سے نہایت اندھیر و نا منصفی و نا اتفاقی درپیش ہے۔کہ اس نے رعایا اور علاقہ یہاں کا تباہ ویران کر دیا اور جہاں تک رعایا پر ظلم ستم ہو سکا در گزر نہ کی۔''(۸۵)اسی طرح اودھ کے ایک اور گاؤں موضع سلطان پور کے قلعہ پر حملہ کرنے کے واقعہ کی تفصیل یوسف کمبل پوش نے اس طرح بیان کی ہے کہ:''اُس گڈھی میں قریب ستر ڈاکوں کے ایک سے پچیس جوانوں سے کہ نہایت ہی بہادر اور صاحب شمشیر،موجود، کہ بار ہا راجا غالب جنگ بہادر اور چند کلکٹر واسطے گرفتاری اُن کی کے گئے۔''(۸۶) موضوع سلطان پور میں زمیندار کے قلعہ پر فوج کشی کے دوران یوسف خان کمبل پوش بھی فوج میں شریک تھے۔حملے کے دوران جب بادشاہ اُودھ کی فوج جنگ و جدل سے دوچار ہوئی تو یوسف کمبل پوش بھی چند باغیوں کے نرغے میں آ گیا۔جسے صوبے دار رام بخش نے بچایا۔اس واقعہ کا حال اس طرح ہے کہ:''جوان نے سردار مجھ کو جان کر تلوار چلائی کہ ایک بار رام بخش صوبے دار نے ہاتھ اپنا میرے سر پر کر دیا کہ ہاتھ اس کا زخمی ہوا لیکن ہڈی بچی اور سمیت سنگھ خاص بردار نے دامن میرا ہرگز نہ چھوڑا۔''(۸۷)

یوسف خاں کمبل پوش اس حملے میں بُری طرح حصار میں آ چکے تھے۔شاہی فوجیوں نے خاص طور پر یوسف خاں کمبل پوش کو تحفظ عطا کیا تھا۔اس لڑائی میں اس کے سر پر بہت شدید قسم کی چوٹ لگی تھی۔یوسف خاں کمبل پوش کی طرح نواب کریم خاں کا ایک سفرنامہ، سیاحت نامہ کے نام سے شہرت کا حامل ہے۔نواب کریم نے ہندوستان کے درجنوں دیہات اور قصبوں کی سیر کی۔اس کے بعد انگلینڈ کے سفر پر روانہ ہوئے۔نواب کریم خاں نے یکم دسمبر ۱۸۳۹ء میں سفر کا آغاز کیا۔کلکتہ پہنچ کر وہاں اپنے والد کی جاگیر کے مقدمے کی پیروی کی۔ان کے والد کا نام نواب حسن علی خان تھا۔یہ ریاست جھجھر کے نواب تھے:''نواب حسن علی خاں جن کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں نواب کریم خاں لندن گئے تھے۔یہ نواب حسن علی خان جھجھر کے نواب نجابت علی خان کے بیٹے تھے۔''(۸۸)

ریاست جھجھر کی جاگیر کے مقدمے میں خاصی پیچیدگیاں تھی۔ یا پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے پیدا کر دی تھی۔ نواب کریم خاں کلکتہ میں کئی ایک سرکردہ انگریزوں اور وکیلوں سے ملنے کے بعد لندن روانا ہوئے تھے۔ ایک رائے یہ ہے کہ نواب کریم خان لندن بہادر شاہ ظفر کے مشورے سے گئے تھے۔ تاہم جھجھر سے کلکتہ تک سفر کے دوران نواب کریم خاں کئی ایک تاریخی مقامات اور واقعات کا ذکر کیا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت نواب کریم خاں نے سفر اختیار کیا اُس وقت ہندوستان کی مجموعی صورت حال انتظامی طور پر خراب تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاستوں میں مداخلت کر کے بے چینی پھیلائی ہوئی تھی تا کہ عوام نوابوں اور بادشاہوں کے خلاف ہو جائے۔ جگہ جگہ معرکے جاری تھے۔ اُوّدھ کی حکومت میں اس دوران کئی ایک واقعات رونما ہو چکے تھے۔ مگر نواب کریم خاں نے کسی بڑے واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ بس وہ چھوٹے موٹے واقعات کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ ایک مقام پر وہ دریا چنبل کا ذکر کرتے ہیں جس کی پیچ وخم دار چٹانوں کو انگریزوں نے کاٹ کا سرنگ یا درہ بنا کر دریا کے بہاؤ کو سیدھا کر دیا تھا۔ اس مقام کو نواب کریم خاں نے درہ ویرانہ لکھا ہے۔ سیاحت نامے میں اس طرح درج ہے کہ: ''اس وقت الیانِ سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر نے بہ لحاظ اس کے کہ ہر آئینہ آسائش و بہود دریا کی اور سب کام کے مقدم سمجھتے ہیں۔ پیچ دریا کے نقب دے کر تمام پتھروں کو باروت سے اُڑا دیا اور تا مدت واسطے درستگی راہ کے زرِ کثیر خرچ کر کر صورت گزاری رعایا کی کی۔'' (۸۹) نواب کریم خاں نے ایک پتھر کے بنے ہوئے قلعے کا ذکر کیا ہے جسے انگریزوں نے توڑ کر دوبارہ بنوایا تھا، یہ قلعہ دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان میں تھا۔ تاریخ ہندوستان میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم نواب کریم خان نے لکھا ہے کہ: ''قلعہ شاہ عالم بادشاہ کے چوالیس سن جلوسی میں صاحبان انگریز نے توڑ کر اس اسلوب کے ساتھ بنایا کہ اس کا نقشہ ہی اور ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آگے قابلِ بزم تھا۔ اب قابلِ رزم ہوا۔'' (۹۰) شاہ عالم بادشاہ کا دور ۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۱ء ہے۔ اس دوران میں انگریزں نے اس قلعے کی تعمیرِ نو کی تھی۔

ریاست اودھ میں ایک شیخ محمد علی حزیں نام کے بزرگ تھے۔ شیخ صاحب کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے: ''نواب شجاع بہادر کو لڑائی کا مشور مطلق نہ دیا بلکہ منع کیا کہ بگاڑ صاحبان انگریز سے حد بُرا ہے اور مصالحہ سر تا پا بھلا۔ زنہار اے فرزند سوائے صلح کے کچھ نہ کرنا اور لڑائی پر دھیان ہر گز نہ دھرنا کیوں کہ صلح میں حصول مراد ہے۔ اور جنگ میں فساد۔ غرض بعد ہنگامہ یکسر وہ عارف بے ریا سن گیارہ سے اسی میں بہشت نصیب ہوا۔'' (۹۱) نواب کریم خان نے آرائشِ محفل سے محمد علی حزیں والا اقتباس ہو بہو نقل کر کے لکھا ہے۔ آرائش محفل میں لکھا ہے کہ:

> مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ بہادر کو لڑائی کا مشورہ مطلق نہ دیا بلکہ منع کیا کہ بگاڑ صاحبان انگریز سے حد بُرا ہے اور مصالحہ سر تا پا بھلا۔ زنہار اے فرزند! سوائے صلح کے کچھ نہ کرنا اور لڑائی پر دھیان ہر گز نہ دھرنا کیوں کہ صلح میں حصول مراد ہے اور جنگ میں فساد۔ غرض بعد ہنگامہ یک سر وہ عارف بے ریا سن گیارہ سے اسی ہجری میں بہشت نصیب ہوا۔ (۹۲)

نواب شجاع الدولہ انگریزوں کے خلاف میر قاسم کی مدد کا ارادہ کر چکے تھے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ میں شاہ عالم بہادر شاہ بھی ساتھ تھے اس لیے اس جنگ کا نتیجہ ہندوستان کے مستقبل کے حوالے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی نکلا، نواب شجاع لدولہ کی جنگ کے حوالے سے جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ: ''۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے بکسر کے مقام پر ایک اور جنگ جیتی جس کے نتیجے میں دہلی کے نام نہاد بادشاہ کو انگریزوں کا دستِ نگر ہونا پڑا۔ اب وہ ان کا قیدی بن چکا تھا بنگال اور بہار میں انگریزوں کا تسلط بلاشرکت غیرے قائم ہو چکا تھا۔'' (۹۳) مذکورہ جنگ کے نتیجے کے حوالے سے مولانا نجم الغنی لکھتے ہیں کہ: ''اس فتح سے بڑے بڑے عمدہ نتیجے انگریزوں کے لیے پیدا ہوئے، نواب وزیر جو مدت سے گویا سلطنت کے مالک بنے ہوئے تھے وہ تو پست ہو گئے۔ اور انگریزوں کا حکم ہندوستان میں سب پر غالب ہو گیا۔'' (۹۴) جب جنگ بکسر میں نواب شجاع الدولہ کی شکست ہوئی تو اس کا اثر شیخ محمد علی حزیں نے اپنے دل پر لے لیا۔ اس لیے وہ شاہجہاں آباد سے بنارس چلے گئے اور وہاں پر وفات پائی اسی مقام پر ان کا مزار بھی ہے۔ جس کی وضاحت نواب کریم خاں نے یوں کی ہے کہ: ''چنانچہ یہ قصہ مشہور ہے۔ پھر بمقتضائے غیریت کے استقامت شاہجہاں آباد میں مناسب نہ سمجھی بنارس میں آ کر گوشہ نشین ہوا۔'' (۹۵)

اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کا جواز پیش کرتے ہوئے پہلے اس عہد کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کہ جس کے تحت پہلے پہل اردو سفرنامہ پروان چڑھا۔ نوآبادیاتی عہد پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان سے تجارت کرنے کا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کے بنایا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان سے تجارت کے میشن کا آغاز ۱۶۰۰ء ہی میں کر دیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں بھی ایسے قوانین موجود تھے کہ غیر ملکیوں کے دخلے پر نظر رکھی جا سکے۔ جب پہلا انگریز کپتان ولیم ہاکنس ۱۶۰۸ء ہندوستان آیا اور جہانگیر کے دربار سے تجارت کے اجازت نامہ حاصل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک ۱۶۰۰ء تا ۱۶۰۸ء کے عرصہ کا تعلق ہے تو انگریزوں نے مرکز سے نہیں بلکہ بندرگاہوں کے محافظ افسران سے عارضی تجارت نامہ حاصل کر رکھے تھے۔ پس منظری مطالعہ میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب انگریزوں کی تجارت کی پندرہ سالہ مدت ختم ہوئی ملکہ برطانیا نے ایک انگریز سر طامس رو کو باقاعدہ ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجا۔ سر طامس رو نے ایک طویل عرصہ قیام کے بعد تجارت کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں ساحلوں پر تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے بعد ہندوستان کے انتظام میں مداخلت کرنی شروع شروع کر دی، نوابوں اور راجاؤں نے اپنے ساتھ ملا یا لیا۔ جب مناسب موقع دیکھا تو خود ہندوستانی ریاستوں پر قبضہ کر کے حکومت کرنے لگے۔ ہندوستان کی مغلیہ حکومت مرکز میں اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ کسی بھی مقبوضہ ریاست کا قبضہ بزورِ شمشیر چھڑانے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ ہر سال دو سال بعد ایک نئی ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس طرح تقریباً ۱۶۱۵ء سے ۱۸۵۷

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جارہ داری رہی۔اس کے بعد اہل ہندوستان کو انگریز کا ایک نیا روپ دیکھنے کو ملا جس میں سارا مال و دولت انگریزوں کا ہو گیا اور ہندوستان والے ہر چیز کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ایک اندازے کے مطابق اہل ہندوستان ۳۳۲ تین سو بتیس سال انگریزوں کے غلام رہے۔نیز ایسٹ انڈیا کمپنی دور کے تاریخی واقعات کا جائزہ تاریخِ عجیب، تاریخِ یوسفی، سیر اُوّدھ اور سیاحت نامہ نواب کریم خاں کے سفرنامے ایسے ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں لکھے گئے ہیں۔مذکورہ سفرناموں میں ایسے تاریخی واقعات ہیں جو اس دور کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان تاریخی عناصر کا سیر حاصل مطالعہ کیا گیا ہے۔

ب: اردو سفر نامہ جنگِ آزادی کے بعد، سامراجی حکومتیں: سیاسی وسماجی تاریخ کا تقابلی مطالعہ

جنگ آزادی کے بعد لکھے گئے ایشیائی اردو سفرنامے میں کالا پانی، انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت، سیر ایران، سیر برہما، روم ومصر وشام، سیاحت امیری، امیر حبیب اللہ خان کا افغانستان، ۱۹۰۷ء کا جاپان، سفرنامہ بغداد از منشی محبوب عالم بھی ایسے سفرنامے ہیں جو نوآبادتی عہد میں لکھے گئے۔مگر ان سفرناموں میں جنگ آزادی کے تاریخی واقعات کا ذکر ہے وہاں پر تاریخی شعور کی تبدیلی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔اسی وجہ سے مذکور سفرناموں میں تاریخی عناصر موجود ہیں۔اس کے علاو روز نامچۂ سیاحت، از خواجہ غلام الثقلین، روزنامچہ با تصویر، سفرِ مصر وشام وحجاز از خواجہ حسن نظامی، مشاہداتِ کابل و یاغستان از مولوی محمد علی قصوری اور سرگزشتِ کابل از مولانا عبید اللہ سندھی، سیر حامدی از نواب حامد علی خان اور اسیرانِ مالٹا از حضرت مولانا سید حسین مدنی ایسے سفرنامے ہیں جو جنگِ عظیم اوّل سے تعلق رکھتے ہیں۔ان سفرناموں میں جنگِ عظیم اوّل کے تاریخی واقعات موجود ہیں۔سفرنامہ افغانستان از خواجہ حسن نظامی سیر افغانستان از سید سلیمان ندوی، رنگون سے فرار از اے حمید، ترکی میں دو سال از ڈاکٹر عبادت بریلوی، دجلہ از شفیق الرحمٰن اور بجنگ آمد اور بسلامت روی کرنل محمد خان ایسے سفرنامے ہیں جن میں نوآبادیاتی دور اور جنگِ عظیم دوم کے تاریخی حالات وواقعات موجود ہیں۔

۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔برطانوی سیاست دانوں کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ جنوبی ایشیا میں حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے جہاں بحری بیڑے کا ہونا ضروری تھا وہاں ہندوستان کی شمالی سرحدوں کے دفاع کا مضبوط ہونا بھی ضروری تھا۔اس کے بعد ہندوستان پر مستقل قبضے کی امید کی جاسکتی تھی۔یوں تو برطانیا کے پاس بحری بیڑا بھی تھا اور ہندوستان پر مضبوط گرفت بھی، مگر شمالی مغربی سرحد پر اس کا مضبوط دفاع موجود نہیں تھا۔اس لیے حکومتِ برطانیا نے ایران اور افغانستان کے ساتھ دوستی کے ذریعے اپنی خارجہ پالیسی کو پروان چڑھا رکھا تھا۔ایران کے

ساتھ دوستی میں یہ طے ہوا کہ حملہ کی صورت میں دونوں فریق سیاسی اور فوجی سطح پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی طرح کے معاہدے افغانستان کے ساتھ بھی ہوئے تھے۔

ہندوستان میں فرانسیسیوں اور پرتگیزوں کی تجارت ناکام ہوئی تو وہ دوسرے ممالک میں قسمت آزمائی کرنے کے لیے چلے گئے۔ یا پھر واپس اپنے وطن کو لوٹ گئے۔ خاص طور پر فرانسیسیوں نے انگریزوں کی طرح دوسرے ممالک پر قبضہ کر کے انھیں غلام نہیں بنایا۔ اور نہ ہی وہ ایشیائی ممالک کے رقبے کو تقسیم کر کے اس کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ انگریز تو ایشیائی ممالک پر قبضہ کر کے طویل عرصہ تک قیام پذیر رہنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے لیے نوآبادیوں کو تلاش کیا۔ انگریزوں کے قدم ہندوستان کی بندرگاہوں پر جم چکے تھے۔ جہانگیر کے بندرگاہوں کے حکمران مقرب خان کو انگریز سمجھ چکے تھے۔ کچھ تو انھوں نے رسم و راہ قائم کی اور کچھ رشوت سفارش سے کام چلایا تھا۔ جب ان کا قبضہ بندرگاہوں پر مضبوط ہو گیا تو وہ کسی بھی سمندری رستے سے آنے والے اجنبی پر دفاع کی آڑ میں حملہ کر دیتے تھے۔ جوں جوں انگریز ہندوستان آتے گئے اور یہاں کی سیاسی فضا کو سازگار پاتے گئے ان کے رویوں اور منصوبوں میں تبدیلی واقع ہوتی گئی۔ ہندوستانیوں کی سادہ مزاجی، اخلاقی پسماندگی، مذہبی تنزلی اور حکمرانوں کی عیاشیوں کو جب برطانیا کے عام انگریزوں نے دیکھا تو ہندستان پر تسلط قائم کرنے اور قبضہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران ۱۸۵۷ء تک پورے ہندوستان پر صرف اس طرح قابض ہوئے کہ اہم اہم نوابوں، صوبیداروں اور بادشاہوں کو انھوں نے فریب، دھوکہ دہی اور رشوت کے ذریعے اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ محقق کی ذاتی رائے ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے چند مہروں کو اپنی گرفت میں کر کے پورے ہندوستان پر حکومت کرنا ممکن بنا لیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانی افرادی قوت، دولت اور جاگیر اہل ہندوستان کی انھی پر استعمال کر کے انھیں غلام بنا لیا تھا۔ اہل ہندوستان کو انگریز ہندوستان سے جاتے ہوئے نظر نہ آئے اور اپنی محکومی یقینی نظر آئی تو ہندوستان والوں نے:

> ۱۸۵۷ء کو بغاوت کا شعلہ بڑکا دیا۔ حکومت حفظ ماتقدم میں چوکس ہوگئی۔ اس کے باوجود پورے یوپی، دہلی اور جزوی طور پر بہار اور وسطی ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہ محض ایک فوجی بغاوت نہ تھی بلکہ ان علاقوں میں انگریزوں کے خلاف ایک عوامی بغاوت تھی۔ بہادر شاہ عظیم مغل خاندان کا آخری حکمران، ایک کمزور بوڑھا اور شاعر مزاج آدمی تھا۔ کچھ لوگ ابھی تک اسے شہنشاہ کہتے تھے۔ بغاوت ہندوستان کی جنگِ آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ (۹۶)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہاں ہندوستان کے اندرونی معاملات میں گہرا عمل دخل رکھتی تھی وہاں اس کی خارجی صورتِ حال پر بھی گہری نگاہ تھی۔ جس ملک سے کمپنی کو خطرہ لاحق ہوتا تھا اس پر پیشگی حملہ کر کے نقصان پہنچا کر کمزور کر دیتی تھی۔ اردگرد کے ممالک پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا زور بڑھ رہا تھا۔ ہندوستان کے ہمسایہ ملکوں میں ایران اور افغانستان اہم ملک

تھے۔ انگریزوں نے پہلے افغانستان، جو ابھی تک ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا، قبضہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اسی منصوبہ سازی کے تحت: ''۱۸۳۹ء میں ہندوستان میں موجود انگریزوں نے کسی اشتعال انگیزی کے بغیر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ ان دنوں افغانستان کی سرحدیں، برطانوی ہند کی سرحدوں سے بہت دور تھیں۔ درمیان میں پنجاب کی سکھ ریاست موجود تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز اپنے سکھ اتحادیوں کے ساتھ کابل کو پیش قدمی کر گئے تھے۔ لیکن افغانوں نے بہر حال انتقام لے لیا۔''(۹۷) انگریزوں اور افغانوں کے درمیان: ''تیسری افغانستان جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں افغانستان مکمل طور پر خود مختار ہو گیا۔''(۹۸) اسی طرح مشرقِ بعید میں اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے:

> ''برما کے ساتھ انگریزوں کی تین جنگیں ہوئیں۔ ہر جنگ میں انگریزوں نے مزید کچھ علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ پہلی جنگ ۲۶۔۱۸۲۴ کے دوران آسام انگریزوں کی عملداری میں آیا۔ ۱۸۵۲ء میں دوسری جنگ ہوئی جس میں جنوبی برما پر بھی ان کا تسلط قائم ہوا گیا...... اختتام ۱۸۸۵ میں آیا۔ اسی سال برما کی تیسری جنگ ہوئی اور پورا برما انگریزوں کی ہندوستانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔''(۹۹)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی مشرقی ایشیا پر بھی گہری نظر تھی۔ چین ایک بڑا ملک تھا ہندوستان کی طرح اُس پر بھی قبضہ کرنا آسان کام نہ تھا لہٰذا بندرگاہوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے: ''چین اور پراچانیا کے درمیان تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری تھی۔''(۱۰۰) جب انگریزوں کو چین کے سواحل اور چین کے اندر اپنے مقاصد حاصل ہوئے تو دوسرے سامراجی ممالک بھی چین سے اپنے فوائد حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ: ''مشرقِ بعید میں چین کو یورپی طاقتیں ایک کے بعد دوسری مراعات حاصل کر کے کتر رہی تھیں۔ صرف جاپان ایسا ملک تھا جو یورپ کے سامنے ڈٹ گیا تھا اور ڈٹا رہا۔''(۱۰۱) مشرقِ بعید کے ممالک کی صورت حال بھی زیادہ تر انگریزوں کے قابو میں تھی۔ جس کے لیے نہرو لکھتے ہیں کہ:

> مشرقی ایشیا کے انتہائی جنوب میں یورپی طاقتیں مختلف علاقے جذب کرتی جا رہی تھی فلپائن کے جزیرے ابھی تک سپین کے قبضے میں تھے۔ پرتگیزوں کو انگریزوں اور ولندیزوں نے مشرق سے تقریباً نکال باہر کیا تھا۔ ولندیزوں نے ویانا کانگریس کے بعد جاوا اور کچھ دیگر جزیرے واپس لے لیے تھے۔ انگریزوں آبنائے ملایا اور سنگاپور تک پھیل چکے تھے۔ انام، سیام اور برما ابھی تک آزاد اور خود مختار تھے اگرچہ وہ کبھی کبھار چین کو خراج ادا کر رہے تھے۔ لیکن ان کی حیثیت باجگزاروں جیسی نہیں تھی۔(۱۰۲)

مشرقِ بعید کے ممالک کے بارے میں جواہر لال نہرو کا ایک اور بیان یہ ہے کہ: ''ترکی کو اب یورپ کا مردِ بیمار کہا جا رہا تھا۔ ایران نام کی حد تک آزاد تھا۔ اس پر انگلستان اور روس کا غلبہ تھا۔ پورا جنوب مشرقی ایشیا یعنی برما، ہند چینی، ملایا، جاوا، سماٹرا، بورنیو اور فلپائن اقوامِ متحدہ کے تسلط میں تھا۔ البتہ سیام کا کچھ علاقہ خود مختار تھا۔''(۱۰۳)

اس طرح مجموعی طور پر شمالی، جنوبی اور مشرقِ بعید کی صورت حال یہ تھی کہ زیادہ تر ایسٹ انڈیا کمپنی قابض تھی۔ جن علاقوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی قابض نہیں تھی۔ ان ممالک کو انگریزوں کے سامنے سر اُٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ جہاں تک

ہندوستان کے اندرونی حکومتوں کا تعلق ہے تو اہل ہندوستان اور خاص طور پر مسلمانوں کی حکومتیں ایک ایک کر کے ختم ہوتی چلی گئی اسی طرح جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی مرکزی حکومت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ویسے بھی مغلوں کی حکومت دہلی تک محدود تھی وہ بھی شاہ عالم بہادر شاہ کے دور سے مفلوج نظامِ حکومت چلا آ رہا تھا، پہلے سورت بندرگاہ اور گجرات پر قبضہ ہوا، پھر نظامِ دکن گیا۔ حکومت اُودھ جاتی رہی۔ میسور کی حکومت چھن گئی۔ دہلی کی حکومت اختتام پذیر ہوئی۔ انگریز پورے ہندوستان میں آزادانہ دندناتے پھرے۔ جنگ آزادی میں مسلمان جس جذبے سے ہر محاذ پر سے اُٹھے تھے امکان تھا کہ وہ مٹھی بھر انگریزوں اور مرہٹوں کو شکست دے سکتے تھے۔ مگر اُن کے پاس وقت کی ضرورت کے مطابق جدید اسلحہ نہیں تھا۔ جدید اسلحہ کے بارے میں سوچنے والے سراج الدولہ، سلطان ٹیپو، نواب محمد علی خاں وغیرہ دنیا سے چلے گئے تھے۔ پیچھے بچ جانے والی حکومتوں میں کچی مٹی کا مہرے تھے جنھیں کبھی بھی ٹھیس لگے تو ختم ہو جائیں مراد یہ کہ حکمران کمزور دل تھے جو انگریزوں کے سامنے ٹھہر نہ سکتے تھے۔ ہندوستان میں جنگ کی جو فضا بنی ہوئی تھی۔ اس کے نتائج کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ غوث علی شاہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:

> ایک مجذوب شتر خانہ کے قریب رہتے تھے ہم بھی ان کے پاس جایا کرتے تھے ایک دن گوروں کا رسالہ ادھر سے گذرا ایک افسران میں سے جدا ہو کر میاں صاحب کے پاس آیا اور گلے لگ کر رونے لگا پھر دو چار باتیں کر کے چل دیا ہم نے پوچھا کہ میاں صاحب یہ کیوں روتا تھا اور آپ سے کیا کہتا تھا۔ فرمایا کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک بھید ہے ہم نے کہا یہ تو ہم خود بھی جانتے ہیں کہ ایک بھید ہے لیکن آپ بتلائیں کہ وہ بھید کیا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ افسر کہتا ہے کہ اس رسالہ کے قتل کا حکم ہوا ہے ہم میں سے بہت لوگ مارے جائیں گے۔ اور بہت کشت وخون ہوگا آپ دعا کریں میں نے کہا کہ حکم قطعہ ہو چکا ہے اب دم مارنے کی جگہ نہیں راضی برضا ہو اس وقت تک بالکل امن وامان تھا چند روز بعد ہم وہاں سے بابری چلے گئے۔ اس سے ایک مہینہ بعد یکا یک غدر شروع ہو گیا۔ (۱۰۴)

ہندوستان کے صوفیا کی قطعی یہ مرضی نہیں تھی کہ انگریز کے ساتھ جنگ کی جائے۔ اہل نظر کو ہندوستان کے روسا، وزرا، عمائدین اور دیگر بادشاہوں کی صورت حال کے بارے میں علم تھا کہ ان کے پاس کتنے وسائل ہیں اور وہ کتنی دیر تک میدانِ جنگ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندے عوام الناس کی ناحق خون ریزی کے خلاف تھے۔ لیکن انگریزوں کو جنگِ آزادی یا بغاوت برپا کرنے کا شک دینی اور مذہبی لوگوں پر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے مذہبی لوگوں کو پکڑ پکڑ کر پھانسیاں دی۔ اور جیلوں میں عمر بھر کے لیے ڈالا۔ جنگِ آزادی کی تازہ واقعہ کے بعد انگریزوں نے جہاں دوسرے مذہبی رہنماؤں کو گرفتار کیا اور سزائیں دی، وہاں پر انھوں نے غوث علی شاہ کو بھی پوچھ گچھ کے لیے گرفتار کیا، تذکرہ غوثیہ میں لکھا ہے کہ: ''غدر فرو ہوا تو مجرموں کو انگریزوں نے پھانسی دینی شروع کی کہ ہم کو بھی ایک انگریز نے جو تحقیقات کرتا تھا بمقام شاملی

طلب کیا اور پوچھا کہ جب یہاں لڑائی اور تحصیل وتھانہ پر لوگوں نے یورش کی تو تم کہاں تھے۔" (۱۰۵) غوث علی شاہ کی نجات بھی قدرت کا ایک معجزہ کی صورت میں پیش آئی۔ لیکن انگریزوں کو کسی بھی آدمی کے خلاف کوئی سی دوشہادتیں درکار تھی جو ہندوستان میں آسانی سے مل جاتی تھی۔ غوث علی شاہ لکھتے ہیں کہ:

ہم نے کہا کہ صاحب گھبرانے کی بات یہ ہے کہ آپ حاکم ہیں آپ نے بلایا ہم فوراً دوڑے چلے آئے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا دوسرے یہ اندیشہ ہے کہ دیکھئے آپ کیا حکم دیں۔ بولا کہ سنو صاحب یہ ظلم نہیں کرتا اور خواہ مخواہ کسی کو نہیں ستاتا جس کی نسبت تمہارے بھائی بند قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ یہ مجرم ہے ہم اُس کو سزا دیتا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ اگر جھوٹ بولا تو یہ عذاب ان کے سر پر ہوگا۔ (۱۰۶)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے سلسلے میں غوث علی شاہ کا بیان تو شاملی میں قلم بند کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی ہندوستان عوام میں خوف وہراس پھیلانے کے لیے انگریزوں نے اس طرح کے اقدامات کیے کہ یہ دوبارہ اس طرح کی بغاوت نہ کر سکیں۔ اسی طرح پوچھ تاچھ (انکواری سنٹر) کے لیے راول پنڈی میں مرکز قائم کیا گیا تھا۔ جس میں زیادہ تر مذہبی لوگوں کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ: "چمبرلین صاحب اس داروگیر وہابیوں کے کمشنر ہو کر راول پنڈی۔ اس کا صدر مقام ہوا۔ چنانچہ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولتِ انگلشیہ کے ہیں واسطے خدمت گریندگری وہابیوں کے دہلی سے راول پنڈی طلب ہوئے۔" (۱۰۷) انگریزوں کے خلاف جہاں کہیں بغاوت سر اُٹھاتی تھی، طاقت کے زور زبردستی سے ختم کر دی جاتی تھی۔ بغاوت کے سلسلے میں علما کو سزائیں دینے کے لیے ایک انگریز جو بڑا ظالم تھا اس کام کے لیے مقرر کیا گیا۔ ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں کہ: "ایک خاص محکمہ اسی داروگیر کے لیے بنایا گیا تھا کہ جسے چاہتا پکڑ بلاتا اور جو معقول رشوت اور سفارش نہ لاسکتا، اسے شدید سزائیں دے سکتا تھا۔ چمبرلین اس محکمے کا کمشنر، راول پنڈی مستقر تھا۔ اس نے بڑے ظلم کیے۔ مولوی نذیر حسین تک کو دہلی سے بازپرس کے لیے، پکڑ بلایا تھا۔ مگر قضائے الٰہی سے وہ خود مر گیا۔ اور اسی کے ساتھ یہ محکمہ بھی معدوم ہو گیا۔" (۱۰۸) آخر کار خود کمشنر راول پنڈی بھی ایک مقابلے میں زخمی ہوئے جن کا ذکر مولانا جعفر تھانیسری نے یوں کیا ہے کہ: "مجاہدوں نے بھی تمنائے حصولِ شہادت دادِ شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھائے۔ غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ ہوتی رہی خود چمبرلین صاحب مجروع شدید ہوئے۔" (۱۰۹) سید ہاشمی فرید آبادی نے سفر نامہ کالا پانی سے ہو بہو اقتباس تاریخِ ہندوستان میں درج کیے ہیں۔ جو تاریخ مسلمانانِ ہند میں موجود ہیں۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ خود سفر نامہ کالا پانی کی تاریخی حیثیت معتبر ہے۔

جنگِ آزادئ ہندوستان کو انگریزوں نے غداری یا بغاوت کا نام دیا تھا۔ انھیں جو کوئی نواب، راجا، مہاراجا، دولت مند نظر آیا اُسے عتاب کا نشانہ بنایا۔ مولانا جعفر تھانیسری کہتے ہیں کہ: "۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے اور نواب اور زمیندار، مولوی وڈپٹی کلکٹر منصف وصدر الصدور رسالہ دار وصوبہ دار وجمعدار وہاں قیدی ہیں۔" (۱۱۰) ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد

شدید لوگوں کو: ”ظالمانہ طریقے سے اسے دبایا گیا۔ اتنا جبر و تشدد کیا گیا کہ اب وہ کسی احتجاج کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے تھے۔ انھیں از سرِ نو زندہ ہونے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت تھی۔“(۱۱۱) مولانا جعفر کے سفرنامہ کالا پانی میں تاریخی واقعات کا ایک تسلسل ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں اہم اہم تاریخی واقعات قلم بند کیے جا گئے ہیں تا کہ خاص موضوع پر بحث ہو سکے۔ مولانا جعفر تھانیسری نے اپنے سفرنامے میں اس بات کا ذکر کیا ہے ایک وائسرائے ایلی جن کی ہندوستان میں موت واقع ہو گئی۔ اس کی وجہ مصنف نے جو بتائی وہ یوں ہے کہ: ”لارڈ ایلی جن صاحب وائسرائے ہند چمبے کے پہاڑ پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مر گئے ہندوستان بے گورنر ہو گیا۔“(۱۱۲) ممکن ہے کہ لارڈ ایلی جن کی موت بغاوت کے صدمے کی وجہ سے ہوئی ہو مگر اوکسفورڈ کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایلی جن کی موت دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اوکسفورڈ کی تاریخ کا اقتباس زیرِ نظر ہے کہ:

> Lard Canning's successor, the Earl of Elgin and Kincardine, commonly called Lard Elgin, Took Over Charge in March 1862 Previous Service as Governor- Grneral of Canada and Special Envoy to China seemed to mark him as a person well qualified to conduct the government of India. But in Novermber 1863 he died of heart disease, and was buried at Dharmasala in the Panjab. The only noticeable event of his brief term of office was the Umbeyla Campain, on the North- western frontier, rendered necessary by an outburst of Muhammadan fanaticism to the west of the Indus. The Expeditionary force met with strenouous resistance, and at one time was in danger of destuction, but vigorour action brought the campain to a tolerabaly satisfactory concludion before the close of 1863. the government was carried on by two action officers until the appointment of a permanent succeor could be arranged.(۱۱۳)

علمائے ہند کا یہی قیاس ہے کہ لارڈ ایلی جن کو دل کا دورہ اس وجہ سے پڑا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں بڑی

شدید بغاوت ہوگئی تھی۔ اس بغاوت کو پھیلانے اور ہوا دینے میں مولانا جعفر تھانیسری کا بڑا عمل دخل تھا۔ لارڈ ایلی جن کی موت کی وجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اس کی موت سے علماء کو خوشی کا احساس ضرور ہوا ہوگا۔ مولانا جعفر تھانیسری کی مخبری کس نے اور کس طرح کی اس کی وضاحت جعفر تھانیسری نے یوں کی ہے کہ:

> ایسے نازک وقت میں ۱۱، دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۲۸ ماہ جمادالثانی ۱۲۸۰ ہجری کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمی غزن خان ایک ولایتی پٹھان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک بڑی لمبی چوڑی اور جھوٹی کیفیت خیر خواہانہ کے ساتھ بحضور صاحب، ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کہ کہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدوں کے ساتھ سرحد پر ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کو محمد جعفر نمبر دار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ (۱۱۴)

غزن خان کی بیان کی ہوئی کیفیت کو ڈپٹی کمشنر نے سنا تو: ''بذریعہ تار برقی ضلع انبالہ کو جس کی حدودِ ارضی کے اندر شہر تھانیسر واقع ہے خبر بھیج دی۔'' (۱۱۵) مولانا جعفر تھانیسری کے گرفتاری اور گھر کی تلاشی کے لیے کرنال سے کمشنر اور پولیس ان کے گھر رات کے وقت آئے۔ تلاشی کے بعد ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط اور دوسرے کاغذات پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ اس واقعہ کی وضاحت تاریخ ہندوستان میں اس طرح ہے کہ: ''دسمبر سنہ ۶۳ میں سوار پولیس کے ایک پٹھان کی مخبری سے منشی محمد جعفر کی خانہ تلاشی ہوئی اور ایسے خطوط پکڑے گئے جن سے ثابت ہوا کہ وہ سرحد کے مجاہدین کو باقاعدہ رُپیہ اور آدمی بھیجتے رہتے ہیں۔ جعفر قصبہ تھانیسر (ضلع انبالہ) کے سرکاری نمبردار اور ضلع کے عرضی نویس تھے۔'' (۱۱۶)

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان والوں کو چن چن کر سزائیں دی گئی۔ بغاغی ثابت ہونے والوں کو سزائے موت یا پھر عمر قید دی جاتی تھی۔ وہ بھی مختلف جزیروں میں۔ بہت سارے قیدی کالا پانی، ملایا، اور آسٹریلیا بھیجے گئے۔ ان عوام الناس کو دی جانے والی ان سزاؤں کا بظاہر تو کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ البتہ جزیرہ انڈومان میں ایک افغان نے لارڈ میو کا قتل کر دیا تھا۔ اسی جزیرے میں مولانا جعفر تھانیسری بھی موجود تھے۔ جو اس وقت تک قید پوری کرنے کے بعد کمشنر صاحب کے روزمرہ کے امور کو ترتیب دیتے تھے۔ لارڈ میو کے قتل کا واقعہ مولانا جعفر تھانیسری کا چشم دید واقعہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''لارڈ صاحب معہ پرائیویٹ سکرٹری آہستہ چلتے جاتے تھے اس وقت اس گاڑی کی آڑ میں ایک آدمی مثل شیر کی کود کر لارڈ صاحب کو دو زخم کاری ایک چھری سے ایسے لگائے کہ لڑکھڑا کر لارڈ صاحب سمندر میں جا پڑے۔'' (۱۱۷) لارڈ میو کے قتل کے واقعہ کو اوکسفورڈ نے من عن تو بیان نہیں کیا مگر یہ اہم نکتہ ضرور بیان کیا ہے کہ ایک علاقہ غیر کے ایک قبائلی مسلمان نے لارڈ میو کو قتل کر دیا جس کی وضاحت یوں ہے کہ:

> The administration of jails and the penal settelment at the andman Islands was one of the meny subjects which

engaged lord mayo 's untiring energy. When inspeeting the eonviet settlement at the Andomanhe unfortunately prolonged his visit until after dark. Just as he was stepping into the boat a Muhammadan frontier tribesman. who had been transported for a blood- feud murder, spring out of the bushes upon the Viceroy's back and stabbed him to death, on January 24, 1872. The murderer had determined to kill some high Eurropeon Official and was proud of his sucess in slaying the Viceroy. Lard Mayo was dead when brought on board the frigate. The crime excited universal horror in India and Europe.(۱۱۸)

جنگِ آزادی کے بعد کسی انگریز افسر کا یہ پہلا قتل تھا جو کسی ہندوستانی نے کیا تھا۔ لارڈ میو کے قتل کے بعد ہندوستانیوں کے حوالے سے انگریزوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی جنگ کے بعد مسلمانوں کی برائے نام حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مغلوں کی سلطنت کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ایک پسماندہ قوم بن کر رہ گئے۔ تاہم اس ناامیدی کی فضا میں امید کی کرن باقی تھی۔ جنگِ آزادی سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے تحفظ کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اے ہیوم، انگریز کی سربراہی میں ایک سیاسی جماعت کانگریس قائم کی۔ بڑی بڑی سیاسی شخصیات یورپ میں قانون کی تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ اسی بنا پر وہ سیاست میں بڑھ چڑھ کر آتے آ رہے تھے۔ جدید تعلیم حاصل کر کے حکومت میں اعلیٰ مقامات حاصل کر رہے تھے۔

جنگِ آزادی کے بعد ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کی حکومت براہ راست ملکہ برطانیا کی حاکمیت میں چلی گئی۔ اس طرح ہندوستان پر انگریز کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ برطانوی سیاست دانوں کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ جنوبی ایشیا میں حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے جہاں بحری بیڑے کا ہونا ضروری تھا وہاں ہندوستان کی شمالی سرحدوں کے دفاع کا مضبوط ہونا بھی ضروری تھا۔ اس کے بعد ہندوستان پر مستقل قبضے کی امید کی جا سکتی تھی۔ یوں تو برطانیا کے پاس بحری بیڑا بھی تھا اور ہندوستان پر مضبوط گرفت بھی، مگر شمالی مغربی سرحد پر اس کا مضبوط دفاع موجود نہیں تھا۔ اس لیے حکومتِ برطانیا نے ایران اور افغانستان کے ساتھ دوستی کے ذریعے اپنی خارجہ پالیسی کو پروان چڑھایا۔ ایران کے ساتھ دوستی میں یہ طے ہوا کہ ایک دوسرے پر حملہ کی صورت میں دونوں فریق سیاسی اور فوجی ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی طرح کے معاہدے افغانستان

کے ساتھ بھی ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی انگریز حکومت کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔ مگر افغانستان کے معروضی حالات ایسے نہیں تھے کہ ہندوستان زیادہ دیر تک افغانستان کے معاملات میں دخیل رہے۔ کیوں کے بے چین اور ہر وقت جنگ و جدل میں مصروف رہنے والی قوم کے ساتھ اس طرح کا نباہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔

۱۸۶۴ء میں انگریزی حکومت کے مفاد کی تکمیل کی خاطر محمد حسین آزاد نے وسط ایشیا کا سفر اختیار کیا۔ حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین کا مذکورہ سفر جاسوسی کے مقاصد پر مبنی تھا۔ یہ سفر اگر سفارت کی بنیاد پر ہوتا تو اس کا ذکر تاریخ میں وضاحت کے ساتھ کیا جاتا۔ وسط ایشیا کے سفر پر انگریزوں کی جانب سے پنڈت من پھول، محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش اور کرم چند نند رام شامل تھے۔ سفر کے اس وفد کے سربراہ سرارنلڈ ٹوئین بی تھے۔ چوں کہ سفر کے تحریری حالات و واقعات مولانا محمد حسین آزاد سے منسوب ہیں اس لیے وسط ایشیا کی سیاحت کے حوالے سے انہی کے نام سے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ عام طور پر تو سفر کے دوران بہت سے سماجی واقعات کا ذکر موجود ہے مگر یہاں محمد حسین آزاد کے قلم سے لکھے گئے تاریخی حالات و واقعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

مولانا محمد حسین کا سفرنامہ، انیسویں صدی میں ''وسط ایشیا کی سیاحت'' آغا محمد اشرف نے مرتب کیا ہے۔ زیر مطالعہ سفر نامہ چوں کہ مرتبہ ہے اس لیے مولانا محمد حسین کے حالات و واقعات آغا محمد اشرف کے نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ افغانستان کا جغرافیہ بہت ہی پیچیدہ نوعیت کا ہے۔ افغانستان کی ایک تنگ پٹی ہے۔ اس کے بارے میں مصنف کی رائے ہے کہ: ''چینی ترکستان، جو اب چین کا علاقہ ہے اور سن کیانگ (نیا صوبہ) کہلاتا ہے۔'' (۱۱۹) افغانستان کے شمال میں روس، مغرب میں ایران اور مشرق میں پاکستان واقع ہے۔ اس کے علاوہ چین کے علاقے کی طرف سے: ''سو (۱۰۰) کلو میٹر تک پٹی سنکیانگ سے ملتی ہے، جو کمیونسٹ چین کا حصہ ہے۔'' (۱۲۰) دراصل یہاں پر افغانستان کے جغرافیائی حالات بیان کرنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ سفرنامے کے تاریخی عناصر بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کے محلِ وقوع پیش کیا جائے۔

مولانا محمد حسین آزاد جب وسط ایشیا کے سفر پر گئے تو اُس وقت وسط ایشیا کے: ''تمام علاقے پر روس کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن روسی اقتدار شمال میں بحیرہ آرل سے ٹکراتا ہوا دریائے سیحو کو عبور کر چکا تھا۔'' (۱۲۱) مولانا محمد حسین آزاد کو افغانستان سے گزر کر وسط ایشیا پہنچنا تھا۔ اس لیے وہ افغانستان کے سیاسی حالات سے بھی آگاہ تھے۔ جس وقت وہ افغانستان پہنچے تو امیر شیر علی افغانستان کا بادشاہ تھا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے: ''افغانستان کے بادشاہ امیر دوست محمد خاں کا ۱۸۶۳ء میں جب انتقال ہوا ہے تو جنازے کو ان کے سولہ بیٹوں نے کندھا دیا تھا۔'' (۱۲۲) افغانستان کا سابقہ بادشاہ دوست محمد، موجودہ بادشاہ امیر

شیر علی کا والد: ''۶ رجون ۱۸۶۳ء کو دوست محمد خان فوت ہو گیا۔ اور ہرات میں دفن ہوا۔'' (۱۲۳) افغانستان کے تاریخی حالات و واقعات کے پیشِ نظر انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت میں درج ہے کہ: ''عبدالرحمٰن نے کابل پر چڑھائی کر دی اور مارچ ۱۸۶۶ء میں امیر شیر علی کو کابل سردار عبدالرحمٰن کے حوالے کرنا پڑا، عبدالرحمٰن نے کابل فتح کرتے ہی اپنے باپ سردار افضل خاں کو قید سے نکالا اور ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن قسمت نے ایک بار پھر پلٹا کھایا امیر شیر علی دوبارہ کابل کے تخت پر قابض ہو گئے۔'' (۱۲۴) مذکورہ حوالہ میں لکھا ہے کہ امیر شیر علی دوبارہ کابل کا حکمران بن گیا۔ حقیقت میں اس کے حکمران بننے کے لیے اُسے دوبارہ خاصی تگ و دو کرنی پڑی۔ تاہم جب امیر شیر علی کے بھائی:

> عبدالرحمان کو بخارا میں اپنے چچا کی حکومت کے امور میں لاپروائی کی اطلاع ملی تو بخارا سے کمک لے کر دریائے جیحوں کو پار کیا اور شیر علی خان کے وزرا وغیرہ کو زر دے کر اپنے ساتھ ملایا وزیر محمد رفیق خان ان دنوں شیر علی خان سے ناراض تھا اور انگریزی علاقے میں بھاگ کر محمد افضل خان سے مل گیا تھا۔ جس وقت ان دونوں کو عبدالرحمان کے شمالی علاقوں پر قبضے کی اطلاع ملی تو ہندوستان سے روانہ ہوئے۔ اعظم خان اور عبدالرحمان نے ایک متحدہ فوج تیار کر کے کابل پر حملہ کیا۔ (۱۲۵)

عبدالرحمان خان اور اعظم خان ایک کے بعد ایک شہر پر قبضہ کرتے جا رہے تھے جیسا کہ کابل پر حملہ کیا تو:

> امیر شیر علی کے بیٹے حاکم کابل نے ان کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور کندھار کی طرف بھاگ گیا۔ اور عبدالرحمان اور اس کا چچا اعظم خان ۱۸۶۵ء میں کابل کے اندر داخل ہو گئے۔ چند دن کے بعد انھوں نے جلال آباد پر قبضہ کر لیا۔ یہ سن کر امیر شیر علی خان نے تمام دیوانگی اور لاتعلقی چھوڑ کر فوراً فوج تیار کی اور عبدالرحمان کے مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا۔ شیخ آباد کے مقام پر شیر علی نے سخت جنگ کی مگر اس کے ساتھی باغیوں سے جا ملے۔ (۱۲۶)

محمد حسین کی سیاحت کے دوران افغانستان میں خانہ جنگی کی صورت حال تھی۔ افغانستان کی عوام آئندہ پیش آنے والے واقعات سے باخبر تھے۔ دراصل جنگ کرنے والے فریقین اپنی حکمتِ عملی کو خفیہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ علانیہ کاروائی کرتے تھے جس کی وجہ سے کسی بھی قسم کی خبر سے عوام کا باخبر ہونا ممکن تھا۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء کی بات ہے کہ: کابل کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں سردار عبدالرحمٰن خاں کے حملے کی افواہ شدت سے گشت کر رہی تھی۔ (۱۲۷) کابل شہر پر قبضہ کرنے کے بعد اعظم خان نے آگے بڑھ کر قندھار پر بھی قبضہ کر لیا اس وقت: امیر شیر علی خان ہرات گیا اور وہاں سے ۱۸۶۷ء میں کابل پر حملہ کر دیا۔ مگر عبدالرحمان نے اسے شکست دی اور پھر ہرات گیا۔ اس جنگ کے دو ہفتے بعد محمد افضل خان کابل میں فوت ہو گیا۔ اور اس کی جگہ اس کا سگا بھائی محمد اعظم خان بادشاہ بنا مگر وہ محمد افضل خان کی طرح نیک دل نہیں تھا۔ (۱۲۸) افضل خان کی وفات کے بعد عبدالرحمان نے اپنی مہم جوئی روک دی۔ یہی وجہ ہے کہ شیر علی خان نے اعظم خان سے کابل چھین لیا اور دوبارہ افغانستان کی بادشاہت حاصل کر لی۔ اس دوران امیر شیر علی کا جھکاؤ ہندوستان کی انگریز حکومت کی طرف زیادہ ہو گیا

تھا۔ حالاں کہ امیر مقرر ہونے کے بعد امیر شیر علی روس کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ امیر شیر علی کا یہ عمل انگریزوں کو ناگوار گزرا تھا۔ جس کے باعث آئندہ شیر علی کو بھی انگریزوں کی طرف سے نقصان پہنچانے کی حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔

افغانستان کے حالات کے بعد ترکستان کے حالات قابلِ ذکر ہیں۔ کیوں کہ مولانا محمد حسین آزاد وسط ایشیا میں خاص طور پر ترکستان کے سفر پر گئے تھے۔ اس عرصے میں روس کی فوجیں ترکستان کا دارالحکومت تاشقند فتح کر چکی تھیں۔ خوقند پر قبضہ کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہی تھیں۔ ترکستان کا امیر خدایار خاں کم عمر تھا۔ اس لیے اسے حکومت کا تجربہ بالکل نہیں تھا عوام پر ظلم و ستم کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے عوام بیزار تھی، یہی وجہ ہے کہ: ''۱۸۶۳ء میں عوام نے ان کے خلاف بغاوت کر دی اور خدایار خاں کو بخارا بھاگ کر پناہ لینی پڑی۔ دو سال بعد امیرِ بخارا نے خوقند پر فوج کشی کی اور خدایار خاں تیسری مرتبہ ۱۸۶۵/۱۳ء کو خوقند کا امیر بنا دیا۔'' (۱۲۹) اندرونی لڑائیوں اور بغاوت کو دیکھتے ہوئے: ''۲۳ رمئی ۱۸۶۳ء کو زارِ روس کی فوجوں نے ایک مہینہ اور دو دن تک تاشقند کا محاصرہ کرنے کے بعد اسے فتح کر لیا۔'' (۱۳۰) وسط ایشیا کی جو تاریخی صورت حال مولانا محمد حسین آزاد کے سفر نامے میں بیان ہوئی ہے اس کی رو سے تاریخِ وسط ایشیا کا زیرِ مطالعہ اقتباس یوں ہے کہ:

> خوقند میں سلمان قل جس نے نصر اللہ کے زمانے میں قبضہ کر لیا تھا اسے خفیہ طریقے سے قتل کروا دیا۔ اور حکومت محمد علی کے پوتے خدایار کو دے دی لیکن خدایار کو لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ کسی جنگ سے واپسی پر جب خدایار قوقند پہنچا تو دروازے بند پائے۔ اس کی غیر حاضر میں اس کا بھائی ملا خان قابض ہو گیا تھا۔ مظفر الدین قوقند کو فتح کرنے کے بعد شہر سے روانہ ہوا اس کے حامیوں نے ملا خان کو مار ڈالا اور خدایار کے چھوٹے بھائی شاہ مراد کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن مظفر الدین نے پھر خدایار کو بٹھا دیا۔ اس قضئے کا انجام یہ ہوا کہ قوقند کی ریاست مزید دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ (۱۳۱)

مولانا محمد حسین آزاد کو ان کے سفر کے دوران جس اہم صورت حال مشاہدہ ہوا، اس کا ذکر تاریخِ وسط ایشیا کے مصنف نے یوں کیا ہے کہ: ''بقول مولانا محمد حسین آزاد امیرِ بخارا کی سلطنت کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کا زوال اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہاں بھی ویسا ہی منظر سامنے تھے۔'' (۱۳۲)

مولانا محمد حسین آزاد نے افغانستان اور وسط ایشیا کے حالات کا جو مجموعی خاکہ کھینچا ہے اس سے اگرچہ پور تصوریر سامنے نہیں آتا مگر تاریخ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات و واقعات میں مولانا صاحب نے سفر کیا تھا وہ بڑے مشکل حالات تھے۔ سفر کی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ افغانستان کی سیاسی اور معاشرتی صورت حال کے بعد عرب کی صورت حال بھی اردو سفر نامے کا حصہ ہے۔

عرب کی سر میں مسلمانوں کے لیے بہت ہی مقدس ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا گھر خانہ کعبہ ہے۔ اللہ کے آخری رسولؐ کا روزہ مبارک ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار مقامات ایسے ہیں جو قبر کی مٹی سے لے کر خانہ کعبہ کے غلاف اور مطاف

سے لے کر جنت البقیع ،صفاومروہ عرفات غار حرا، غار ثور تک ان کے لیے مقدس ہیں۔ پوری دنیا سے ہر سال مسلمان حج بیت اللہ کرنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں عرب کی سرزمین کا سفر کرتے ہیں۔ سال کے باقی دنوں میں عمرہ کی زیارت ہوتی ہے۔عمرہ کی زیارت میں بھی سال بھر یہی صورتِ حال رہتی ہے۔ پاکستان اور بھارت سے بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ حج اور عمرہ کرنے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے صاحب ذوق ہوتے ہیں جو اپنے سفر کے احوال قلم بند کرتے ہیں تا کہ دوسروں کے لیے رہبری کرتے رہیں۔

حج کے سفر نامے خالصتاً مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں مگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو دنیا کے ہر ملک کی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ خود عرب کی تہذیب وثقافت اور تاریخ سامنے آتی ہے۔تہذیب وثقافت اور تاریخ کے یہ عناصر جہاں دلچسپی کے باعث ہوتے ہیں وہاں پر معلومات سے بھر پور ہوتے ہیں اور شائقین علم کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ مسلمانوں کے اس اجتماع کا جائزہ لینے کے لیے اور مسلمانوں کے عمل طریقہ کار دیکھنے کے لیے غیر مذہب بھی بھیس بنا کر حاجیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور پھر بعد میں اپنے تاثرات بیان کرتے نظر آتے ہیں۔مسلمانوں کے ان پاک مقامات پر جہاں غیر مذہب کا داخلہ منع ہے، بہت سے یورپی سیاحوں کے سفر کی حجاز کا سفر اختیار کرنے کی روایت طویل ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وہ مقامات مقدسہ کی زیارت کرسکیں۔لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ احکام بالا کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔صاحب اقتدار جسے چاہیے داخلہ کی اجازت دے دیں۔کہا جاتا ہے کہ شروع زمانے سے:''اس وقت تک کم وبیش بیس بائیس سیاح گزرے ہیں جنھوں نے اس سرزمین میں آکر مکے اور مدینے کی سیاحت کی۔''(۱۳۳) یورپ کے ان سیاحوں، جنھوں نے مقدس سرزمین کا سفر کیا شاید ہے اس کے جغرافیہ اور امورِ سلطنت کو سمجھ سکے ہوں۔کوئی سیاح بھی اپنی جگہ درست معلومات لکھنے سے قاصر رہا ہے۔لیکن ان سیاحوں میں برکھاٹ:''ایک ممتاز شخصیت رکھتا ہے اس کو اہل یورپ عرب کے یورپین سیاحوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔اور اس کا سفر نامہ یورپ میں مکے اور مدینے کے متعلق معتبر و مستند معلومات کا ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔''(۱۳۴)

برکھاٹ کا سفر نامہ''سفر نامۂ حجاز'' کے نام سے ترجمہ ہوا ہے اس سفر نامے کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ مولوی شبیر حسین نے کیا ہے۔ برکھاٹ انگلستان کا رہنے والا تھا۔۱۸۰۹ء میں انگلستان سے روانہ ہوا اور ۱۸/ جولائی ۱۸۱۴ء کو جدہ میں آکر اترا۔عربی زبان سیکھنے اور دینی تعلیم کا مطالعہ کرنے کے بعد ۱۸۱۵ء میں حج عمل میں اس نے شمولیت اختیار کی۔ سفر نامے کے دیباچہ میں درج ہے کہ:''۱۸/ جولائی ۱۸۱۴ء کو جدہ پہنچا۔جدے سے نکل کر طائف اور طائف سے مکہ میں آکر مناسکِ حج ادا کیے اس کے بعد دو مہینہ بعد یہاں مقیم رہ کر ۱۸۱۵ء کے شروع میں مدینہ کی جانب روانہ ہوا۔''(۱۳۵)

دراصل ایک غیر مذہب کا حج کرنا مسلمانوں کے لیے شرم کا مقام نہیں بلکہ صاحب اقتدار لوگوں کے لیے ایک للکار

ہے کہ ہر طرح کی ممانت کے بعد ایک غیر مذہب شخص مقدس مقامات سے پھر کر چلا جاتا ہے،صرف اتنا ہی نہیں ۔ بلکہ برکھاٹ تمام مسلمانوں اور بالخصوص عرب کی تہذیب، ثقافت اور تاریخ پر ایسے وار کر کے گیا ہے کہ آئندہ نسلوں تک مسلمان محتاط رہیں گے۔اس سے پہلے اہل یورپ مکہ اور مدینہ کے حالات سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ برکھارت عرب (جدہ) میں آیا تو یہاں رقم کا حصول ہنڈی کے ذریعے ممکن تھا۔اس طریقہ کے متعلق وہ کافی حد تک معلومات حاصل کر کے آیا تھا۔تاہم اس نے عرب سوداگروں کو خوب تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ایک تاریخی واقعہ کے بارے میں لکھتے ہوتے کہتا ہے کہ:''محمد علی پاشا کو ہی لکھوں آخر بہار۱۸۱۳ء میں پاشا حجاز میں داخل ہو کر طائف میں فوج لیے پڑا تھا یہاں سے وہ وہابیوں کے قلعوں پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔''(۱۳۶) جس دور میں برکھاٹ نے عرب کا سفر کیا اُس دور میں شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک زوروں پر تھی اور ابن سعود نے عرب کے مقامات مقدسہ پر جنگ شروع رکھی تھی۔تاریخ وہابیہ میں عرب کی صورت حال کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> ۱۲۲۶ھ میں ترکی اور مصری افواج وہابیہ کی سرکوبی کے لیے میدان میں کود پڑیں۔خدیوں مصر محمد علی پاشا کے حکم سے اس کا بیٹا طوسون پاشا مدینہ کے محاذ پر اسلامی لشکر لے کر پہنچا۔لیکن ابن سعود کی فوج سے گھسان کی جنگ لڑنے کے باوجود شکست کھا گیا۔دوسرے سال طوسون پاشا تازہ دم فوج لے کر میدان میں اترا ادھر ابن سعود بھی پوری تیاری کے ساتھ مقابل ہوا۔اس نے اس بار بھی سر توڑ مقابلہ کیا۔مگر طوسون پاشا کی فوج نے وہابیوں کی فوج کو مدینہ منورہ اور جدہ سے نکال کر دم لیا۔اسی دوران ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۴ء سعود بن عبدالعزیز کا اڑسٹھ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا اور اس کا بڑا بیٹا تخت پر بیٹھا۔خدیوِ مصر نے عبداللہ کو لکھا کہ روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد نبوی کا لوٹا ہوا مال و متاع واپس کیا جائے۔لیکن عبداللہ نے انکار کر دیا۔اس پر خدیوِ مصر نفسِ نفیسی حجاز پہنچا اور مسلسل تین چار لڑیوں میں عبداللہ کی فوج کو تہس نہس کرتے ہوئے دارالسلطنت درعیہ کا محاصرہ کر لیا۔انجام کار ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں عبداللہ ابن سعود نے ہتھیار ڈال دیے۔عبداللہ گرفتار کر کے باغی کی حیثیت سے استنبول بھیجا گیا۔(۱۳۷)

وہابیوں کی شورش کے اُٹھنے اور اس کے تدارک کے لیے جو کچھ اقدامات کیے گئے اس کا آنکھوں دیکھا حال برکھاٹ اپنے سفرنامے میں یوں لکھا ہے کہ:

> ایک سال قبل وہابیوں کے زیر کمان سعود اسے جدہ میں محصور کیا تھا۔اس وقت اپنے تئیں اسے عقائد وہابیوں کا معتقد ظاہر کیا اور کھلم کھلا وہابی فرمانروا کا مطیع ہو گیا اس ترکیب سے جدے پر اس کا قبضہ بنا رہا، اور کرور گیری کی آمدنی جو اس کی دولت کا بڑا ذریعہ تھی یہی لیتا رہا۔اور وہابیوں نے اس شہر پر جو ان کے اصولی و عقائد کے موافق تھا حملہ نہ کیا۔لیکن ترکی سپاہی اس وقت یہاں سے مصر یا کہیں اور چلنے جانے پر مجبور ہوئے تمامتر کی احکام ۱۸۱۱ء تک حجاز سے بالکل خارج رہے۔۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا نے وہابیوں کے مقابلے میں اپنی تدبیریں شروع کیں اور اپنے بیٹے طوسون پاشا کے زیر کمان ایک فوج بھیجی جس کو پہلے تو

> ینبوع ومدینے کی بیچ کے دروں میں شکست ہوگئی مگر ۱۸۱۲ء میں فتح ہوئی اور ستمبر کے مہینے میں طوسون پاشا نے مدینہ فتح کرلیا۔ مصطفیٰ پاشا جو محمد علی کا سالا تھا اپنا رسالا لے کر جدہ و مکہ و طائف کی طرف بڑھا اور تقریباً بغیر خون ریزی کے اُس نے ان سب مقامات پر قبضہ کرلیا۔ شریف غالب نے جس کو محمد علی کی فتوحات سے خوف ہو چلا تھا خفیہ طور پر مصر میں اس سے مراسلت کی اور جب تک ترک جدے میں داخل ہوگئے تو اس نے علانیہ اپنے تئیں ترکوں کا دوست ظاہر کیا طوسون پاشا کو اس کی خدمات کے صلے میں باب عالی سے پاشائے جدہ کا خطاب عنایت ہوا۔ (۱۳۸)

بقول جان برکاٹ کے مطابق مذکورہ بالا اقتباس میں جو وضاحت کی ہے سراسر حقائق پر مبنی تھے، عبدالوہاب نجدی نے مقاماتِ مقدسہ کی بے حد بے حرمتی کی۔ صحابہ کی قبروں، صحابہ کی مساجد اور صحابہ کے گھروں کے نشانات کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ جنت البقیع میں شہدائے بدر کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ خانہ کعبہ کی جالیاں اور مسجد نبوی کے قالین وغیرہ مالِ غنیمت کے طور پر اُٹھا کر لے گے۔ مکہ اور مدینہ میں اپنے سپاہیوں کو عام لوٹ مار کی اجازت دے رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محمد علی پاشا فوجی سپہ سالار وہابیوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے طائف میں مقیم تھا۔ وہابیت گردی کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ابوالحسان قادری لکھتے ہیں کہ: ''مکہ معظّمہ کے آثار مقدسہ مثلاً مولودِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مولودِ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ کو بالکل پامال کر دیا گیا۔ سیدہ اُمّ المومنین خدیجۃ البریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار پاک کو نہایت ہی توہین کے ساتھ مسمار گیا گیا۔'' (۱۳۹) وہابیوں کی شورش کا ذکر کرتے ہوئے برکھاٹ نے لکھا ہے کہ: ''وہابیوں کی شورش کے زمانے میں جدے کو بہت زوال ہوگیا تھا اس کی بہت سے عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئی تھی۔'' (۱۴۰)

ہندوستان کے حالات واقعات مقالہ کا حصہ پہلے اس لیے بنے ہیں کہ اردو سفرنامے کے تاریخی عناصر زیرِ مطالعہ ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو سفرنامے کی تحریر واشاعت کا زیادہ تر کام ہندوستان میں ہی واقع ہوا ہے۔ خاص طور پر ایشیائی مما لک سے تعلق رکھنے والے سفرناموں کے بارے میں بھی یہی صورتِ حال خصوصیت کی حامل ہے۔ لہٰذا منتخب ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کے مطالعات کے پیشِ نظر کالا پانی مولانا جعفر تھانیسری کا سفرنامہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفرنامہ برطانوی دور میں اس وقت لکھا گیا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی بساط لپٹ چکی تھی۔ مولانا جعفر تھانیسری نے اپنے سفرنامے میں دو عدد لارڈز کے مرنے کی تاریخ درج کی ہے۔ ایک لارڈ ایل یجن کا ذکر ہے۔ دوسرے لارڈ میو تھے جنھیں ایک افغانی پٹھان نے قتل کر دیا تھا۔ لارڈ میو کالا پانی قیدیوں کے معائنہ کے سلسلے میں دورے پر تھے۔ اردو سفرنامہ جنگِ آزادی کے بعد، سامراجی حکومتیں: سیاسی وسماجی تاریخ کے مطالعات پیشِ نظر ہیں۔ جیسا کہ انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت، سیر ایران، سیر برہما، روم ومصر وشام، اور سیاحت امیری، امیر حبیب اللہ خان کا افغانستان، ۱۹۰۷ء کا جاپان اور سفر

نامہ بغداد ایسے سفرنامے ہیں جو نوآبادتی عہد میں لکھے گئے۔ان سفرناموں میں جنگ آزادی کے تاریخی واقعات اور چند ایک ایشیائی ممالک کے تاریخ کا ذکر ہے۔ان تاریخی واقعات کو مجوزہ ملک کی تاریخ کے تناظر میں زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاو روزنامچۂ سیاحت، رونامچہ با تصویر، سفرِ مصر و شام وحجاز از، مشاہداتِ کابل و یاغستان اور سرگزشتِ کابل، سیر حامدی اور اسیرانِ مالٹا ایسے سفرنامے ہیں جو جنگِ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم کے درمیان لکھے گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مذکورہ سفرناموں میں جنگِ عظیم اوّل اور دوم کے تاریخی واقعات بھی ہیں۔سفرنامہ افغانستان از خواجہ حسن نظامی اور سیر افغانستان از سید سلیمان ندوی ایسے سفرنامے ہیں جن میں خاص طور پر افغانستان کی تاریخ کے واقعات کا مطالعہ پیشِ نظر ہے۔اس دور کے اردو سفرناموں میں عربوں کے سیاسی اور تایخی حالات کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے تاریخ کی کتب کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ج: جنوبی ایشیا کے ممالک کی علمی وادبی صورتِ حال، اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر

جنوبی ایشیا کے خطے میں علمی اور ادبی صورت حال ایک طرح سے حوصلہ افزا رہی ہے۔ یہاں پر ادبی تحریکوں یا تنظیموں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ برصغیر میں اردو شاعری کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ عام زندگی کے معاملات بھی شاعری یعنی مثنوی کے ذریعے بیان کئے جاتے تھے۔نثر نہ ہونے کے برابر لکھی گئی۔نثر کی ایسی کتابیں تھیں جن میں تصوف اور دینیات کے معاملات کے مضامین شامل تھے۔اس خطے میں تحدیدِ زمانی کے حوالے سے سفرنامے میں سامنے نہیں آئے۔ ایسے سفرنامے جن میں علمی اور ادبی صورت حال زیرِ بحث آئی ہو۔جنوبی ہندوستان میں ملا وجہی کی سب رس اور بندہ نواز گیسوئے دراز کی نثر موجود تھی تھی۔اس کے علاوہ ولی دکنی، قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کی اردو شاعری بھی سامنے آچکی تھی۔ اٹھارویں صدی میں ایک طرف میر وسودا اور ایک طرف ناسخ وآتش کی غزلیہ شاعری کے چرچے تھے۔انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج میں نثر کی بہت سی کتابیں لکھوائی گئیں۔جن میں باغ اردو، بہارِ اردو، باغ و بہار، طوطا کہانی، آرائشِ محفل، الف لیلیٰ اور درجنوں دیگر کتابیں نثر کی لکھی گئی۔ ان میں قواعد وانشا اور عروض پر بھی کتابیں تھیں۔شمالی ہندوستان میں امیر خسرو کی نثر اور شاعری پر کتب تھی۔ بھگت کبیر کے دوہے اور دہلی کے شعرا کی اردو غزل عروج پر تھی۔البتہ لکھنو میں اردو ادب کو فروغ مل رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ رزم گا بھی گرم رہی۔ایک طرف افسانہ آزاد اور افسانہ عجائب لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے تو دوسری طرف امراؤ جان ادا اردو ادب کا حصہ بنا۔انیسویں صدی میں ہندوستان کے بہت سے امرا نے اندرونِ ہندوستان اور دوسرے ممالک کے سفر اختیار کیے اور ان اسفار کا حال لکھا۔اس طرح نثر کی صورت کو دیکھا جائے اس دور کے چند سفرنامے بھی ہیں۔مراد یہ کہ بنگال، بہار، میوات، دہلی، آگرہ، گجرات، کلکتہ، وغیرہ میں اردو زبان وادب نظم اور

نثر کی صورت میں پروان چڑھ رہا تھا۔

ہندوستان کے سیاحوں نے جب اپنے سفرنامے لکھے تو جہاں لسانی تشکیلات کو ذکر کیا وہاں پر علم وادب کی ترویج و ترقی کے اشارے بھی دیے ہیں۔ موضع لچھا گیر ایک گاؤں ہے۔ اس کے قریب ایک قدیم عمارت ہے جو گنگا کے مضافات میں ہے۔ اس کا ذکر فردوسی نے اپنے شاہنامے میں بھی کیا ہے۔ ادب کی ایک جہت کی طرف ہلکا سا ایک اشارہ ہے جو نواب عبدالکریم خان نے یوں کیا ہے کہ: ''فردوسی کے شاہنامے میں ہے کہ پتھر کی عمارات سیاوش بن شاہ کیکاوس کی لب گنگا ہیں۔ پھر وہاں سے کوہستان بدری میں آئی۔ وہیں احاطہ برف کا ہے کہ ہمانچل اُس کو کہتے ہیں۔'' (۱۴۱) سیاحت نامہ نواب عبدالکریم خان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرا اقتباس جو کسی عمارت، قلعہ یا کسی اور تاریخی عمارت کے حوالے سے ہے، آرائشِ محفل سے ماخذ ہے۔ صوبہ بنگالہ جس کے آخری ناظم میر جعفر کو انگریزوں نے مقرر کیا تھا۔ سلطنت کی وسعت اور اہم مقامات کا ذکر آرائش محفل میں اس طرح ہے کہ: ''آرائش محفل کی رو سے ایسا معلوم ہوا کہ بندر ہگلی اور سالگام آدھ کوس کا باہم فاصلہ رکھتے ہیں۔ سالگام کی شہریت اور آبادتا اسلوبِ سلطنت بہت بڑی اور پُر عمارت تھی۔'' (۱۴۲) میر جعفر کی فرمانروائی میں موجود، انگریزوں کی مشہور کوٹھی کا ذکر آرائش محفل میں ہے۔ یہ کوٹھی زلزلے میں غرق ہوگئی تھی۔ بیان اس طرح ہے کہ:

> آرائش محفل کے مصنف نے اس طرح کہ نواب جعفر خاں کی نظامت تلک کمپنی بہادر کی کوٹھی ہگلی میں گول گھاٹ سے متصل مغل پَرے کے قریب تھی۔ ایک دن یکا یک زوال کے وقت زمین وہاں کی دھنسنے لگی۔ اُس وقت صاحباب انگریز کھانا نوش کر رہے تھے۔ بارے سردار تو گرتے پڑتے نہایت جدوکد سے نکلے لیکن مال واسباب تمام وکمال مع اکثر ذی روح اس مکان کے سب پانی میں غرق ہوا۔ (۱۴۳)

ایشیائی اردو سفر میں ادبی اور علمی صورتِ حال کے پیشِ نظر غوث علی شاہ کا تذکرہ غوثیہ ہے۔ تذکرہ غوثیہ میں ایک حصہ غوث علی شاہ کے سفرنامے کا ہے۔ ویسے تو انھوں نے دو مرتبہ حج کا سفر بھی کیا مگر انھوں نے اپنے تذکرہ میں جتنی تفصیل ہندوستان کی لکھی ہے وہ سب سیاحتی حالات و واقعات ہیں۔ انھوں نے تمام واقعات حقیقت، صداقت اور مشاہدات پر مبنی لکھے ہیں۔ غوث علی شاہ کے تذکرہ میں ایک جگہ مرزا غالب سے ملاقات کو ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ایک روز ہم مرزا نوشتہ کے مکان پر گئے نہایت حسن اخلاق سے ملے اب فرش تک آن کر لے گئے تمام حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:
>
> ؎ تو نہ غافل ہو کوئی اور ہی ہو   تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی
>
> کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی اُستاد کا ہے فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔ (۱۴۴)

تذکرہ غوثیہ میں مرزا غالب کے حوالے سے ایک اور واقعہ کا ذکر ہے۔ مرزا غالب نے رجب علی بیگ کے افسانۂ عجائب کی نثر پر حقیقت پر مبنی تنقید کی۔ مگر کسی کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے نہ صرف رجب علی بیگ سے معذرت

کی بلکہ نثر کی بھی خوب تعریف کی۔ تذکرہ غوثیہ کے میں بیان ہے کہ:

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرور منصف فسانہ عجائب لکھنؤ سے آئے مرزا نوشتہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اُردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا کہ چار درویش کی، میاں رجب علی بولے اور فسانہ عجائب کیسی ہے مرزا بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت مرزا نوشتہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالموں پہلے سے کیوں نہ کہا دوسرے دن مرزا نوشتہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں کل کی مکافات کر آئیں ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پہنچے مزاج پُرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کی جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانہ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح وبلیغ ہے میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔ اور کیوں کر اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا، دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بھی بلایا اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی، مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے، درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ (۱۴۵)

غوث علی شاہ کا تذکرہ غوثیہ میں ہندوستان کی نامور شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔ غالب، رجب علی، مولانا فضلِ حق خیر آبادی، میر تقی میر، وغیرہ ادبی شخصیات ہیں۔ اس کے علاوہ یوسف خاں کمبل پوش کا ذکر ہے۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے رام پور میں بہت زیادہ ملاقتیں رہیں۔ جس میں گزشیہ واقعات کو یاد کرتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ تاہم مولانا کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ: ''جب ہم دربارہ رام پور گئے تو سرائے میں ٹھہرے اتفاقاً مولوی فضلِ حق صاحب سے ملاقات ہوئی نہایت ہی محبت وعنایت سے پیش آئے اور نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اُٹھا لاؤ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجئے کہ بہت آرام سے ہوں۔'' (۱۴۶) اسی طرح کمبل پوش (یوسف) اور فضلِ حق خیر آبادہ کا سامنا ہوتا ہے۔ جس کی وضاحت اس طرح ہے کہ:

زینت المساجد میں ایک کمبل پوش سے مولوی محبوب علی کی گفتگو ہونے لگی اس آیت میں **فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی**۔ مولوی صاحب تو کہتے تھے کہ بیت سے مُراد کعبہ ہے اور کمبل پوش کا قول تھا کہ بیت سے عبارت قلب انسانی ہے۔ یہاں تک کہ بحث ہوئی کہ نوبت بجدال پہنچی اتنے میں مولوی فضل حق صاحب تشریف لائے دونوں صاحبوں کی تقریر سنی اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ صاحب آپ خاموش بیٹھے سنتے ہیں۔ فیصلہ کیوں نہ کر دیتے۔ (۱۴۷)

غوث علی شاہ دہلی میں موجود زینت المساجد میں کوئی چھ ماہ کے قریب رہے۔ اسی مسجد میں ان کی ملاقات مرزا

غالب، رجب علی، فضلِ حق خیرآباد، اور کمبل پوش، وغیرہ سے ہوئی۔ بلکہ یہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف بھی تھے۔ کمبل پوش کا ذکر کرتے ہوئے غوث علی شاہ لکھتے ہیں کہ:

زینت المساجد میں کمبل پوش نے ایک دن یہ اشعار پڑھے۔

ملک خدا میں یارو آباد ہیں تو ہم ہیں
تعمیر دو جہاں کی بنیاد ہیں تو ہم ہیں
دیکھا پرکھ پرکھ کے آخر پڑا نظر یہ
گر نقد ہیں تو ہم ہیں نقاد ہیں تو ہم ہیں

ہم نے کمبل پوش سے دریافت کیا (نظر پڑا یہ) سے کیا مُراد ہے کہا انسان ہم کہا نہیں یہ سے قلب مُراد ہے کہا کہ بے شک اس کے یہی معنی ہیں اور اب خوب سمجھ میں آ گئے۔ (۱۴۸)

غوث علی شاہ کو مرزا غالب کی موت کی خبر ملی تو بہت دکھی ہوئے۔ یہ بات قابلِ تحقیق ہے کہ غالب کی رحلت کی خبر زینت المساجد میں قیام کے دوران ملی یا پھر کسی اور جگہ پر ملی تھی۔ کیوں کہ وہ زینت المساجد سے لکھنؤ گئے۔ وہاں سے کشمیر، پھر اپنے گھر واپس آئے۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے تھے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن مرزا غالب کی وفات کی خبر ملی تو وہ بہت دکھی ہوئے۔ یہ یاد رہے کہ مرزا غالب کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی اور خود غوث علی شاہ کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ غوث علی شاہ مرزا غالب کی وفات کی خبر کا یوں ذکر کرتے ہیں:

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشتہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی آپ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کھال دہونتی رہ گیو اور نر بچہ مہیں انگار — اہرن کو ٹھکو ہتو اور اٹھ گئے میت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہوئے — سدا جوبن تہر رہے اور سدا نہ جیوے کو سار

شنیدم کہ در روز گار کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بفرد و سی آمد کلاہِ ہمی
چو فردوسی از دور فانی گذشت — نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل در کشید — بسر چتر اشعار سعدی رسید
چو اورنگِ سعدی فرد شد ز کار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
دزاں پس چو نوبت بجامی رسید — جہانِ سخن را تمام رسید
عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے — چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے بجز انکسار بہت تھا فقیر دوست بدرجہ غیات اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز جو ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعہ پڑھے تھے۔

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد نعتم نگار　　　ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قطعہ

بروز حشر الٰہی چو نامہ عملم　　　کنند باز کہ آن روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آنراز سرنوشت ازل　　　اگر زیادہ و کم باشدہ گناہ من است

رند مشرب بے حد رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیئے۔(۱۴۹)

مرزا غالب کی وفات دہلی میں ہوئی تو اس وقت غوث علی شاہ زینت المساجد دہلی میں موجود تھے۔ ایشیائی اردو سفر نامے میں جنوبی ایشیا کی علمی و ادبی صورتِ حال کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسے تاریخی واقعات سامنے آئے ہیں جن کا ذکر تاریخ کتب میں اس قدر تفصیل سے ملنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ زیر نظر مقالہ ہذا کا ایسا حصہ ہے جس میں جنوبی ایشیا کی علمی و ادبی صورتِ حال کا جائزہ پیش کرنا مقصود تھا۔ تاہم غلام غوث علی شاہ کے تذکرہ غوثیہ کے پیشِ نظر یوسف خاں کمبل پوش کا دورانِ سیاحت زینت المساجد میں قیام، مرزا غالب اور رجب علی بیگ سرور سے ملاقاتیں، اس کے علاوہ علمی و ادب مباحث قابلِ ذکر ہیں۔ نیز یہ کہ تذکرغوثیہ کی روشنی میں مرزا غالب کی وفات کا بڑے درد بھرے انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

د: منتخب ایشیائی اردو سفرناموں میں سیاسی اور سماجی تاریخ کے عناصر اور مضمرات

ایشیائی اردو سفر نامے میں ایسے تاریخی عناصر بھی سامنے آتے ہیں جن کا تاریخ کی کتابوں میں ذکر نہیں ہے۔ سفر نامہ نگار نے انھیں کسی نہ کسی واقعہ کے پیشِ نظر لکھا ہے۔ حقیقت میں سفر نامہ نگار کا بیان تو تاریخ پر مبنی ہوتا ہے مگر اس کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل سامنے نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تاریخی عناصر اس پیمانے کے نہیں ہوتے جنھیں مشہور تاریخی اسباب و واقعات میں شامل کیا جا سکے۔ اس قسم کے تاریخی عناصر کسی علاقائی، صوبائی یا پھر ریاستی سطح کے مطابق ہوتے ہیں۔ مستند تاریخی واقعات کے شواہد تاریخی کی کئی ایک کتب سے مل سکتے ہیں مگر ایسے واقعات جن کے ثبوت دیگر کتب سے نہ ملیں اُن کی بھی ایک اپنی اہمیت ہے۔ اسی طرح کا ایک واقع یوسف کمبل پوش لکھتے ہیں کہ:" جب سے مرلی دھر نامی ایک شخص یہاں کی نظامت لے کر آیا تب سے نہایت اندھیر و نامنصفی و نا اتفاقی درپیش ہے۔ کہ اس نے رعایا اور علاقہ یہاں کا تباہ و ویران کر دیا اور جہاں تک رعایا پر ظلم ستم ہو سکا درگزر نہ کی۔"(۱۵۰) یہ واقعہ قصبہ سندیلہ، موضوع نگوا کا اُس وقت کا ہے جب یوسف کمبل پوش ریاست اُودھ کی فوج میں ملازم تھا۔ موجودہ دور میں ممکن ہے کہ مذکورہ جگہوں کے نام بدل گئے ہوں یا یہ کہ تحصیل ضلع میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ بہر کیف مرلی دھر راجا کی صورت حال کو کمبل پوش نے بڑے مختصر الفاظ

میں بیان کر دیا ہے۔ یوسف کمبل پوش، نواب عبد اکریم خان اور غوث علی شاہ صاحب نہ صرف ہم عصر صاحب کتاب ہیں بلکہ ان تینوں اشخاص نے شمالی ہندوستان کی سیر و سیاحت بھی کی ہے۔ اسی طرح یوسف کمبل پوش نے ایک قلعہ کا ذکر کیا جس میں ڈاکوؤں نے قیام کیا ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''اُس گڈھی میں قریب ستر ڈاکوں کے ایک سے پچیس جوانوں سے کہ نہایت ہی بہادر اور صاحب شمشیر، موجود، کہ بار ہا راجا غالب جنگ بہادر اور چند کلکٹر واسطے گرفتاری اُن کی، کے گئے۔'' (۱۵۱) تاریخِ اودھ میں یوں تو اہم واقعات کو ہی موضع بنایا گیا۔ مگر موضع سلطان پور پر کسی فوج کشی کا ذکر نہیں ملتا۔ مذکورہ گاؤں کے قلعے پر حملے کا ذکر سیر ملک اُودھ میں یوسف کمبل پوش نے کیا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوس نے تاریخِ یوسفی، عجائباتِ فرنگ میں اسی طرح کے واقع کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''گرفتاری رہزنوں اور قزاقوں اور کھودڈالنے گڈھی زمیندوروں سرکشوں کے لیے یہ تاکیدِ اکید حکم دیا۔ بموجب حکم محکم قزاق ہر شہر سے پکڑے آتے ہیں اور قلع قمع گڈھیوں کا ہوتا ہے۔ ان دنوں بندہ بھی دو تین دفعہ ہمراہ کپتان منگنس صاحب کے اور راجا درسن سنگھ غالب جنگ کی زمینداروں اور راہزنوں کے پکڑنے کو گیا تھا۔'' (۱۵۲) چوں کہ انگریز ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ ہر ایک ریاست، صوبے یا عمل داری کے دارالحکومت میں انگریز نے اپنی ریزیڈنسی بنائی ہوئی تھی۔ جو کام انگریز کہتے تھے نواب اور مہاراجے اُسی کے مطابق احکام جاری کرتے تھے۔ تاہم انگریزوں نے نظامِ اودھ میں جگہ جگہ حفاظت کے لیے سوار مقرر کر رکھے تھے۔ جس کے ذریعے انگریزوں نے: ''اپنی عملداری اور غیروں کے ملک سے رہزن اور ڈکیٹ نکلوا دیے۔'' (۱۵۳)

دراصل جن شاہراہوں سے انگریزوں کا گزر ہوتا تھا وہاں پر انتظامِ آمد و رفت درست تھا۔ عام راستے چوروں اور ڈاکوؤں کی آماجگاہ تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی جارہ داری قائم کرنے کے لیے موصول لینا شروع کر دیا تھا۔ موصول جمع کرنے کے لیے انگریز باقاعدہ مہاراجاؤں اور بادشاہوں کو کسی نہ کسی طور مجبور کر کے اجازت نامہ حاصل کر لیتے تھے۔ اس حوالے سے سیاحت نامہ نواب عبدالریم نے یوں لکھا ہے کہ:

> صبح گھاٹ مذکور سے چل کر اُو پر موضوع جنگی پور کے کہ وہ واسطے لینے محصول کشتیوں کے مقرر ہے، پہنچا اور ماجرا اُس کا یوں ہے کہ جو کسی سواری کی ہوتی ہے، اُس سے فی ڈانڈا تین آنے لیتے ہیں۔ اور کشتی ۵۰۰ پان سے من کے بال کی ہو اور اسباب اُس پر پچاس من ہو تو بھی محافظان مذکور محصول پان سے ہی من لیں گے۔ اور خواہ کشتی ہندوستانی ہو یا انگریزی اس میں معافی کسی کے واسطے نہیں ہے لیکن جو کشتی کہ قسم اسباب توپ باروت یا گولہ یا فوج وغیرہ کی سے ہوگی۔ کہ اُس لا علاقہ خاص ذات سرکار کمپنی سے متعلق ہے سو اس کشتی سے البتہ مزاحمت نہ ہوگی۔ چنانچہ راقم نے بھی بہ حساب فی ڈانڈ تین آنے دے کر اُس کی دستخطی صاحب علاقہ اُس کی کے لی اور روانہ منزل مقصود کا ہوا اور دس کوس طے کر کر او پر موضوع بنی پور کے مقام کیا۔ (۱۵۴)

انیسویں صدی میں نصف میں یوسف خاں کمبل پوش کے دوسفر نامے عجائبات فرنگ اور سیر ملک اودھ سامنے آتے ہیں۔نواب عبدالکریم خاں کا سیاحت نامہ اور غوث علی شاہ کا تذکرہ غوثیہ،مولانا جعفر تھانیسری کا کالا پانی اور مولانا محمد حسین آزاد کے انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیر اور سیر ایران ہیں۔ مذکورہ سفر نامے اہمیت کے حامل ہیں۔تاریخی عناصر کے مطالعہ کے لحاظ سے مندرجہ بالا میں بات ہو چکی ہے۔ جہاں تک سفر ناموں میں تاریخی مضمرات کی بات ہے تو اس دور کے سفر نامہ نگاروں نے چشم دید تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے تاریخی واقعات سفر ناموں میں تو مل سکتے ہیں مگر تاریخ کی کتابوں میں ملنے کا کم امکان ہے۔مولانا جعفر تھانیسری نے کالا پانی میں ایک اہم تاریخی واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے کہ:

> اخیر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۸۰ہجری سرحدی غربی ہند پر ملک یاغستان میں خودسر کار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔جنرل چمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے ابیلے کی گھاٹی میں جا کر فوجِ سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ بیگانے مُلک میں سرکار کی مداخلت بے جا کے سبب سے مُلا عبدالغفور اخواند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آ موجود ہوئے۔(۱۵۵)

افغانستان پر حملہ کی صورت میں انگریزی فوج کو مجاہدین کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔مولانا جعفر تھانیسری نے اس واقعہ کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ:" مجاہدوں نے بھی تمنائے حصول شہات دادِ شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھائے۔غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ ہوتی رہی خود چمبرلین صاحب مجروع شدید ہوئے۔"(۱۵۶)سفر نامہ کالا پانی میں سفر نامہ نگار نے ایک راجا جگن ناتھ کی قید کا ذکر کیا ہے۔تاریخی کی کسی کتاب میں راجا جگن ناتھ کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ:"۱۸۷۹ء میں ایک بد بخت راجا جگن ناتھ پوری کا جس کے واسطے مدت تک اخباروں نے بھی سر پھوڑا تھا قید ہو کر کالے پانی میں پہنچا تھا۔مگر بوجہ کالا چہرہ ہو کے بے چارہ عام چوہڑے چماروں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔"(۱۵۷)جگن ناتھ ایک مندر کا نام ہے اور اردگرد جو علاقہ آباد ہوا ہے،اسی کے نام سے منسوب ہے۔اسی لیے مصنف نے جگن ناتھ پوری لکھا ہے۔اصل میں نام کچھ اور تھا۔سفر نامے میں فقط راجا جگن ناتھ پوری درج ہے۔سفر نامہ نگار نے اس سے زیادہ تفصیل نہیں لکھی۔

اردو سفر نامے کے آغاز سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک،دنیا کے سیاحوں نے بے شمار سفر اختیار کیے۔ہر سیاح نے اپنا سفر مکمل کرنے کے بعد اپنے سفر کے تاثرات کتابی صورت میں لکھے۔ ہندوستان نے غیر ملکیوں کے آمد اکبر کے دورِ حکومت کی ابتدا کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے۔اس لیے اہل یورپ نے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں سفر نامے لکھے۔ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کے حوالے سے متوازی مطالعہ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔تاریخ کے مطالعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مورخین نے اردو اور انگریزی سفر ناموں اپنی تاریخ نویسی کے مواد کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔تاریخ اودھ، جلد دوم،سوم اور چہارم،اور تاریخ ہندوستان میں انیسویں صدی کے سفر ناموں سے تاریخی واقعات کی

خاص طور پر معاونت حاصل کی گئی ہے۔اسی طرح اُوکسفورڈ تاریخِ ہندوستان میں طامس رو کے سفر نامے تاریخی حالات واقعات کو شامل مواد کیا گیا ہے۔اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ سفر نامہ کسی بھی زبان کی تاریخ میں بنیاد مواد کی فراہمی کا کام کرتا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ سیاح ایک ہی وقت میں سفر نامہ نگار بھی ہوتا ہے اور سیاح بھی۔سفر نامہ نگار واقعات کا حقیقی سطح پر مشاہدہ کر کے سفر نامے کی صورت میں تاریخ لکھ دیتا ہے۔

ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کے مطالعہ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال میں تبدیل واقع ہوئی۔مغلوں کی سلطنت کے زوال کے بعد بظاہر کسی بھی شخصیت نے سامنے آ کر ان کی رہنمائی اور قیادت نہیں کی۔مگر سر سید احمد خان نے جس خوبی اور حسنِ ظن سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا اس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔دوسری طرف سر سید احمد خان نے انگریزوں سے مسلمانوں کے خلاف ابھرنے والے منفی جذبات کو بڑی چابک دستی سے ٹھنڈا کیا۔ادب اور تاریخ کو ہتھیار بناتے ہوئے ،شبلی ،حالی ،نذیر احمد ،ذکاء اللہ ،محمد حسین آزاد اور دوسری شخصیات نے بڑی ہنر مندی سے سیاست کے میدان میں مسلمانوں کی پشت پناہی کی۔سر سید نے مسلمانوں کے زخم پر مرہم رکھنے کے لیے پنجاب کا سفر اختیار کیا اور جگہ جگہ خطاب کر کے مسلمانوں کو تعلیم اور سیاست کی طرف مائل کیا۔ان کا سفر یورپ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہندوستان میں سماجی صورتِ حال کے پیش نظرِ ہندوؤں کی براہمو سماج اور آریہ سماج اور مسلمانوں کی انجمنِ اسلامیہ اور انجمنِ حمایت اسلام جیسی تحریکیں جنم لے چکی تھی۔اگر چہ ان تحریکوں کے مقاصد سراسر سماجی اور مذہبی بنیاد پر مبنی تھے۔تاہم آئندہ آگے چل کر ان سے سیاسی میدان میں بھی مدد لی گئی۔اسی دور ۱۸۸۵ء میں ہیوم نامی ایک انگریز نے کانگریس کی بنیاد رکھی جس کے مقاصد سیاسی نوعیت کے تھے۔شروع شروع میں یہ جماعت ہندوستانیوں کے حقوق کی ضامن تھی لیکن جب اس جماعت پر ہندو پوری طرح قابض ہو گئے تو اس جماعت کا مقصد ہندوؤں کے حقوق کو تحفظ دینے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔کانگریس کے قیام سے ایک عشرہ پہلے محمد علی جناح اور محمد اقبال اسی سیاست اور غلام کے سائے میں دنیا میں آ چکے تھے۔جواہر لال نہرو،مہاتما گاندھی جی اور دیگر ہندو رہنما اسی دور میں جنم لینے والے بڑے رہنما ہیں۔۱۸۹۰ء کے قریب قریب ،اہل ہندوستان والوں کی سیاست ،صحافت اور غیر ملکوں کی سیاحت میں اور دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ہندوستان کے سکولوں اور کالجوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب اہل ہندوستان مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ اور امریکہ کا رخ کر چکے تھے۔ایشیائی ممالک کی سیاسی ،مذہبی اور سماجی صورت حال ان پر ظاہر ہو چکی تھی۔شاعری سے قطع نظر ادب اور تاریخ ساتھ ساتھ پروان چڑھ رہے تھے۔انیسویں صدی کا اختتام ہوتے ہوتے ،اہل ہندوستان دنیا کے مختلف ممالک کی تاریخ و تہذیب سے آشنائی حاصل کر چکے تھے۔جہاں تک ہندوستان کی بات ہے یہاں ریل گاڑی (سٹیم انجن) کی

ایجاد انقلاب ثابت ہوئی۔ بجلی، ٹیلی فون، علاج کی سہولت حکومتی اور کسی حد تک نجی سطح تک اہل ہندوستان دیکھ چکے تھے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں جدید صنعتیں لگنے لگیں، انگریزوں کے کارخانوں میں مال تیار ہوتا اور اہل ہندوستان کو مہنگے داموں ملتا، یورپ میں آئے روز ہونے والی ایجادات کی معلوم بھی انھیں مل رہی تھی۔ دوسو چالیس سالہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری اور نوے سالہ انگریزوں کی غلامی کے دور میں اہل ہندوستان کو بہت زیادہ جانی، مالی نقصان ہوا۔ خاص طور پر مسلمان بہت زیادہ پسماندہ ہو گئے تھے۔ ہندو ہمیشہ وقت کی ضرورت کے مطابق اپنے ذاتی مفادات کی طرف جھکے رہتے تھے۔ جس قدر نقصان ہندوؤں کو ہوا، اس سے کہیں زیادہ نقصان ہندوستان کے مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اس طرح انیسویں صدی ایسے اختتام پذیر ہوئی کہ اہل ہندوستان کو کوئی امید کی کرن تو نظر نہ آئی مگر یہ سیاسی، اخلاقی اور سماجی سطح پر مایوس بھی نہ ہوئے تھے۔ مقالہ ہذا کے زیرِ مطالعہ حصہ میں ایسے تاریخی عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا ذکر تاریخ کی کتب میں موجود نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ ممکن ہے ایسے واقعات ان کی نظر میں اہمیت کے حامل نہ ہوں۔ دوم یہ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے وقعات ان کی نظر سے ہی نہ گزرے ہوں۔ مذکورہ واقعات سوائے سفرناموں کے کہیں پر ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقالہ ہذا میں انگریزوں کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کا حقیقی عکس پیش کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو، تاریخ عالم پر ایک نظر، جلد دوم، ترجمہ، طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۱

۲۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، ترجمہ، احمد سلیم، تخلیقات، لاہور ۲۰۰۲ء ص ۶۳

۳۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، حق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۷

۴۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، ترجمہ، ص ۶۳

۵۔ ایضاً، ص ۶۳

۶۔ ایضاً، ص ۳۷

۷۔ ای مارسڈن، تاریخِ ہند، ترجمہ، لالہ جیارام/خلیفہ عمادالدین، بک ہوم، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۳

۸۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد اوّل، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۱۲۔۵۱۳

۹۔ محمد ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان، جلد ششم، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۱۷ء، ص ۲۵۳

۱۰۔ Vincent A. Smith,The Oxford History of India From the Earliest Times to The End of 1911, Oxford Clarendon, 1919, page338

۱۱۔ محمد ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان، جلد ششم، ص ۲۵۳

۱۲۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمنِ ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۱۲۔۵۱۳)

۱۴۔ ای مارسڈن، تاریخِ ہند، ترجمہ، ص ۱۴۱

۱۵۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۳۸

۱۶۔ Vincent A. Smith,The Oxford History of India,page338

۱۷۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، ص ۵۱

۱۸۔ ای مارسڈن، تاریخِ ہند، ترجمہ، ص ۱۴۱

۱۹۔ محمد ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان، جلد ششم ص ۲۵۲

۲۰۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد اوّل، ص ۵۱۴

۲۱۔ محمد ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، جلد ششم، ص ۲۶۱

۲۲۔ ای مارسڈن، تاریخ ہند، ترجمہ، ص ۱۴۱

۲۳۔ نورالدین جہانگیر بادشاہ، تزکِ جہانگیری، ترجمہ مولوی احمد رامپوری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۹

۲۴۔ محمد ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، جلد ششم، ص ۲۵۱

۲۵۔ نورالدین جہانگیر بادشاہ، تزکِ جہانگیری، ترجمہ، ص ۱۷۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۲۹۔ ای مارسڈن، تاریخ ہند، ترجمہ، ص ۱۵۳

۳۰۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، حق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴۰

۳۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر، ترجمہ، ص ۱۲۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۳۴۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، ترجمہ، ص ۶۳

۳۵۔ پنڈت جواہر لال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر، ترجمہ، ص ۲۶۸

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۷۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۷۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۴۱۔ منشی اسماعیل، ''تاریخ جدید''، مشمولہ، بنیاد، جلد ۵، شمارہ ۲۰۱۴ء، مرتب، ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر، مترجم، جواد ہمدان، ڈاکٹر، لمز یونی ورسٹی، لاہور، ص ۱۱۹

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۳

۴۳۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، بک کارنر پبلشرز اینڈ بک سیلرز، جہلم، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۶

۴۴۔ ایضاً۔ص ۱۲۷)

۴۵۔ نواب کریم خاں، سیاحت نامہ، مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی ادارہ ادب وتنقید، لاہور، ۱۹۸۲ء ص ۷

۴۶۔ ایضاً، ص ۵۸

۴۷۔ یوسف خاں کمبل پوش، سیرِ ملک اُودھ، بنیاد، جلد ۵، ص ۱۲۷

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۴۹۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۲۰

۵۰۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اورنیٹ پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۳۹

۵۱۔ مولانا نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد ۴ منشی نول کشور، اودھ، ۱۹۱۹ء، ص ۳۲۸۔۳۲۹

۵۲۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، ص ۱۶۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۶۷۔۱۶۸

۵۴۔ مولانا نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد ۴، ص ۴۱۳

۵۵۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، ص ۱۶۸

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۵۷۔ مولانا نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد ۴، ص ۲۷۹

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۷۹۔۲۸۱

۵۹۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، ص ۱۶۸

۶۰۔ مولانا نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد ۴ منشی نول کشور، اودھ، ۱۹۱۹ء، ص ۴۲۱۔۴۲۲

۶۱۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۶۳۔ مولانا نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد ۴ منشی نول کشور، اودھ، ۱۹۱۹ء، ص ۴۲۲

۶۴۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، ص ۱۶۸

۶۵۔ مولانا نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد ۴، ص ۴۲۳

۶۶۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۶۷۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۶۸۔ ایضاً،ص۴۲۴

۶۹۔ ایضاً،ص۴۲۳

۷۰۔ ایضاً،ص۴۲۴

۷۱۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،ص۱۶۸

۷۲۔ مولانا نجم الغنی،تاریخ اودھ،جلد۴منشی نول کشور،اودھ،۱۹۱۹ء،ص۴۲۴

۷۳۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،ص۱۶۹

۷۴۔ ایضاً،ص۱۶۹

۷۵۔ ایضاً،ص۱۶۹

۷۶۔ مولانا نجم الغنی،تاریخ اودھ،جلد۵منشی نول کشور،اودھ،۱۹۱۹ء،ص۹

۷۷۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،ص۱۶۹

۷۸۔ ایضاً،ص۱۶۹

۷۹۔ مولانا نجم الغنی،تاریخ اودھ،جلد۵،ص۹

۸۰۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،ص۱۶۹

۸۱۔ یوسف کمبل پوش، سیر ملک اودھ،ص۱۳۱

۸۲۔ مولانا نجم الغنی،تاریخ اودھ،جلد۵،ص۹

۸۳۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،ص۱۶۹

۸۴۔ مولانا نجم الغنی،تاریخ اودھ،جلد۵،ص۹

۸۵۔ یوسف خاں کمبل پوش، سیرِ ملک اُودھ،مشمولہ،بنیاد ،جلد۶ ،شمارہ،۲۰۱۵ء،مرتب،ڈاکٹر نجیبہ عارف، لمز یونی ورسٹی،لاہور،ص۱۳۵۔۱۳۶

۸۶۔ ایضاً،ص۱۴۳

۸۷۔ ایضاً۔ص۱۴۴

۸۸۔ نواب کریم خاں، سیاحت نامہ،مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی،ادارہ ادب وتنقید،اہور،۱۹۸۲ء،ص۱۲'

۸۹۔ ایضاً،ص۲۹

۹۰۔ ایضاً،ص۳۳

۹۱۔ ایضاً،ص۳۹

۹۲۔ میر شیر علی افسوس، آرائشِ محفل،مجلسِ ترقی ادب لاہور،۱۹۶۳ء،ص۱۳۱

۹۳۔ جواہر لال نہر،تاریخ عالم پر ایک نظر،جلد دوم،ترجمہ،ص۱۴۰

۹۴۔ مولانا نجم الغنی،تاریخ اودھ،جلد۲،منشی نول کشور،اودھ،۱۹۱۹ء،ص۱۲۰

۹۵۔ نواب کریم خاں، سیاحت نامہ،مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی ادارہ ادب وتنقید،اہور،۱۹۸۲ء،ص۳۹

۹۶۔ پنڈت جواہر لال نہرو،تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلد دوم،ءص۲۷۴

۹۷۔ ایضاً،ص۲۷۱

۹۸۔ ایضاً،ص۲۷۱

۹۹۔ ایضاً،ص۲۶۹۔۲۷۰

۱۰۰۔ ایضاً،ص۲۴۷

۱۰۱۔ ایضاً،ص۲۵۱

۱۰۲۔ ایضاً،ص۲۴۷

۱۰۳۔ ایضاً،ص۲۵۱

۱۰۴۔ غوث علی شاہ،تذکرہ غوثیہ،ص۱۳۶۔۱۳۷

۱۰۵۔ ایضاً،ص۱۳۷

۱۰۶۔ ایضاً،ص۱۳۷

۱۰۷ مولانا محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی،ص۲۱

۱۰۸۔ سید ہاشمی فرید آباد،تاریخ ہندوستان،جلد دوم ص ۳۵۶

۱۰۹۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی،ص۹

۱۱۰۔ ایضاً،ص۶۱

۱۱۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو،تاریخِ عالم پر ایک نظر، جلد دوم،ص۳۱۴

۱۱۲۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی،ص۹

۱۱۳۔ Vincent A. Smith,The Oxford History of India ,page735

۱۱۴۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی،ص۹۔۱۰

۱۱۵۔ ایضاً،ص ۱۰

۱۱۶۔ سید ہاشمی فرید آباد،تاریخ ہندوستان،جلد دوم،ص ۳۵۷

۱۱۷۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی،ص ۷۵

۱۱۸۔ Vincent A. Smith,The Oxford History of India ,p.744

۱۱۹۔ محمد حسین آزاد،وسط ایشیا کی سیاحت،مرتب،،ص ۱۱

۱۲۰۔ حمیداللہ،صاحبزادہ،پروفیسر،مختصر تاریخِ افغانستان،ص ۶

۱۲۱۔ محمد حسین آزاد،وسط ایشیا کی سیاحت،ص ۱۲

۱۲۲۔ ایضاً،ص ۶۲

۱۲۳۔ حمیداللہ،صاحبزادہ،پروفیسر، مختصر تاریخِ افغانستان،ص ۱۷۰

۱۲۴۔ محمد حسین آزاد،وسط ایشیا کی سیاحت،ص ۶۳

۱۲۵۔ حمیداللہ،صاحبزادہ،پروفیسر، مختصر تاریخِ افغانستان،ص ۱۶۹

۱۲۶۔ ایضاً،ص ۱۷۰

۱۲۷۔ محمد حسین آزاد،وسط ایشیا کی سیاحت،ص ۶۴

۱۲۸۔ حمیداللہ،صاحبزادہ،پروفیسر، مختصر تاریخِ افغانستان،ص ۱۷۰

۱۲۹۔ محمد حسین آزاد،وسط ایشیا کی سیاحت،ص ۹۷

۱۳۰۔ ایضاً،ص ۹۷

۱۳۱۔ محمد حیات،تاریخِ وسط ایشیا،مکتبہ تعمیرِ انسانیت،لاہور،س ن،ص ۳۲۱

۱۳۲۔ ایضاً،ص ۳۲۸

۱۳۳۔ جان لوئیس برکھاٹ،سفرنامہ حجاز ،ترجمہ،مولوی شبیر حسین،مطبوعہ،تاج پریس،حیدرآباد دکن،۱۳۴۴ء،ص الف

۱۳۴۔ ایضاً،ص الف

۱۳۵۔ ایضاً،ص ج

۱۳۶۔ ایضاً،ص ۳

۱۳۷۔ ابوالحسان قادری،مکمل تاریخِ تاریخِ وھابیہ ،قادری یونانی دواخانہ سنجھورو،۱۹۷۶ء،ص ۴۸

۱۳۸۔ جان لوئیس برکھاٹ، سفرنامہ حجاز،ص۲۷۔۲۸

۱۳۹۔ ابوالحسان قادری،مکمل تاریخِ تاریخ وھابیہ،۱۹۷۶ء،ص۵۰

۱۴۰۔ جان لوئیس برکھاٹ، سفرنامہ حجاز،ص۹

۱۴۱۔ نواب کریم خاں، سیاحت نامہ،ص۳۴

۱۴۲۔ ایضاً،ص۵۵

۱۴۳۔ ایضاً،ص۵۷

۱۴۴۔ غوث علی شاہ،تذکرہ غوثیہ،ص۱۰۷

۱۴۵۔ ایضاً،ص۱۰۸۔۱۰۹

۱۴۶۔ ایضاً،ص۱۳۲

۱۴۷۔ ایضاً،ص۲۸۷

۱۴۸۔ ایضاً،ص۳۷۲

۱۴۹۔ ایضاً،ص۳۹۶۔۳۹۷

۱۵۰۔ یوسف خاں کمبل پوش، سیرِ ملک اودھ،مرتب،ڈاکٹر نحیبہ عارف،ص۱۳۵۔۱۳۶

۱۵۱۔ ایضاً،ص۱۴۳

۱۵۲۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،ص۱۷۰

۱۵۳۔ ایضاً،ص۱۳۶

۱۵۴۔ نواب کریم خاں، سیاحت نامہ،ص۵۰

۱۵۵۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی،ص۹

۱۵۶۔ ایضاً،ص۹

۱۵۷۔ ایضاً،ص۶۱

باب سوم:

بیسویں صدی کا آغاز اور ایشیائی اردو سفر ناموں میں تاریخ عناصر

(۱۹۰۱ء۔۱۹۴۷ء)

الف: بیسویں صدی کا آغاز اور تاریخی شعور: اردو سفر ناموں کے تناظر میں

ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کا مطالعہ کے پیش نظر ہے۔ جس میں بیسویں صدی کے آغاز کی سیاسی، سماجی اور تاریخی صورت حال پہلے سے کسی قدر بہتر نظر آتی ہے۔ آزاد، شبلی، حالی، ذکاءاللہ اور دیگر لکھنے والوں کی تحریروں نے اہل ہندوستان خاص طور پر مسلمان کے تاریخی شعور کو بیدار کیا۔ اردو داستان نویسی کے بعد اردو ناول اور افسانہ کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ اہل ادب اور صحافت کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں نے دور دراز ملکوں کے سفر اختیار کیے۔ پھر، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اور دوسرے خطوں کی تعلیمی صورت حال کو اپنے سفر ناموں میں لکھا۔ ہندوستان کے عام لوگوں کی صورتِ حال بہت ہی بدتر تھی۔ جاگیردار تو ایک طرف سرمایہ دار بھی ہندوستان کی سدھی سادی عوام کو دھوکہ دینے میں پیش پیش تھے۔ انیسویں صدی کے اختتام پر لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے بنے تو انھوں نے عام لوگوں اور دیہاتی کسانوں کو فائدہ دینے کے لیے زمین کی خرید و فروخت کا ایک قانون جاری کیا جس کی وجہ سے مہاجنوں اور دکانداروں کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ جس زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے بنے:

> اسی زمانے میں ملک کے اندر انجمن ہائے امداد قرضہ (کوآپریٹو سوسائٹیز) کا سلسلہ جاری ہوا۔ جس نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اس سلسلے میں دیہاتی آبادی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو دیہاتیوں کی زمینیں، جو معاش کا واحد ذریعہ تھیں، سودخور مہاجنوں کے قبضے میں چلی جاتیں۔ پنجاب میں قانونِ انتقال اراضہ (۱۹۰۱ء) جس کے مطابق غیر زراعت پیشہ کو زراعت کی زمین خریدنے کی ممانعت کردی

گئی۔اس قانون کا مقصد بھی یہ تھا کہ دیہاتی آباد کا ذریعہ معاش تباہ نہ ہو یا لوگوں کے قبضے میں نہ جائے۔ جنھیں زراعت سے کوئی تعلق نہیں۔(۱)

مہاجنوں اور قرضہ دینے والوں کے بار میں اس لیے قانون بنایا گیا کیوں کہ مہاجن لوگ زمین خرید کر برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیتے تھے جس کی وجہ سے کسان اور حکومت دونوں کو نقصان پہنچتا تھا۔زیادہ تر زمینیں برباد ہو جاتیں تھیں۔ کسانوں، خاص طور پر چھوٹے زمینداروں کی حالت خراب ہو جاتی جس کی روک تھام کے لیے کرزن نے قانون کا نفاذ کرایا۔اس کا ذکرا کسفورڈ کی تاریخِ ہندوستان میں اس طرح کیا گیا ہے۔

All observers are agreed that the almost universal indebtedness of the peasantry and the numerous transfers of ownership or tenant-right to members of the trading and money lending classes are evils to be deplored. But they are evils more easily deplored than remedied. It is extremely difficult to prevent a willing seller from concluding with an eager buyer a transaction in no way immoral, although deemed by authority to be contrary to the public interest. The mischievous effects of the alienation of land were felt with especial severity in the Panjab, where agitatorshave not been slow to take advantage of the discontent ofdispossessed landholders.The Government of Lord Curzonattempted a remedy by passing the Land Alienation Act (XIII of 1900) applicable to that province. The broad effect is described as being that' money-lenders, shopkeepers and professional men cannot buy land from hereditary cultivators, or hold such landon mortgage for more than twenty years without the consent of the State'.The sale of land to the excluded classes under decree of court is also forbidden. The difficulty of working such an arbitrary prohibition and the facility of evasion are

> obvious. Theprinciple of the Act has been extended to certain olher territories. Co-operative rural banks, modelled on a German system, have beenestablished in the hope of lessening the burden of debt on thepeasantry.(۲)

اس طرح اہل ہند کے تاریخ شعور میں پہلے سے زیادہ پختگی آئی۔ ہندوستان کے عوام نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی آواز بلند کرنا شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ: ''۱۹۰۱ء میں تقسیم بنگال کے باعث جو شورش بنگال میں ہوئی تھی۔ اس کی آوازیں براہ راست پنجاب میں آنی شروع ہوئیں۔'' (۳) ۱۹۰۱ء میں بنگال کی نام نہاد تقسیم ہوئی، اس میں وائسرائے ہند کا عمل دخل شامل نہیں تھا۔ صرف ماتحت اداروں کی بحالی کے بات چیت کی گئی۔ لیکن دو سال بعد ۱۹۰۳ء کو حتمی تجویز سامنے نہیں آئی۔ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر نے اپنے کندھوں پر سے معاشی بوجھ کم کرنے کی تجویز دی۔ اس وقت ۱۸۹۰۰۰ مربع میل پر پھیلے ہوئے علاقے کا انتظام کرنا مشکل تھا جس کی آبادی اٹھہتر لاکھ تھی، اس میں کامیابی کے کم امکانات تھے۔ مشرقی بنگال معاشی اور معاشرتی طور پر نظر انداز کیا گیا تھا۔ اس طرح کئی ایک جرائم نے جنم لیا جن کا ریکارڈ مہیا کرنے کے لیے کہا گیا۔ اوکسفورڈ کی تاریخِ ہندوستان میں تقسیم بنگال کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> The discussion about the re-arrangement of certain provincial boundaries had begun among his subordinates in 1901, but no definite proposal was made until two years later, in 1903, when the Lieutenant'-governor of Bengal propounded a certain plan for lightening the intolerable burden resting upon his shoulders. At that time he was supposed to administer a territory comprising 189,000 square miles with a population of seventy-eight millions. The task could not beperformed with any approach to success. Eastern Bengal especially was utterly neglected, financially starved, and allowed to present the most astounding record of modern crime in existence.(۴)

مشرقی بنگال کو جب معاشی لحاظ سے نظر انداز کیا گیا تو بنگال کے گورنر کی تجویز کے مطابق سپاہیوں کا معاشی بوجھ کم کرنے کے لیے بنگال کی تقسیم کی گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے عوامی معاشی پالیسیوں کے حوالے سے

بہت حد تک نظر انداز ہوئے تھے۔ سماجی صورتِ حال زیادہ اچھی بھی نہیں تھی۔ بنگلہ دیش میں انگریز حکومت کے طے کیے گئے احداف حاصل کرنے میں جب کامیاب نہ ہوئی تو عوام میں عجیب طرح کی مخدوش فضا پیدا ہوگئی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود ۱۹۰۵ء میں دوبارہ بنگال کو آسام سے لگ کر دیا گیا۔ جس کی تفصیل اوکسفورڈ تاریخِ ہند میں لکھا ہے:

In 1905 the proposals of the Government of India took definite shape. Their main features, as modified by the Secretary of State in Council, were the separation from the Calcutta Government of the Divisions of Dacca, Chittagong, and Rajshahi, the suppression of the Chief Commissionership of Assam, and the formation of a new province called' Eastern Bengal and Assam'under a Lieutenant-governor with his capital at Dacca.(۵)

ہندوستان کی عوام میں ہندوؤں کی قیادت میں سیاسی اور تاریخی شعور کے مدارج تیزی سے طے کر رہی تھی۔ آغاز میں موتی لال، گوکھلے، تلک جیسے سیاست دان کانگریس کے ممبر تھے۔ یوں تو کانگریس بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ایک روایتی سیاسی جماعت بن کر رہی گئی تھی۔ سال بھر میں ایک دو سیاسی جلسے ہوتے تھے اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس دوران حکومتِ ہند نے ایک مرتبہ پھر ۱۹۰۵ء آسام کو بنگال سے الگ کر دیا گیا۔ اسے تقسیمِ بنگال کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے۔ علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک کی قیادت میں کل ہند مسلم لیگ کی ۱۹۰۶ء میں بنیاد رکھی گئی۔ درحقیقت ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کے مسلمان نمائندے مسلم لیگ کے قیام کے لیے ایک ریزولیوشن پیش کرتے ہیں: ''جو ڈھاکہ میں مجتمع ہوئے ہیں۔ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک سیاسی انجمن قائم کی جائے جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہو۔''(۶) مسلم لیگ کی بنیاد اُسی صوبے میں رکھی گئی جس کو بار بار سیاسی مسائل کا سامنا کرنا پڑھ رہا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیمِ بنگال ایک مرتبہ پھر منسوخ ہوگئی۔ جسے اہلِ ہند کے سیاست دانوں اور عوام نے اپنی فتح تصور کیا۔ سردار پٹیل، ہردیال بابو، جواہر لال نہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ میں کانگریس کی باگ ڈور آ چکی تھی۔ یہ کانگریس کے اہم رہنماؤں میں سرِ فہرست تھے اور بڑھ چڑھ کر ہندوستانی عوام کے حقوق کو تحفظ دینے میں سرگرم تھے۔ حکومت ہند، ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال سے کسی قدر پریشان تھی۔ آئے روز انھیں کسی نہ کسی نئے مسئلے سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں قائد اعظم مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل کا آغاز ہوا۔ میثاقِ لکھنؤ کا واقع کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ۱۹۱۶ء میں پیش آیا۔ ۱۹۱۹ء میں جنگ کا اختتام ہوا۔ اسی سال رولیٹ ایکٹ نافذ ہوا۔ اور اسی سال

امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں نہتے عوام کے قتلِ عام کا واقعہ پیش آیا۔ جنگِ عظیم اوّل کے دوران گاندھی جی افریقہ میں تھے۔ گاندھی جی ہندوستانی سیاست میں رولیٹ ایکٹ کے خلاف ستیا گرہ، ترک موالات اور تحریک خلاف کی حمایت کے زمانے میں نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نامور لیڈر بن گئے۔ ۱۹۲۵ء میں راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ (آر۔ ایس۔ ایس۔) ایک شدت پسند تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ آر ایس ایس کے قیام کے بارے میں حارث بشیر کی رائے ہے کہ: ''راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ کا قیام ۲۷/ دسمبر ۱۹۲۵ء مطابق وجے دشمی (دسہرہ) کے موقع عمل میں آیا۔ اس دن ڈاکٹر ہیڈ گیوار جی کے مکان پر ۲۰۔۱۵/ افراد جمع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے سامنے ہندو تنظیم شروع کرنے کا کام شروع کرنے کی ضرورت پر اپنا خیال پیش کیا۔'' (۷) راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ درحقیقت ہندوستان میں رہنے والی تمام قوموں کی نفی کر چکی تھی۔ صرف ہندوؤں میں ہندو ہونے کا قومی شعور بیدار کیا گیا تھا۔ آر ایس ایس ہندوستان کے دوسرے مذاہب کی ہر موقع پر مخالفت کر رہی تھی۔ لیکن ہندوؤں کے مذہبی رہنما اس جماعت کو تسلیم بھی نہیں کرتے تھے اور اس کا ذکر بھی زبان پر نہیں لاتے تھے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ جماعت مسلمانوں کے خلاف تھی۔

۱۹۲۸ء میں جواہر لال نہرو نے کانگریس کے اجلاس میں ایک رپورٹ پیش کی جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۲۹ء میں قائداعظم نے بڑے مدلل انداز میں چودہ نکات پیش کیے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء میں ہندوستان کی سیاسی قیادت کی انگلینڈ میں گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ ان کانفرنسوں میں مسلم لیگ کو خاص طور پر بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۳۳ء کو ہی قائداعظم مستقل طور پر مسلم لیگ کے ممبر ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلم اکثریت والے صوبوں میں ۹۰ فیصد کامیابی حاصل ہوئی۔ یوں مسلم لیگ ہندوستان کی عبوری حکومت کا حصہ بننے میں کامیاب ہو گئی۔ اس حکومت میں مسلم لیگ کو وزیرِ خزانہ کی وزارت ملی۔ خان لیاقت علی خان ہندوستان کی عبوری حکومت کے پہلے مسلمان وزیرِ خزانہ رہے۔ اس وزارت کے توسط سے مسلم لیگ نے کانگریس کے لیے ہر مرحلے میں ایسی ایسی مشکلات پیدا کیں کہ کانگریس سرعام تقسیم ہند کا چرچا کرنے لگی۔ ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ اس سے اگلے دن ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت آزاد ہوا۔ گویا بھارت انگریزوں اور مسلم لیگ سے ایک ساتھ آزاد ہوا۔ اور اسی طرح پاکستان نے بھی دہری آزادی، بیک وقت انگریزوں اور ہندوؤں سے حاصل کی۔

ب: ایشیائی ممالک میں قومیت پرستی کا شعور، آزادی کی تحریکیں اور سامراج کے خاتمے کے آثار

ایشیائی ممالک عوام میں قومی شعور بیدار ہونے کی بڑی وجہ کسی ملک کے اندر یکساں قومیت اور قومی شعور کا ہونا تھا۔ جیسے چین، جاپان، فلپائین کے ممالک کی مثال اہمیت کی حامل ہے۔ وسط ایشیا میں عربی زبان کی وجہ سے قومیت کا احساس پہلے سے موجود تھا۔ افغانستان میں اگرچہ قوم پرستی کا نعرہ کبھی بھی بلند نہیں ہوا۔ مگر افغانستان کے عوام کو جب بھی بیرونی خطرہ

محسوس ہوا وہ یکجا ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم پرستی کا لاشعوری تصور افغانوں کے اندر موجود تھا۔ نو آبادیاتی دور میں افغانستان واحد وہ ملک تھا جو مکمل آزاد اور خود مختار تھا۔ ملک کے اندر کی خانہ جنگی اُن کا ذاتی مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ مگر ایسی صورت حال کے پیشِ نظر بھی انگریزوں کو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ افغانستان پر قبضہ کر لیں۔ جب کبھی انگریزوں نے ایسا سوچا تو انھیں شدید جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اسی طرح کی صورتِ حال وسط ایشیائی ریاستوں کی بھی تھی۔ ایک وقت تھا کہ روس نے خوقند پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایسا صرف اس صورت میں ہوا تھا کہ حکمران نہایت ہی ناتجربہ کار اور کمزور دل واقع ہوئے تھے۔ البتہ سوائے ایک دو کے وسط ایشیائی ریاستوں کا الحاق ان کی مرضی سے ہوا تھا۔ مشرق کی طرف روس نے چین کے صوبے منچوریا پر قبضہ کر رکھا تھا۔ لیکن جبر اور ظلم ستم روا نہیں رکھا۔ عوام کو وقت کی ضرورت کے مطابق سہولتیں باہم پہنچائیں۔ روس کا یہ قبضہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ ۱۹۰۵ء میں جاپان نے حملہ کر کے روس کو شکست دے دی۔ جس نے ایشیائی ممالک کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ ساتھ ہی یورپ اور امریکہ کو بھی بے انتہا حیرت ہوئی تھی۔ ایشیا میں قومیت پرستی کی ایک مثال انسائیکلوپیڈیا میں اس طرح ہے کہ: ''۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء میں روس و جاپان کے درمیان جنگ ہوئی۔ ...... منچوریا چین کو واپس مل گیا، ۱۹۰۵ء میں قومی بیداری اس پیمانے پر پہنچ چکی تھی کہ امریکہ کے مال کا بائیکاٹ شروع ہو گیا۔'' (۸) جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست اور منچوریا کی خود مختاری کی خبریں پورے ایشیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایشیا میں جہاں جہاں برطانیا کی نو آبادیات تھی وہاں پر حکومت کے مخالف لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ آزادی کی تحریک میں تیزی واقع ہوئی۔ سیاسی لیڈروں میں قومی شعور بیدار ہوا۔ تقسیم بنگال پھر یونیورسٹی ایکٹ کی وجہ سے بہار، بنگال اور اڑیسہ میں شدید احتجاج ہوا جسے کم کرنے کے لیے لارڈ کرزن نے تقسیمِ بنگال کی تاکہ احتجاج کا دباؤ کم ہو سکے، عبدالرحمٰن امرتسری کی ایک رائے کے مطابق: ''جاپان اور روس کی عظیم لڑائی میں جو کامیابی جاپانیوں کو ہوئی تھی۔ اُس سے بنگالیوں کے خیالات میں اور بھی تلاطم پیدا ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر لارڈ کرزن نے سال آئندہ میں تقسیم بنگالہ کی کاروائی شروع کر دی جس سے غالباً اُن کی متحدہ قوت کا منتشر کرنا مدِ نظر تھا۔'' (۹) جب جاپان نے روس کے قبضہ سے چین کا صوبہ منچوریا آزاد کرایا تو اُس وقت جواہر لال نہرو انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھوں ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کا عکس اپنے قیام برطانیا میں سن لیا تھا اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ: ''۱۹۰۷ء میں ہندوستانی قومیت کا نئے سرے سے ابھرنا کھلی ہوئی رجعت پسندانہ تحریک تھی۔ جیسا کہ مشرق کے ملکوں میں ہوا تھا ہندوستان میں بھی قومیت کی نئی تحریک لازمی طور پر مذہبی چیز بن گئی۔'' (۱۰)

☆ انیسویں صدی اختتام پذیر ہو رہی تھی تو یورپ میں صنعتی اسلحہ اور جنگی ساز سامان کی نمائش ہو رہی تھی۔ یہ وہ ترقی تھی جو ایشیا اور افریقہ سے لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر کی گی تھی۔ جن ممالک سے یہ دولت لوٹی گئی تھی، اُس کی عوام کی صورتِ حال ناقابل بیان تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عوام میں سیاسی اور قومی شعور بیدار ہونے کی پیش رفت ہو رہی

تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی قیادت سے عوام کے اندر جرأت مندی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ انگریزں کے خلاف اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانے لگے تھے۔ انیسوی صدی میں بننے والی سیاسی جماعتوں اور تحریکوں نے بیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی ہندوستان میں انگریز حکومت کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ ہندوستان کی عوام ہندو، مسلمان، سکھ اور دوسری ذاتیں ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ اس قسم کے مخلوط معاشرے میں قومی شعور کا پیدا ہونا بڑا خوش آئین عمل تھا۔ سیاسی، مذہبی اور سماجی تحریکوں نے ہندوستانی معاشرے کو یکجا کرنے کی بجائے مزید تقسیم کر دیا۔ ہندو رہنماؤں کے مسلمانوں کے ساتھ سخت رویے کی وجہ سے دوقومی نظریہ کو مزید قوت ملی، کیوں کہ ان تحریکوں کا ہدف خاص طور پر مسلمان تھے۔ ایک مرتبہ جواہر لال نہرو نے بڑے سخت لہجے میں کہا تھا کہ: ''ہندوستان میں فقط دو جماعتیں ہیں ایک برطانوی امپیریلزم اور دوسری ہندو نیشنل ازم جس کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے۔ جناح نے فوراً جواب دیا ایک تیسری پارٹی بھی ہے۔ وہ ہیں مسلمان۔''(۱۱) ۱۹۰۱ء میں بنگال کی عارضی تقسیم کا واقعہ پیش آیا تو ردِعمل کی وجہ سے اسے جلد موخر یا منسوخ کرنا پڑا۔ تقسیم بنگال کی یوں تو بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے علاقے کے معاشی وسائل ہندوؤں کے علاقے کے عوام پر صرف ہو رہے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے حقوق کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ مرتضیٰ انجم کے بیان کی رو سے:

> اڑیسہ کے لوگوں کی درخواستوں اور عرضداشتوں کے نتیجے میں بنگال کی تقسیم کا مسئلہ لارڈ کرزن کے سامنے آیا۔ تقسیم کے کئی منصوبے تھے۔ مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی۔ ڈھاکہ کو مشرقی بنگال کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اس تقسیم سے مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کے راستے کھل گئے۔ جب تقسیم کی قطعی اسکیم شائع ہوئی تو مسلمانوں نے بڑے جوش وخروش سے اس کا خیر مقدم کیا۔''(۱۲)

جب تقسیم بنگال ہوئی تو لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ لارڈ کرزن کا ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اچھا اقدام یہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو جو طویل عرصے سے پسماندہ تھے، نجات دلانے کے لیے کوشش کی۔ یہ کوشش تقسیم بنگال کی صورت میں تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ: ''۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہندو کمزور پڑ جائیں گے اور بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک مستقل خلیج انھیں ایک دوسرے سے الگ رکھے گی۔''(۱۳) بنگال میں بھی ۱۹۰۴ء میں: ''تعلیم یافتہ لوگوں کو کرزن کے نئے یونیورسٹیز ایکٹ (قانونِ جامعاتِ ہند) نے لوگوں کو مشتعل کیا۔''(۱۴) مذکورہ ایکٹ نے جہاں ان کے حصولِ تعلیم کے مسائل پیدا کیے گئے وہاں کئی ایک دیگر اصلاحات بھی نافذ کی گئی۔ عبدالرحمٰن امرتسری لکھتے ہیں کہ: ''یونیورسٹی ایکٹ اور سالانہ تقریر کی مخالفت سے بنگالیوں کا غصہ بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کے اعلان سے اُن کا جوش اور بڑھا۔''(۱۵) بنگال میں وائسرائے ہند نے مسلمانوں کے حق میں

اہم فیصلے کیے لیکن ان کا ردِعمل شدید مخالفت کی صورت میں سامنے آیا۔ بنگال کے عوام تعلیم کے لحاظ سے ہندوستان کے دوسرے عوام کے مقابلے میں بہت آگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سیاسی اور قومی شعور بھی دوسرے خطے کے مسلمانوں سے کئی قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ ہندوؤں کی سازشوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے ہند سے ملاقات کرکے اپنے مسائل سے آگاہ کیا۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ:

> ''محسن الملک نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ رفقاء کے مشورے سے نواب محسن الملک نے طے کیا مسلمانانِ ہند کے نمائندوں کا ایک وفد وائسرائے کے پاس جائے۔ چنانچہ ۱۵، ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں مسلمان نمائندوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں وفد کے متعلق تمام امور کا فیصلہ ہوا۔ اور متفقہ طور پر ایڈریس کا مضمون منظور ہوا۔''(۱۶)

درحقیقت ہوا یوں کہ آغا خان کی قیادت میں مذکورہ وفد شملہ کے مقام پر وائسرائے ہند سے ملا۔ اس وقت وائسرائے لارڈ کرزن کی جگہ لارڈ منٹو تھے لہٰذا: ''یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو یہ وفد شملہ میں لارڈ منٹو سے ملا۔ جو اس وقت ہندوستان میں وائسرائے تھا۔ ہز ہائی نیس آغا خان نے وہ ایڈریس پڑھا جسے نواب عماد الملک نے لکھا تھا۔ جس میں مسلمانوں کی شکاتوں، دشواریوں اور حق تلفیوں کا ذکر کرنے کے بعد چند مطالبات بھی پیش کیے گئے۔''(۱۷) وائسرائے سے ملاقات کے بعد جب ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے ہندوستان مسلمانوں کے مستقبل کا لائحہ عمل اپنایا تو اس سلسلے میں: ''۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں مسلمان لیڈروں کا ایک سیاسی جلسہ ہوا۔ جس میں نواب سلیم اللہ خان رئیس ڈھاکہ نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔''(۱۸) یہ ایسا سیاسی جلسہ تھا جو آخر کار آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام قرار پایا۔ یہاں پر مذکورہ حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا قومی اور سیاسی شعور اب اُس سطح پر پہنچ چکا تھا کہ وہ ایک ساتھ انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی مکاری سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ مسلم لیگ واحد اور خالصتاً مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی جو صرف مقامی رہنماؤں کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی۔ کانگریس کے قیام کی طرح کسی انگریز کی قیادت کا سہارا نہیں لیا: ''مسلم لیگ کی تاسیس کا خیال خود مسلمانوں کو پیدا ہوا اور انھوں نے ہی اسے قائم کیا۔ اس کی منظوری کے لیے نہ کوئی انگلستان گیا نہ کسی سے اس کی تائید و حمایت کے لیے درخواست کی گئی۔''(۱۹) بنگال کے مسلمان تعلیمی اور سیاسی میدان میں ہندوؤں سے پیچھے نہیں تھے۔ بنگال کے ہندو اگرچہ تجارت پر قابض تھے۔ مسلمانوں کی زیادہ آبادی زراعت کے پیشے سے وابستہ تھی۔ ہندو سیاسی اعتبار سے باشعور تھے مگر مسلمان بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اب مسلمان، ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کے جال میں نہیں آتے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ہندوؤں کی پریشانی میں اضافہ ہوتا تھا۔ ہندو، مسلمانوں کو آزادی اور سیاست کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر نفرت کرنا شروع ہو گئے تھے۔ جس کی وضاحت ابوالکلام آزاد نے اس طرح کی ہے کہ: ''بنگال کے ہندوؤں نے یہ محسوس کرنا شروع

کر دیا کہ مسلمان ہندوستان کی سیاسی آزادی اور ہندوؤں کے خلاف ہیں۔'' (۲۰) سیاسی اور علمی اعتبار سے بنگال کے عوام اپنی ثابت قدمی منوا چکے تھے۔ ہندوؤں کے سیاسی اور انقلابی حلقوں میں مسلمانوں کی مخالفت بڑھ گئی تھی۔ جس کی وضاحت نہ صرف کانگریس کے ہندو لیڈر کر رہے تھے۔ وہاں پر کانگریس سے تعلق رکھنے والے مسلمان لیڈر بھی مسلم لیگی مسلمان رہنماؤں کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا۔ ابوالکلام آزاد نے اس کی وضاحت یوں کی کہ:

> بنگال کے چند مسلمان افسروں کی وجہ سے تمام مسلمانوں پر الزام تراشی نامناسب ہے۔ مصر، ایران اور ترکی کے مسلمان جمہوریت اور آزادی کے لیے انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور اگر سیاسی جدوجہد میں شامل ہو جائیں گے۔ میں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ مسلمانوں کی طرف سے سرگرم مخالفت یا سیاسی تحریک سے بے تعلق رہنے کی صورت میں سیاسی آزادی کی تحریک مشکلات سے دوچار ہو جائے گی۔ اس لیے ہمیں مسلمانوں کی حمایت اور دوستی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ (۲۱)

بنگال، بہار اور آسام کا علاقہ ایک صوبہ متحدہ تھا۔ جب لارڈ کرزن نے اسے تقسیم کیا تو بہار اور آسام کے ہندوؤں نے اس پر بہت زیادہ احتجاج کیا جس کی وجہ بنگال میں سیاسی صورتحال بگڑ گئی۔ سیاسی سطح پر رہنماؤں نے تقسیم بنگال کے ردِ عمل میں اُٹھنے والی تحریک کو فروغ دیا۔ ہندو تقسیم کی وجہ سے غصے میں تھے۔ مسلمان تقسیم بنگال پر اس وجہ سے خوش تھے کہ اب ان کے صوبے کے معاشی وسائل انہی پر خرچ ہوں گے۔ اس طرح کا قومی شعور بنگال کے لوگوں میں تعلیمی میدان میں ترقی کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا جس امر کی وضاحت عبدالرحمٰن یوں کرتے ہیں کہ:

> ۱۹۰۷ء میں جو شورش بنگال میں ہوئی اور جس کی ہولناک آوازوں نے پنجاب، مدراس اور ہندوستان کے چند دوسرے مقامات میں ۱۸۵۷ء کی یاد تازہ کر دی۔ اس کی ابتدا بھی کلکتہ سے ہوئی تھی۔ یہ شہر اس وقت سوسائٹی نہ صرف وائسرائے کا دارالحکومت بلکہ چار کروڑ بنگالی زبان بولنے والوں کی علمی سوسائٹی اور سیاسی لیڈروں کا مرکز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی حصہ میں نہیں۔ بنگالیوں نے انگریزی علم اور انگریزی خیالات میں جو ترقی کی اُس کا پہلا زینہ آزاد خیالی اور حق طلبی تھا جو نیشنل کانگریس کی شکل میں ظاہر ہوا۔ (۲۲)

ہندوستان کے عوام نے دیرپا غلامی برداشت کی تھی۔ طویل زوال کے بعد عوام میں سیاسی اور قومی شعور بیدار ہو اچکا تھا۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی جگہ سیاست کے میدان میں آزادی کے لیے سرگرمِ عمل تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی حوالے سے ان کی سوچ میں اس حد تک وسعت آئی کہ اُنھیں اس بات کا احساس ہوا کہ جب تک ایشیا کے مسلمان ایک ساتھ تحریک نہیں چلاتے انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لیے ایک جسم کی مانند تھے۔ جیسا کہ دوسری قوموں میں بھی یک جا ہو کہ مسلمانوں کی مخالفت پر کمر بستہ تھیں۔

جنگ بلقان میں بلغاریہ، سربیا، یونان اور مونٹی نیگرو نے مل کر ترکی کے ساتھ جنگ چھیڑ دی تھی۔ ان ریاستوں نے جلد ہی ترکی کو شکست دے دی اور صلح نامے کی شرائط میں ترکی سے تمام یورپی ریاستیں آزاد کرالیں تھیں۔ دوسری طرف اٹلی

اور فرانس نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کر کے جس میں عرب سرداروں نے ترکی کا ساتھ دیا تھا۔ تاہم اٹلی اور فرانس نے اس جنگ میں بھی ترکی کو شکست دے دی تھی۔ ترکی اندرونی کش مکش کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا جس کے باعث اٹلی اور بلقانی ریاستوں سے شکست کھا گیا تھا۔ شکست کے یہ دونوں واقعات ایسے تھے جس کے باعث جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا ہوئی۔ محمود الحسن ترکی کی ناکامی کا پس منظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

> بلقان کے خون خوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کنندہ اثر ڈالا چنانچہ اس وقت حسب طریقہ اُستادِ اکبر مولانا قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ (در جنگ روس) مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کرایا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی، مگر اس سے بھی چین نہ پکڑا کیوں کہ جنگ بلقان کے نتیجہ نے دور بینوں کو بالکل غیر مطمئن کر دیا تھا۔ کہ یورپ کے سفید عفریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی فکر میں ہیں۔ (۲۳)

بلقان اور طرابلس کی جنگ میں ترکی کی صورتِ حال جس طرح تیزی سے خراب ہوئی۔ مسلمانوں کی خلافتِ عثمانیہ انھیں خطرے سے دوچار نظر آئی۔ بلقان کے جنگی محاذ کی صورت حال انسائیکلو پیڈیا میں اس طرح ہے کہ:

> سرویا، بلغاریہ اور یونان نے بڑی یورپی طاقتوں کی انگیخت پر یہ جنگ شروع کی تھی۔ انہی طاقتوں کی انگیخت پر اس سے پیشتر اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تھا۔ دونوں کا خیال تھا کہ حکومت ترکی طرابلس کی جنگ میں الجھی ہوئی ہے اور بلقانی ریاستوں کی مجموعی قوت سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گی۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مانٹی نیگرو نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ دس روز بعد بلغاریہ، سرویا اور یونان نے اعلان جنگ کر دیا۔ بلغاریہ کرک کلیسی (KirknKilise) اور لولی برغاس (Lule Burgas) میں ترکی فوجوں کو شکست دی۔ نیز سرویا ڈلمیشیا کے ساحل پر پہنچ گیا اور بلغاریہ نے شتلجہ (Chatalja) کے خطوط پر حملہ کر دیا۔ اس سے روس اور آسٹریا کو تشویش پیدا ہوئی۔ روس کی تشویش کا سبب یہ تھا کہ کہیں بلغاریہ شتلجہ سے بڑھ کر قسطنطنیہ پر قابض نہ ہو جائے اور آسٹریا اس وجہ سے پریشان ہوا کہ سرویا، ڈلمیشیا پر قابض ہو کر ایڈریٹک کے بیچ کے ساحل پر پہنچ جائے گا۔ تو آسٹریا کے لیے خواہ مخواہ تشویش پیدا ہو گی۔ غرض اس طرح یورپی طاقتوں کے بیچ بچاؤ سے ۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ترکی، بلغاریہ اور سرویا کے درمیان متارکہ ہوا۔ لیکن یونان نے جنگ جاری رکھی۔ سقوطری (Scytari) کا محاصرہ مانٹی نیگرو نے کر لیا۔ ینینا اور ادرنہ پر یونان قابض ہو گئے، لندن میں صلح کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یورپی طاقتوں نے حکومت ترکی کو ادرنہ سے دست برداری پر راضی کر لیا۔ یہ خبر شائع ہوتے ہی قسطنطنیہ میں انقلاب برپا ہوا۔ کامل پاشا کی وزارت ختم ہو گئی۔ شوکت پاپا وزیر اعظم اور انور پاشا وزیرِ جنگ بنے۔ لڑائی از سر نو شروع ہو گئی۔ اب بلغاریہ نے ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء کو بلغاریہ اور ترکی کے درمیان متارکہ ہو گیا۔ آسٹریا نے مانٹی نیگرو سے، سقوطری کمانڈر نے یکا یک سرویا

اور یونان کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ اس طرح بلقانی ریاستوں میں چل پڑی۔ ترکوں نے اور نہ واپس لے لیا۔
آسٹریا نے پورا البانیا سرویا سے خالی کرالیا۔ یونان جنوبی البانیہ پر قابض ہو چکا تھا۔ آسٹریا اور اٹلی کے
مشترکہ مطالبے نے البانیا کا یہ حصہ بھی آزاد کرلیا۔ معاہدہ مختلف علاقے بلقانی ریاستوں کو مل گئے۔(۲۴)

درج بالا اقتباس لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ شمال مغربی ایشیا میں ترکی ایسا ملک تھا جو ۱۴۵۳ء سے ۱۹۱۳ء تک سپر طاقت تھا۔ مگر اہل یورپ نے ترکی کے خلاف ایسی سازشیں کیں۔ ایسی چالیں چلیں کی پہلی جنگِ عظیم سے پہلے ہی ترکی کو مرد بیمار قرار دے دیا گیا۔ کیوں کہ پہلی جنگِ عظیم سے قبل ہی ترکی کئی ایک یورپی ملکوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ زیادہ تر محاذوں پر ترکی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ترکی کو پے درپے شکست نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بے چین کر دیا۔ کیوں کہ ہندوستان برطانیا کی غلامی میں تھا اور ترکی آزاد اور خود مختار، خود کئی ایک نوآبادیوں کا مالک تھا۔ ترکی کی کمزور صورتِ حال دیکھ کر ترکی کی امداد پہنچانے کے لیے چندے جمع کیے۔ ترکی کے لیے ہندوستان کے مسلمان بہت زیادہ فکر مند تھے جس کا ذکر جواہر لال نہرو نے اس طرح کیا ہے کہ: ''۱۳-۱۹۱۲ء کی بلقان جنگ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مزید مشتعل کیا تھا۔ دوستی اور خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ہندوستان کی طرف سے طبی امداد بھجوائی گئی۔ اسے ریڈ کریسنٹ مشن کہا گیا جس کے تحت ترک زخمیوں کی مرہم پٹی میں ہندوستانی امداد مہیا کی گئی۔''(۲۵) بلقانی ریاستوں سے ترکی نے شکست کھائی جس کی وجہ یہ تھی کی ترکی طرابلس کی جنگ میں شکستہ ہو چکا تھا۔ درحقیقت یہ سربیا اور یونان کی چال تھی کہ ترکی کو ایسے دونوں محاذوں پر جنگ میں مصروف کر دیا جائے جو ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر ہوں۔ طرابلس میں ترکی اٹلی کے ساتھ مصروفِ کار تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے سربیا، مونٹی نیگرو، اور البانیاں نے مل کر: ''اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ترکی پر حملہ کر دیا ترکی تھکا ہوا اور غیر منظم تھا۔ ملک میں آئین پسندوں اور مخالفوں کے درمیان اقتدار کی جنگ برپا تھی۔ چناں چہ وہ بلقان لیگ کے سامنے چت ہو گیا۔ اسے بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ پہلی جنگ بلقان چند مہینوں میں ختم ہو گئی۔ ترکی کو مکمل طور پر یورپ سے باہر دھکیل دیا گیا۔ اب صرف قسطنطنیہ ہی ایسا یورپی علاقہ تھا جو اس کے قبضہ میں رہ گیا تھا۔''(۲۶)

انیسویں صدی سے ۱۹۱۲ء تک ترکی کی یورپ، افریقہ اور ایشیا تینوں براعظم میں وسیع ریاستیں تھیں۔ ترکی ان برِ اعظموں میں چھایا ہوا تھا۔ لیکن ۱۳-۱۹۱۲ء میں شکست کے بعد سوائے استنبول کے کوئی اور علاقہ ایسا نہیں تھا جو یورپ میں شامل ہو۔ افریقہ میں لیبا اور طرابلس پر اٹلی اور فرانس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد پہلی عالمی جنگ کی ابتدا ہوئی۔ ترکی نے جرمنی کو طاقتور ملک سمجھ کر اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور برطانیا، فرنس، روس، دائمی مخالف ملکوں کے ساتھ برسر پیکار ہوا۔ ویسے بھی عالمی جنگ میں ترکی کا حصہ لینا مجبوری کا باعث بنا تھا۔ کیوں کہ مستقبل قریب کی صورتِ حال اُسے نظر آ رہی تھی۔ ترکی کا جنگِ عظیم میں شرکت کا معاملہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ:

۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی اور ۱۹۱۵ء میں ٹرکی جرمنی کا حلیف ہو گیا۔ برطانیا کا خصوصاً اور

باقی یورپین سلطنتوں کا عموماً مسلم کشی کا پختہ ارادہ تھا۔اس وقت ایک سلطنت مسلمانوں کی ترکی تھی۔ ترکوں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شرکت نہ کی تو بعد از جنگ یہ سلطنتیں ہماری سلطنت کے حصے بخرے کرلیں گی۔ اس مجبوری کی حالت میں ترکی بھی جنگ میں کود پڑا۔اور جرمنی کا حلیف ہوگیا۔(۲۷)

جنگِ عظیم اوّل شروع ہونے سے پہلے۔فریقین، سامراجی طاقتوں کے درمیان میں معاہدے ہو چکے تھے۔ جنگ میں جرمنی اور اس کے اتحادی ایک طرف تھے۔ برطانیا اور اس کے اتحادی دوسری طرف۔ یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کے وقت ہندوستان کے مسلمان کس قومی اور ملی شعور سے گزر رہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔ جیسے انھوں نے بلقان کی جنگ میں طبی امداد کی تھی۔ جنگِ عظیم اوّل میں بھی ترکی کو امداد باہم پہچانا چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے مولانا محمود الحسن نے: ''ترکی کو امداد دینے کا یہ طریقہ سوچا کہ ایک طرف صوبہ سرحد میں شورش پیدا کی جائے اور دوسری طرف مولوی عبیداللہ سندھی کو کابل بھیج دیا جائے۔ مولانا سندھی کابل میں جا کر سلطنتِ افغان کو ترکی کی امداد کے لیے تیار کریں۔ اور خود شیخ الہند مدینہ منورہ جا کر انور پاشا کو توجہ دلائیں کہ ایک لاکھ فوج کابل بھیج دے۔'' (۲۸) مولانا محمود الحسن افغانستان اور ترکی کو متحد کر کے ہندوستان پر حملہ کرانا چاہتے تھے۔ ترکی کی مدد کرنا اس طرح ممکن تھا کہ اہل یورپ ترکی کے ساتھ شمال مغربی ایشیا میں جنگ میں مصروف تھے۔ اگر وہ ترکی کے علاقوں پر قبضہ کر لیتے۔ ادھر ترکی اور افغانستان مل کر برطانوی ہند پر پیش قدمی کر کے دریائے سندھ کے مغربی حصے کو آزاد کرا لیتے۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمان آزاد ہو کر ہندوستان میں افغانستان کے ساتھ مل جاتے اور برطانیا کو ہندوستان سے باہر نکال دیتے۔ جیسا جنگِ عظیم میں برطانیا کو زیادہ فوجی، اقتصادی اور جنگی ساز و سامان کی مدد ہندوستان سے مل رہی تھی۔ یہ مدد ختم ہو جاتی۔ برطانیا فوجی اور مالی طور پر کمزور ہو جاتا۔ اس طرح اسے جنگ میں بمعہ اپنے اتحادیوں کے شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔ مقالہ نگار کی یہ ذاتی رائے ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوتے ان کا بعد میں ہی علم ہوتا۔ یا پھر شیخ الہند کی منصوبہ بندی کامیاب ہو جاتی جنگِ عظیم کے بعد دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ اس کا پتا تاریخ کے اوراق ہی سے چلتا۔ مذکورہ منصوبے کی تکمیل کے لیے اپنے ایک شاگرد: ''مولانا عبیداللہ سندھی (کو) ۱۹۱۳ء میں مسجد فتح پوری کے اندر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عربی کی تعلیم دیا کرتے تھے انھوں نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ جس کے نام عبداللہ، فتح محمد اور محمد تھے اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔'' (۲۹)

مولانا عبیداللہ سندھی کا یہ سفرنامہ خالصتاً سیاسی بنیادوں پر لکھا گیا ہے۔ ریشمی رومال تحریک یا ریشمی خطوط کی تحریک تھی جس میں دیوبند کے علما نے ایران، ترکی اور افغانستان کو متحد کرنا اور اس کے بعد ہندوستان میں انگریز حکومت پر ایک

زوردار حملہ کرانا مقصد تھا۔لیکن منصوبہ بندی اورحکومتِ ہند کے خلاف سازش کا راز ظاہر گیا۔جس کی وجہ سے انگریز پورے ہندوستان میں گرفتاریاں کرنے لگے۔اس دوران: ''اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھی کابل پہنچ گئے۔''(۳۰) عبیدا للہ سندھی کے افغانستان جا پہنچے تو افغانستان میں: ''۷/اکتوبر ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتے میں ہندوستان کا ایک سیاسی مشن کابل پہنچ چکا تھا جس میں ترک اور جرمن بھی شریک تھے۔''(۳۱) یہ سیاسی مشن جرمنی سے افغانستان پہنچا تھا،افغانستان میں سیاسی اور جنگی مشن کے بارے میں تاریخِ ہندوستان میں بیان ہے کہ: ''جرمن و ترک سفیرانِ جنگ پہلے سے موجود اور امیر کابل (حبیب اللہ خاں) کو ٹو کنے میں مصروف تھے۔''(۳۲) افغانستان پہنچ کر مولانا عبید اللہ سندھی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے تھے۔تاریخی حقائق وواقعات جوانھوں نے اپنے سفرنامے میں بیان کیے ہیں۔کسی اور جگہ اتنی صداقت سے نہیں ملتے۔گاندھی جی کی سیاست میں منظرِ عام پر آنے کی حقیقت کومولانا عبیداللہ سندھی یوں بیان کرتے ہیں کہ: ''گاندھی جی نے افریقہ میں ستیہ گرہ کر کے کامیابی حاصل کی تھی اس وقت گاندھی نمودار ہوئے۔اور کہا میرے پیچھے لگو تو میں اس رولٹ ایکٹ کومنسوخ کراتا ہوں۔ایک تو اس بات پر ہندو اور مسلمان جمع ہوگئے۔''(۳۳) ہندوستان میں بھی گاندھی جی نے ستیہ گرہ کا تجربہ کیا۔عبیداللہ سندھی کہتے ہیں کہ: ''گاندھی جی نے سمجھایا کہ ستیہ گرہ سے یہ مشکلیں سب حل ہو جائیں گی۔''(۳۴) ستیہ گرہ پر تنقید کرتے ہوئے سید ہاشم فرید آبادی کہتے ہیں کہ: ''جب گاندھی جی نے ہندوستان گیر پیمانے پر ''سیتاگرہ'' کی چھچھوندر چھوڑی۔خود تین دن کا برت رکھا،لوگوں سے التجا کی کہ ایک دن کھانا پینا اور سب کاروبار بند کر کے دعائیں مانگیں اور خدا سے عہد کریں کہ جابرانہ قانون کی پابندی نہیں کریں گے۔''(۳۵) یہ کہنا کہ گاندھی جی اتنے بڑے سیاسی لیڈر نہیں تھے۔جتنا بڑا انھیں ہندوستان کی تاریخ نے ثابت کیا ہے تو ایسا کم علمی یا پھر ذاتی حسد کی صورت میں ہی ہوسکتا ہے۔گاندھی اپنے وقت کے بڑے لیڈر تھے۔اُن کا سیاسی انداز دوسرے جذباتی لیڈروں سے بالکل مختلف تھا۔دلوں کے بھید تو اللہ ہی بہتر جاتا ہے۔وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول واحد سیاسی لیڈر تھے۔یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ گاندھی جی اگرچہ ہندوستان کے بڑے رہنما تھے لیکن محمد علی جناح کی طرح ان کا موقف پختہ نہیں ہوتا تھا۔محمد علی جناح جس بات کا ارادہ کر لیتے تھے اُس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔گاندھی اپنے منصوبے اور سیاسی طریقہ کار بدلتے رہتے تھے۔دوسروں کے کہنے پر اپنے موقف سے ہٹ جاتے تھے۔تاہم وہ اُس وقت بھی بڑے لیڈر تھے جب نہرو کو لندن میں کم عمری کے باعث بیرسٹری میں داخلہ نہیں ملا تھا۔گاندھی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حق میں ستیہ گرہ کی تحریک چلا چکے تھے۔افریقہ کی انگریز حکومت کے مقابلے میں ان کی ستیہ گرہ کامیاب ہو چکی تھی۔گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ: ''لارڈ ہارڈنگ نے تو سخت تقریر کر ڈالی۔اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے ستیہ آگرہیوں کی پوری پوری حفاظت بھی کی۔یہاں تک کہ ہماری خواہشات اور انداز کار کی تائید کردی۔''(۳۶)

البتہ ان کی سیاسی سطح پر دوغلی پالیسی سے ہندوستان کے عوام کو نقصان پہنچا۔ انگریز حکمران جب چاہتے انھیں ہندوستان کے عوام کے خلاف استعمال کر لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کو آزاد ہونے میں زیادہ تاخیر کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان میں ستیا گرہ تحریک چلائی تو گاندھی جی نے بمبئی سمندر کے ساحل پر جا کر ایک مٹھی نمک بنانا تھا۔ غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ: ''ایک جانب ایک مشت بحری نمک رکھا ہوا تھا۔ پنجاب کے باشندے نہیں سمجھ سکتے کہ بحری نمک کیا ہوتا ہے؟ وہ نمک جو سمندر کے پانی سے بنتا ہے اور جسے بنانے کے لیے گاندھی جی نے پچھلے دنوں خلاف ورزی قانون کی تحریک شروع کی تھی۔'' (۳۷) اصل میں حکومتِ ہند نے نمک پر بھاری ٹیکس لگا دیا تھا جس کی نافرمانی کا گاندھی جی نے بڑا انوکھا طریقہ تلاش کیا تھا کہ حکومتی اشیا کا بائیکاٹ کیا جائے۔ جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ: ''ستیہ گرہ تحریک کی شروعات تھیں، ۶ ر اپریل ۱۹۱۹ء، اتوار کو پورے ملک میں ستیہ گرہ کا دن منایا گیا۔'' (۳۸) مسلمانوں کے خلاف آنے والے رولیٹ ایکٹ کو منسوخ کرانے کے لیے گاندھی جی پیش پیش ہوئے۔ ویسے بھی عبید اللہ سندھی کا کہنا ہے کہ: ''یہ گاندھی جی کے ظاہر ہونے کی تاریخ ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ گاندھی جی مسلمانوں کی ٹھوکر سے نمودار ہوا ہے تو درست ہوگا۔'' (۳۹) رولیٹ ایکٹ کو کالا قانون بھی کہا جاتا تھا، اصل میں پنجاب کے علما کو سزا دینے کے لیے مارشل لا نافذ کیا گیا تھا۔ اس بارے میں جواہر لال نہرو اپنی بیٹی کی توجہ اس طرف دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ان دنوں پنجاب میں مارشل لا نافذ تھا اور پورے ہندوستان میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ خلافت کے سوال پر مسلمانوں میں احتجاج بڑھتا جا رہا تھا۔'' (۴۰) جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے کہ رولیٹ ایکٹ مسلمانوں کو سزائیں دینے کے لیے بنایا گیا تھا تو اس بارے میں سرگزشتِ قابل میں ذکر ہے کہ: ''کانگریس میں شور تھا کہ رولٹ ایکٹ اگرچہ مسلمانوں کے نام پر بنا ہے مگر ہندوستانیوں اور انقلابیوں کے لیے بڑا سخت ہے۔ اسی شورش کے ایام میں گاندھی نمودار ہوا۔ اور اسی شورش کے زمانے میں جنگ افغان واقع ہوئی۔'' (۴۱) سرگزشتِ کابل کے راقم کی ذاتی رائے ہے کہ: ''مولانا کے ریشمی خطوط ظاہر ہوئے اور بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ اس کے بعد رولٹ ایکٹ بنا۔ رولٹ ایکٹ کے دفعات بہت سخت تھیں۔ اگرچہ رولٹ ایکٹ میں صاف لکھا تھا کہ مولوی عبید اللہ سندھی کی تحریک کو دبانے کے لیے یہ ایکٹ بنایا جاتا ہے۔'' (۴۲) رولٹ ایکٹ کا اثر ہندو انقلابیوں پر بھی پڑا، جس وقت: ''رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تو ہندو اور مسلمان سب اس ایکٹ کے خلاف جلسے کرنے لگے اس سے پہلے گاندھی جی انگریزی لشکر جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور خلوصِ دل سے گورنمنٹ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔'' (۴۳)

رولیٹ ایکٹ کے خلاف پنجاب میں جگہ جگہ احتجاج ہوا خاص طور پر امرتسر میں کئی ایک احتجاجات ہوئے جنھیں روکنے کے لیے انگریز حکومت نے سختی بڑھا دی اور بعض مقامات پر نہتے لوگوں کو گولی کا نشانہ بھی بنایا۔ پنجاب کے شہروں: '' جلیانوالا باغ امرتسر میں فساد ہوا اور لاہور میں بھی فساد ہوا۔ وزیر آباد کا اسٹیشن جلایا گیا۔ اسی طرح احمد آباد میں بھی سخت فساد

ہوا۔''(۴۴) حقیقت میں جلیانوالہ باغ میں ہونے والے جلسے میں بے شمار لوگ مارے گئے، جن کا ذکر جواہر لال نہرو نے اس طرح کیا ہے کہ: ''امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ۱۳/اپریل کو نہتے عوام پر اندھا دھند فائرنگ سے جو قیامت ڈھائی گئی وہ ساری دنیا کے علم میں ہے۔ موت کے اس شکنجے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔''(۴۵)

ستیہ گرہ تحریک گاندھی جی نے خالص طور پر حکومت کے نمک پر ٹیکس عائد کرنے کے خلاف چلائی تھی۔ اس ٹیکس کو ادا نہ کرنے یا حکومت سے نمک نہ خریدنے کے خلاف گاندھی جی نے بمبئی کے ساحل پر لوگوں کو مٹھی بھر نمک بنانے کی ترکیب بھی بتائی تھی۔ اس کے بعد اگلے مرحلے میں انگلستان کی بنی ہوئی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا تھا۔ اس بائیکاٹ، عدم تعاون یا ترکِ موالات تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کو مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے خوب فروغ دیا۔ تحریکِ عدم تعاون میں: ''خلافت کمیٹی اور کانگریس آپس میں متحد ہو گئے تھے۔ اور مسلمانوں کو بڑی پریشانی تھی کہ تختِ خلافت پر اتحادیوں کا قبضہ تھا۔''(۴۶) تحریک عدم تعاون میں سب سے پہلے مسلمان، گاندھی جی کے ساتھ شریک ہوئے جس کی وضاحت جواہر لال نہرو نے یوں کی ہے کہ: ''مسلمان اتنے ہی پُر جوش تھے جس قدر دوسرے لوگ۔ حقیقت یہ ہے کہ علی برادران کی قیادت میں خلافت کمیٹی نے تو یہ پروگرام، کانگریس سے پہلے اپنا لیا تھا۔''(۴۷) جواہر لال نہرو کا گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک کے بارے میں یہ خیال ہے کہ: ''گاندھی جی کے عدم تعاون کے پروگرام پر عملدرآمد شروع ہوا۔''(۴۸) گاندھی جی ستیہ گرہ اور عدم تعاون تحریک شروع کرنے سے پہلے انگریزوں کے لیے فوج بھرتی کر کے صحیح معنوں میں انگریزوں کے لیے جانثاری کا ثبوت دیا تھا۔ خود کو انھوں نے سیاست سے تو دور رکھا ہوا تھا مگر: ''جنگ کے دنوں میں لوگوں کو بھرتی کر کے حکومت کی مدد کرتے رہے تھے۔''(۴۹) گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک بڑی کامیابی سے چل رہی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مطلوبہ مقاصد حاصل ہونے والے تھے کہ گاندھی جی کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا تھا اور تحریک عدم تعاون وہاں پر ناکام ہو گئی تھی۔ جواہر لال نہرو نے اس بارے میں لکھا ہے کہ: ''گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا، انھیں چھ سال کی سزا دی گئی۔ یہ مارچ ۱۹۲۲ء کی بات ہے، اس تحریک کے ساتھ ہی تحریک عدم تعاون کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا۔''(۵۰) جب گاندھی جی گرفتار ہوئے تو صحافی غلام رسول مہر سعودی عرب میں تھے۔ انھیں گاندھی جی کے گرفتاری کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی چند اور خبریں موصول ہوئیں جن کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے کہ: ''گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ہمیں منیٰ میں مل چکی تھی، نیز کسی نے بتا دیا تھا کہ پشاور میں ہنگامہ ہو گیا ہے۔ اسماعیل جدہ سے بہت سی خبریں لایا۔ یعنی ڈاکٹر عالم، ڈاکٹر ستیہ پال اور مولانا ظفر علی خان کی گرفتاری، پشاور کے ہنگامے کی تفصیلات، مولانا عبدالقادری قصوری کا بیان، پریس ایکٹ کا بذریعہ آرڈی نینس نفاذ۔''(۵۱)

☆ مولانا عبیداللہ کے افغانستان پہنچے تو وہاں پر بھی انگریزوں کے خلاف جرمن اور ترک متحرک تھے۔ جرمن اور

ترک چاہتے تھے کہ افغان حکومت، ہندوستان کی انگریز حکومت پر حملہ کرے۔اس پیچیدہ صورت حال کو مولانا عبیداللہ سندھی نے یوں بیان کیا ہے کہ جو:''ہندوستانی مشن جرمنی سے کابل آیا تھا اس کو اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے یہ جواب دیا کہ جب تک جرمنوں اور ترکوں سے ہم کو ایک لاکھ لشکر کی امداد نہ ملے گی اس وقت تک ہم جنگ سے غیر جانبدار رہیں گے۔اس پر بھی ایک مدت تک اعتماد تھا اور اسی بنا پر ریشمی خطوط بھیجے گئے تھے۔''(۵۲) ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو فروغ دینے میں علما دیوبند کا بڑا اہم کردار ہے مگر ان کے اس کردار کی اس لیے تعریف نہیں کی گئی کیوں کچھ علما آزادی کے تو حق میں تھے مگر ہندوستان کی تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔لیکن عبیداللہ سندھی کا معاملہ کچھ اور تھا وہ آزادی کے بھی حق میں تھے اور تقسیم کے بھی، جیسا کہ:''مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریک یہ تھی کہ ماورائے دریائے سندھ آزاد کرالیا جائے۔اور اسی تحریک کو عملی شکل میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔''(۵۳) مگر اس سلسلے میں آگے چل کر سفرنامے اور تاریخ کے تناظر میں بات ہوگی۔یہاں اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ:''جرمنی اور یورپ کے کچھ دوسرے ممالک میں مقیم ہندوستانی باشندے برلن میں اکٹھے ہوئے۔وہ انگلستان کے دشمنوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔''(۵۴) ہندوستان کے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں ترک اور جرمن جنگی سفارت پہلے برلن میں سر جوڑ کر بیٹھی پھر ترکی میں اور اس کے بعد افغانستان میں امیر احبیب اللہ خاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔دراصل ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف افغانستان سے زیادہ محفوظ اور مضبوط مورچہ اور کہیں نہ تھا۔اس لیے ہندوستانی نوجوانوں نے ترک اور جرمن وفد کی توجہ افغانستان کی طرف دلائی۔افغانستان کا سیاسی، عسکری اور جغرافیائی جائزہ لینے کے لیے ترک اور جرمن افغانستان میں آئے تو ان کی ملاقات عبیداللہ سندھی سے بھی ہوئی۔جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> حربِ عمومی شروع ہونے پر جس قدر ہندوستانی آزاد پسند نوجوان یورپ میں موجود تھے وہ سب برلن میں جمع ہوگئے۔اور انھوں نے جرمن دفتر خارجہ کے ماتحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی جس میں ہردیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ بھی شامل تھے۔اس انڈین نیشنل پارٹی کے زیر اہتمام راجہ مہندر پرتاب اور اس کے رفقا کو جن میں مولوی برکت اللہ شامل تھے ترکی اور جرمنی افسروں کے ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا تھا۔یہ مشن ہم سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہنچ چکا تھا اور اسکی رسمی ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں۔(۵۵)

اسی بات کی آگے چل کر پنڈت جواہر لعل نہرو وضاحت کرتے ہیں کہ:''اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی۔جرمن حکومت تو فطری طور پر ایسی کسی بھی مدد کی متمنی تھی۔اس نے ان ہندوستانی انقلابیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔باقاعدہ ایک تحریری سمجھوتہ دونوں فریقوں یعنی جرمن حکومت اور ہندوستانی کمیٹی کے درمیان طے پایا کہ جنگ کے دوران ہندوستانی عوام جرمنی کی مدد کریں گے۔''(۵۶) درحقیقت جرمنی میں ہندوستانی انقلابیوں نے جرمن کی اعلیٰ قیادت سے ہندوستان میں

موجود انگریز حکومت سے جنگ کرنے کے لیے اسلحہ کا بھرا ہوا جہاز بنگال بھجوا دیا تھا اور قیاس کیا جا رہا تھا کہ بنگالیوں نے وہ اسلحہ جنگلوں میں کہیں چھپا دیا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب جرمن اعلیٰ قیادت کو مولانا عبیداللہ سندھی نے بتایا کہ جنگ کا مرکز، بنگلہ دیش نہیں بلکہ وڈھ (وڈھ بھیر) ہے تو: ''جرمن چانسلر نے یہ بات سن کر نقشہ منگوایا اور نقشہ سے معلوم کیا کہ واقعی وڈھ کا علاقہ جنگی مرکز کے لیے اچھا مقام ہے۔'' (۵۷) اس کے ساتھ ساتھ مولانا عبیداللہ سندھی نے جرمنوں کے سامنے اس بات کی وضاحت بھی کی کہ: ''بنگالی ہندو ہوں خواہ دوسرے لوگ ہوں وہ جنگی لوگ نہیں ہیں۔ یہ خفیہ طور سے کہیں بم گرا دیتے ہیں۔ ان کی عادت جنگی نظام سے لڑنے کی نہیں ہے۔ جرمن چانسلر نے حیران ہو کر کہا کہ پہلے ہم نے ہندوستانی مشن سے کہا تھا کہ پہلے صوبہ سرحد کی طاقت اور حالات کا اندازہ کرنا چاہیے پھر مشن بھیجنا چاہیے۔'' (۵۸) ترک اور جرمن وفد سے مولانا عبیداللہ سندھی کی ملاقات اُس وقت ہوئی جب اس وفد کا سرکاری دورہ ایک ہفتے بعد اختتام پذیر ہوا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا آزادیٔ ہندوستان کے جوش و جذبے ہندوستان کے: ''نوجوان انقلابیوں سے دو قدم آگے تھے۔ کابل میں انھوں نے جرمن وفد سے رابطہ قائم کر لیا، اپنی تجویز کی خفیہ اطلاع ہندوستان کے ہندو مسلم اکابر کو بھیجی اور ان کی تائید حاصل کی۔'' (۵۹) مولانا عبیداللہ سندھی نے جنگ میں دیکھا کہ جرمنوں نے: ''ایک بڑا ذخیرہ جنگی سامان اور اسلحہ کا بنگال بھیج دیا۔'' (۶۰) تو انھوں نے ترک، جرمن وفد کو وڈھ میں اسلحہ فراہم کرنے اور جنگی مرکز بنانے کا مشورہ دیا۔ لیکن یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ جو اسلحہ جرمنوں نے بھیجا تھا جواہر لال نہرو کی رائے میں وہ اسلحہ بحرِ ہند میں انگریزوں کی بحریہ کے ہاتھ لگ گیا تھا: ''سمندر کے ذریعے ہندوستان میں اسلحہ بھیجنے کی ایک کوشش کی گئی۔ جو برطانوی بحریہ نے ناکام بنا دی۔ جرمن کی شکست نے ہندوستانی کمیٹی اور اس کی امید کو ختم کر دیا۔'' (۶۱) چوں کہ جواہر لال نے دو مختلف واقعات کو ایک ساتھ بیان کر دیا ہے، ایک تو ہندوستانیوں کو اسلحہ فراہمی کی مہم دوسرے جرمنی کی شکست، اسلحہ فراہمی اور جرمنی کی شکست میں اچھا خاصا زمانی بُعد ہے۔ تاہم جرمنوں کے بھیجے ہوئے اسلحے کے بارے میں کوئی مصدقہ رائے نہیں ہے کہ وہ انگریز بحریہ نے پکڑ لیا یا پھر بنگالیوں نے کہیں زمین میں چھپا دیا۔ مگر عبیداللہ سندھی مذکورا اسلحہ کی خفیہ تفصیل بیان کرتے ہیں کہ:

> مشن کے صدر رجا مہندر پرتاب وغیرہ نے جرمنی ممبروں کو سمجھایا تھا کہ افغانستان بڑی طاقت رکھتا ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہمارے لوگ موجود ہیں۔ افغانستان کی تحریک جنگ میں شامل ہوتے ہی وہ سخت بلوہ کریں گے۔ اور سلطنتِ ہندوستان عاجز آ جائے گی۔ انھوں نے زیادہ تر خیال کیا تھا کہ صوبہ سرحد طاقت ور ہے۔ اگر ہم افغانستان سے نکل کر صوبہ سرحد میں گئے تو سارا صوبہ سرحد جنگ کے لیے تیار ہو جائے گا۔ یہ جنگ شمال مغربی ہند میں ہوگی۔ انھیں پریسیڈنٹ وغیرہ کی کوشش سے جرمنوں نے ایک دو جہاز بارود و سامانِ جنگ سے بھرے ہوئے بنگال کے انقلابی لوگوں کو دیے تھے۔ بنگالیوں نے وہ بارود و سامان کسی جگہ زیرِ زمین دفن کر دیا تھا۔ وہ اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ

جس سے سارے ہندوستان میں بغاوت ہوسکتی تھی۔(۶۲)

بنگال میں اسلحہ بھیجے جانے کا واقعہ عبیداللہ سندھی کے افغانستان پہنچنے سے پہلے کا ہے۔ خفیہ اسلحہ کی ترسیل کا معاملہ ترکی اور جرمن وفد کے ممبران سے معلوم ہوا تھا۔ اگر یہ اسلحہ بنگال میں نہ بھیجا گیا ہوتا تو عبیداللہ سندھی ترک، جرمن مشن کو کوئی اچھا مشورہ دے سکتے تھے۔ لیکن آئندہ کے لیے ترک، جرمن مشن کو مولانا نے محتاط کر دیا۔ جب انھیں یہ صورتِ حال معلوم ہوئی تو انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ہندوؤں کے کہنے پر بنگال میں اسلحہ بھیجا ہے۔ اگر بلوچستان میں بھیجتے تو اس کا نتیجہ اچھا ہوتا۔ اس بات کا اظہار جرمن کپتان نے مولانا سندھی سے کیا تھا۔ جسے وہ یوں لکھتے ہیں کہ: ''جرمن کیپٹن کے اس قول کی اصل یہ ہے کہ آیندہ مسلمانوں کی طاقت کا خیال رکھتے ہوئے ہماری گورنمنٹ کو اگر امداد دینی ہوگی تو مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں دی جائے گی۔ اس کا مرکز بلوچستان میں وڈھ کا علاقہ ہوگا۔ وڈھ کے علاقے میں اگر سامانِ جنگ پہنچ گیا تو سرحد کو بھی مل جائے گا۔''(۶۳)

جرمنی کو بنگال میں اسلحہ بھیجنے کا مشورہ ہندوستان انقلابیوں نے دیا تھا۔ ان میں راجا مہندر پرتاب بھی شامل تھے۔ یہ وہی راجا مہندر پرتاب ہیں جو ہندوستان کی پرویژنل حکومت کے صدر بنے تھے۔ ہندوستانی حکومت کا یہ ڈھانچہ افغانستان میں تیار کیا گیا تھا۔ حکومتی نظام کے قواعد وضوابط کو کتاب کی صورت میں مرتب کیا گیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ: ''پرویژنل گورنمنٹ مؤقتۂ ہند کا کابل کا پریسیڈنٹ راجا مہندر پرتاب تھا۔''(۶۴) راجا مہندر پرتاب چوں کہ ہندوستان کے وفد مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ مخلص نہ تھا اس لیے جب: ''ریشمی رومال خطوط ہندوستان بھیجے گئے تو اسی وقت راجا مہندر پرتاب سوئزرلینڈ چلے گئے۔ اور اس کے بعد مولانا سندھی اور ان کی جماعت کو انگریزوں کے پروٹسٹ پر کابل میں نظر بند کیا گیا۔ مگر انقلابی تحریک چلتی رہی اور پریسیڈنٹ حکومتِ ہند مولانا سندھی بن گئے۔''(۶۵) جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ پرویژنل گورنمنٹ کی ایک کتاب تھی جو راجا مہندر نے کہیں غائب کر دی تھی اور یہ ظاہر کیا تھا کہ سوئزرلینڈ کے سفر کے دوران کھو گئی ہے: ''راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت موقتۂ ہند یعنی پرویژنل (Provisional) گورنمنٹ ہند کی کتاب سوئزرلینڈ کے سفر میں چرائی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی پنڈت مالوی جی تک پہنچ گئی یا پہنچادی گئی۔''(۶۶)

اس کے بارے میں کوئی مصدقہ رائے نہیں ملی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ہی پرویژنل گورنمنٹ کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ کی کسی کتاب سے اس قسم کی حکومتی تنظیم کے شواہد نہیں ملتے۔ پھر مولانا نے یہ بھی قیاس کیا ہے کہ اُس وقت کے کانگریسی رہنما مالوی جی کے پاس یہ کتاب ہے۔ مولانا کا بیان یہ بھی ہے کہ مذکور کتاب میں جو کچھ درج تھا اُس کے بارے میں راجا مہندر پرتاب اور عبیداللہ سندھی کے سوائی کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کتاب میں کیا درج تھا۔ مولانا عبیداللہ لکھتے ہیں کہ: ''اس جملے معترضہ کی تفصیل یہ ہے کہ پرویژنل گورنمنٹ ہند کے قیام کابل میں ایسے امور وقوع میں آئے تھے۔ جس کا علم راجا صاحب کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ اور کتاب مؤقتۂ ہند میں وہ باتیں درج تھیں۔''(۶۷) ہندوستان کی عارضی حکومت

کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ:

عارضی حکومت کے ممبران نے افغانستان میں اپنا کام جاری رکھا اور روسی ترکستان کے فرمانروا اور زار روس کو مراسلے بھیجے کہ یہ دونوں ممالک برطانوی حکومت سے تعلقات منقطع کر کے اس سلطنت کے خلاف ان کی مدد کریں یہ خطوط کسی طرح برطانیہ کے ہاتھ لگ گئے۔ جو سونے کے پتر پر لکھے گئے۔ مولانا عبید اللہ نے ترکی حکومت سے رابطہ کرنے کے لیے اپنے دیرینہ ساتھی کو مکہ معظمہ بھیجا۔(۶۸)

پرویژنل گونمنٹ نے روس اور روسی ترکستان کو کسی قسم کا خط نہیں لکھا۔ اگر لکھا ہوتا تو مولانا عبید اللہ سندھی اس کا ذکر ضرور کرتے۔ مولانا اور امیر امان اللہ خان نے مل کر ایران، جاپان اور ترکی کو خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کا ذکر بعد میں آئے گا اس وقت عارضی گورنمنٹ کی انگریز حکومت کے خلاف ایک خفیہ سازش کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ:

جس وقت انگریز اور افغانستان کے درمیان معاہدہ صلح ہو رہا تھا اور اعلیٰ حضرت میر امان اللہ خان کی اجازت سے ہم نے روس سے بذریعہ حکومتِ مؤقتۂ ہند معاہدہ کیا تھا۔ اس وقت راجا مہندر پرتاب سوئزر لینڈ سے واپس کابل پہنچ گئے۔ چوں کہ حکومتِ مؤقتۂ ہند کے پریسیڈنٹ راجا صاحب تھے اس لیے ان معاہدات پر دستخط بھی راجا صاحب کے ہوتے اور مولانا بحیثیت پرائیویٹ سکرٹری کے ہونے اور کابل گانگریس کمیٹی کے صدر مولانا سندھی تھے۔ اور معاہدہ گویا گانگریس کمیٹی اور روس کے درمیان تھا۔ اور حکومتِ مؤقتۂ ہند کے درمیان بھی تھا جس کے صدر مولانا ہو گئے تھے۔(۶۹)

جس وقت دنیا میں جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان جو ہندوستان کے انقلاب کے لیے اپنا عملی کردار ادا کر رہے تھے، وہاں پر وہ جرمنی میں اکٹھے ہو گئے۔ سب نے مل کر انڈین نیشنل پارٹی قائم کی۔ ہندوستانی نوجوانوں میں قومیت اور وطنیت پرستی کا شعور بیدار ہو چکا تھا اور یہ پارٹی ان کے سیاسی شعور کا عملی نتیجہ تھا۔ اس موقع کے متعلق سرگزشتِ قابل میں یوں درج ہے کہ: ''حرب عمومی شروع ہونے پر جس قدر ہندوستانی آزاد پسند نوجوان یورپ میں موجود تھے وہ سب برلن میں جمع ہو گئے۔ اور انھوں نے جرمن دفترِ خارجہ کے ماتحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی جس میں ہر دیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ بھی شامل تھے۔''(۷۰)

☆ جنگِ عظیم کے اختتام پر ہندوستان کی انگریز حکومت اور افغانستان کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔ یہ جنگ ۱۹۱۹ء میں ایک ہوئی تھی۔ اس جنگ کے پیچھے ہندوستانی نوجوانوں کا وفد، جرمنی میں موجود ہندوستانی انقلابیوں اور مولانا عبید اللہ سندھی کی کوششیں شامل تھیں۔ جنگ کا معرکہ سرگرم ہوا تو کچھ مقامات میں انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور کچھ مقامات میں افغان حکومت کو ہوا واقعہ کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ:

امیر امان اللہ کے دور میں افغانستان اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی تو کوہاٹ اور بنو کے مقام ٹھل پر افغانی فوج نے انگریز فوج کو شکست دے دی۔ دوسری طرف جلال آباد کے مقام پر انگریزوں کو کامیابی

حاصل ہوئی۔ جب کہ قندھار کے محاذ پر دونوں کو برابر نقصان ہوا دونوں حکومتیں ایک دوسرے پر الزام لگاتی کہ پہلے حملہ ہم پر ہوا ہے۔اس کے بعد دونوں حکومتوں میں صلح ہوگئی۔(۷۱)

افغانستان جنگ کے معمولی واقعات کے نتائج بڑے دورس نکلے۔ جنگ کے اختتام پر دونوں فریقین صلح کے لیے جلد ہی آمادہ ہو جاتے ہیں۔لیکن جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ انگریزوں کو افغان جنگ کے اسباب کے بارے میں علم نہیں ہو سکا کہ کیا تھے۔لیکن دونوں حکومتوں کے درمیان صلح ہوگئی۔جس کی وضاحت جواہر لال نہرو نے یوں کی ہے:

> اسباب کچھ بھی ہوں انگریزوں کے ساتھ افغانوں کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ بہر حال مختصر دورانیہ کی تھی۔ تصادم بھی معمولی ہوا۔عسکری نکتہ نظر سے ہندوستان میں انگریز، افغانستان کے امیر امان اللہ سے زیادہ طاقت ور تھے۔لیکن وہ جنگ کے موڈ میں نہیں تھے۔ دو چار چھوٹے چھوٹے واقعات نے ہی انھیں امیر امان اللہ سے مصالحت پر مجبور کر دیا۔نتیجتاً افغانستان کو ایک خود مختار ملک تسلیم کر لیا گیا۔(۷۲)

انگریز اور افغانستان حکومت کے درمیان فوری صلح ہونے کی دو جوہات تھیں، ایک تو افغانوں سے انگریزوں کی عسکری طاقت زیادہ تھی۔ دوسرے یہ کہ افغانستان پر پہلا ہوائی جنگی جہاز سے حملہ کیا گیا۔امکان ہے کہ اس ہوائی حملے کے سبب امیر امان اللہ خان صلح کرنے کے لیے رضامند ہو گیا ہو۔تاہم انگریز بھی در پردہ افغانستان کے ساتھ جنگ کرنے سے گریزاں تھے۔تاریخ ہندوستان میں درج ہے کہ:

> حبیب اللہ خاں قتل ہوئے (فروری سنہ ۱۹۱۹ء) چچا اور بڑے بھائی کو دھکیل کر امان اللہ خان، امیر بنائے گئے تھے۔انھوں نے انگریزوں سے جنگ کرنے میں دیر نہ کی لیکن فوج با قاعدہ اور اس کے جدید اسلحہ نکمے ثابت ہوئے۔افغانستان کے سرحدی قلعہ ڈگہ پر انگریز سپاہ کا قبضہ اور پہلا ہوائی جہاز شہر کابل پر نمودار ہوا۔خوش عقیدہ لوگوں نے فتح ہند کے جو خیالی قلعے بنائے تھے۔چند ہفتے میں ہوا ہو گئے۔امان اللہ خان نے اپنی آزادی منوالینا ہی غنیمت سمجھا۔(۷۳)

اگر چہ فوجی اور جدید اسلحہ کے لحاظ سے انگریزوں کو ایشیا میں برتری حاصل تھی۔ جب افغانستان نے انگریزوں پر حملہ کیا تو اُس وقت بھی انگریزوں نے پوری طاقت سے جنگ نہیں کی تھی۔جس کی وجہ سے انگریزوں کو بھی خاصہ نقصان اُٹھانا پڑا۔جس وقت افغانستان نے برطانوی ہند پر حملہ کیا تو عبید اللہ سندھی افغانستان میں موجود تھے۔امکان ہے کہ مذکورہ حملہ ان کی ایما پر کیا گیا تھا۔لیکن پسِ پردہ وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں اس جنگ کے بعد افغان حکومت مکمل طور پر خود مختار ہوگئی۔ جہاں تک جواہر لال نہروں کے بیان کا تعلق ہے ممکن ہے کہ انگریز، افغان جنگ کے بارے میں اُن کو اس قدر معلومات حاصل نہ ہوں۔اس لیے ان کا بیان شک کی بنیاد پر مبنی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:''مئی ۱۹۱۹ء میں اس نے ہندوستان پر ایک چھوٹا سا حملہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس فوری اشتعال کا سبب کیا تھا یا کس نے یہ اقدام تجویز کیا تھا۔شاید امان اللہ انگریزوں کی بالا دستی پر نالاں تھا اور اپنے ملک کی خود مختاری تسلیم کرانا چاہتا تھا۔ یا پھر ممکن ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ حالات

اس وقت اس کے لیے ساز گار ہیں۔'' (۷۴) انگریز استعمار میں افغانستان واحد ملک تھا جو آزاد اور خود مختار تھا۔ انگریز نے اپنی خارجی پالیسی اور سفارت کے ذریعے اس پر اپنا دباؤ برقرار رکھا ہوا تھا لیکن جواہر لال کا کہنا ہے کہ: ''۱۹۱۹ء میں تیسری افغانستان جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں افغانستان مکمل طور پر خود مختار ہو گیا۔'' (۷۵) جواہر لال نہرو ۱۹۱۸ء میں جیل گئے تھے۔ جب انگریز، افغان جنگ ہوئی تو سارے حالات ان کے شنیدن تھے۔ جنگ کے بعد صلح کے لیے افغان وفد ہندوستان آیا تو اس کی صورتِ حال بھی جواہر لال نہرو کو معلوم تھی۔ اس بات کا ذکر انھوں نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ: '

> امان اللہ خاں کے تخت نشین ہونے کے بعد افغانستان اور برطانیہ میں ۱۹۱۹ء میں ایک مختصر سی جنگ ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ان حکومتوں کے نمائندے مسوری میں موجود تھے اور مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ افغانی نمائندے سیوائے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ سب الگ تھلگ رہتے تھے۔ الگ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ہوٹل کے عام کمرے میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک مہینے کے قیام میں ان میں سے کسی شخص کو میں نے دیکھا تک نہ تھا یا اگر دیکھا بھی ہو تو پہچانتا نہ تھا۔ (۷۶)

ہندوستان کی عارضی حکومت کا یہ معاہدہ روس اور ہندوستان کی کابل کانگریس کے درمیان تھا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایک تو حکومتِ افغانستان کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے دوسرا راجا مہندر پرتاب ہر طرح کے معاملات کے ذمہ دار ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راجا مہندر پرتاب ایک طرف پروویژنل حکومت کے صدر کی حیثیت سے جرمنی میں موجود ہندوستانی انقلابیوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ دوسری طرف افغانستان میں موجود کابل کانگریس کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ افغانستان میں رہ کر انگریزوں کے لیے جاسوسی کر رہے تھے۔ راجا مہندر پرتاب مالوی جی کو خبریں پہنچاتے تھے اور مالوی جی آگے انگریزوں تک پہنچاتے تھے۔ صحیح معنوں میں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے مشن کو ناکامی سے دوچار کرنے میں راجا مہندر پرتاب اور مالوی جی کا مرکزی کردار تھا۔ شیخ الہند محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی کی ساری منصوبہ بندی کانگریسیوں نے محض اس وجہ سے ناکام بنائی کہ ہندوستان کی آزادی کا کارنامہ مسلمانوں سے منسوب نہ ہو جائے۔ جن دنوں مولانا عبید اللہ سندھی افغانستان میں بیٹھ کر انگریزوں کے خلاف جنگی حکمتِ عملی طے کر رہے تھے۔ راجا مہندر پرتاب کے اندر بھی جذبہ بڑھا۔ اُس نے مولانا عبید اللہ سندھی سے کہا کہ: ''اگر میرے پاس خرچہ ہوتا تو میں ریاست نیپال کو ایسا انگریزوں کے خلاف کر دیتا جیسے آپ نے افغانستان کو انگریزوں کے خلاف کیا ہے۔ مولانا نے امیر امان خاں سے کہا کہ اس کو خرچ دے دیں۔ امان اللہ خاں نے فوراً خرچ دے دیا۔ اور یہ نیپال کو روانہ ہو گیا۔ اور نیپال کی سرحد سے وزیرِ اعظم نیپال کو اطلاع دی۔'' (۷۷) راجا مہندر پرتاب نے نیپال کی حکومت کو افغانستان کے ساتھ مل کر ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے رضامند کر کے آئے یا نہیں لیکن یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب افغانستان نے برطانوی ہند پر حملہ کیا تو نیپال کی طرف سے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں ہوا۔ جنگ عظیم اوّل میں سب سے اچھا موقع تھا کہ انگریزوں کے خلاف

مقامی سطح پر علمِ بغاوت بلند کیا جاسکتا تھا۔ مگر مقامی ضمیر فروشوں نے پل پل کی خبر انگریزوں کو پہنچائی۔ جہاں تک ریشمی خطوط تحریک کے ناکام ہونے اور ریشمی خطوط پکڑے جانے کا معاملہ ہے اس کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں کہ:

> اصل میں راجہ مہندر پرتاب مالوی جی کا آدمی تھا۔ اور وہ اس مقصد کے لیے وہاں رکھا گیا تھا کہ اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ کرے تو راجہ مہندر پرتاب مالوی جی کو خبر کر دیے۔ جب مہندر پرتاب نے دیکھا کہ اب افغانستان سے ہندوستان پر حملہ ہونے والا ہے تو پہلے یہ کیا کہ ریشمی خطوط لانے والے شیخ عبدالحق کو جو نو مسلم اور غیر مستقل طبیعت کا آدمی تھا۔ اور جو رب نواز یا حق نواز ملتانی کے پاس مسلمان ہوا تھا..... راجہ مہندر پرتاب نے سمجھایا کہ ضرور بضرور یہ خطوط رب نواز یا حق نواز کو دکھلا دینا تاکہ وہ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائے۔ لیکن اصل غرض یہ تھی کہ وہ خان بہادر ہیں اس لیے وہ یہ خطوط گورنمنٹ کو پیش کر دیں گے۔(۷۸)

مولانا عبید اللہ سندھی کی ایما پر جب ایک طرف امیرِ افغانستان، برطانوی ہند پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دوسری طرف ترکی اور روس نے ایک ایک لاکھ فوجی مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ الہند کو افغانستان بلانے کے لیے خطوط لکھے جنھیں پہلے ہندوستان بھیجا جانا تھا اور پھر ہندوستان سے سعودی عرب (حجاز) بھیجے جانے تھے۔ ان خطوط میں حجاز کی ترک حکومت کو بھی خطوط لکھے گئے تھے۔ بہرکیف یہاں یہ بتانا مقصد نہیں کہ خطوط کی تحریر کیا تھی اور خطوط کس چیز پر لکھے گئے تھے۔ بلکہ یہ بتانا ضروری ہے کہ:

> جولائی ۱۹۱۶ء کو میاں محمد انصاری نے حیدر آباد سندھ کے ایک شخص عبدالرحیم کو ایک ہدایت نامے کے ساتھ بھیج دیا جس میں التماس کی گئی تھی کہ کسی قابلِ اعتماد حاجی کے ذریعے یہ خط مکہ معظمہ میں محمود الحسن تک پہنچا دے، یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے پر بہت خوش خط لکھے گئے تھے۔ ان خطوط میں فدائی فوج کا بھی ذکر تھا اس فوج کے بارے میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اس کے لیے ہندوستان میں سپاہی بھرتی کیے جائیں اور مسلمان حکمرانوں سے بین اتحاد اور دوستی اور تجارت کے جذبات پیدا کیے جائیں۔(۷۹)

جس آدمی کے ذریعے ریشمی خطوط پہلے ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ اس کے بارے میں دو مختلف آراء ہیں۔ مرتضیٰ انجم کہتے ہیں کہ عبدالرحیم نامی شخص کو خطوط دے کر ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ سرگزشتِ کابل کی رو سے ریشمی خطوط ایک نو مسلم حق نواز کے ہاتھ ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ راقم الحروف کا آخری رائے پر اتفاق ہے۔ کیوں کہ سرگزشتِ کابل میں ایک سے زیادہ مقامات پر حق نواز کے ہاتھ ریشمی خطوط بھیجے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سرگزشتِ کابل میں ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ: ''جب یہ لوگ کابل سے باہر جا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ہم نے نو مسلم شیخ عبدالحق کو ریشمی خطوط دے کر روانہ کیا تھا۔ اور مسٹر اللہ نواز نے بھی اپنے باپ حق نواز کے نام پر شیخ عبدالحق نو مسلم کے ہاتھ خط دیا۔''(۸۰) ریشمی خطوط ہندوستان بھیجنے، اس لیے ضروری تھے کہ: ''جو ہندوستانی مشن جرمنی سے کابل آیا تھا اس کو اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے یہ جواب دیا کہ جب تک جرمنوں اور ترکوں سے ہم کو ایک لاکھ لشکر کی امداد نہ ملے گی اس وقت تک ہم جنگ سے غیر

جا بندار رہیں گے۔اس پر بھی ایک مدت تک اعتماد تھا اور اسی بنا پر ریشمی خطوط بھیجے گئے تھے۔‘‘(۸۱)

☆ایک طرف راجا مہندر پرتاب نے شیخ عبدالحق نومسلم، خطوط اپنے استاد کو دکھانے کی بات کر رہے تھے تا کہ وہ بھی ریشمی خطوط تحریک میں شامل ہو جائیں۔ دوسری طرف خود چھپ کر سویزر لینڈ اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا تھا، تا کہ اُس کے ذریعے افغانستان کے برطانوی ہند پر حملے کی منصوبہ بندی سے آگاہ کر سکے۔ راجا مہندر پرتاب کو اس بات کا علم تھا کہ حق نواز برطانیا گورنمنٹ کا ملازم تھا۔ وہ ریشمی خطوط کے راز کو برطانیا گورنمنٹ کو بتا دے گا۔ مطالعہ میں یہ بات آئی کہ جس مقصد کے لیے راجا مہندر پرتاب افغانستان میں موجود تھے وہ ہر صورت پورا ہو گیا اور ریشمی خطوکا معاملہ برطانوی حکومت تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف: ’’مہندر پرتاب جنود اللہ اور حزب اللہ کے دفتر پر قبضہ کرتے ہوئے بلخ چلے گئے۔ بلخ میں سندھ کے ہندو تاجر موجود تھے۔ راجہ وہاں بڑی تکلیف اُٹھاتا ہوا سوئزر لینڈ پہنچا۔‘‘(۸۲) اپنے بھائی کو تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد راجا مہندر پرتاب روس سے ہوتے ہوئے افغانستان واپس آ گئے۔ اُن دنوں برطانوی ہند اور افغان حکومت کے درمیان صلح کے وفد ہندوستان روانہ ہونے والا تھا۔ یعنی جس جنگ کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ جنگ کا واقعہ کے بعد دونوں فریقین میں صلح کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس طرح راجہ مہندر پرتاب: ’’روس کے راستے سے جہاں اب کمیونسٹ حکومت قائم ہو چکی تھی۔ واپس کابل پہنچے اس وقت امیر امان اللہ نے مولانا سے کہا اب صلح کا وفد دہلی بھیجنے والے ہیں۔ اور اگر ایسی شرطیں پیش کریں جس سے ہم مغلوب ہو جائیں گے۔‘‘(۸۳) افغان، برطانوی ہند جنگ کے بعد صلح کا وفد ہندوستان آیا تو اسے مسوری سیوائے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ خفیہ پولیس ان پر نگرانی کر رہی تھی۔ تا کہ افغان وفد کسی سیاسی آدمی سے ملاقات نہ کرے۔ دوسری طرف کانگریس کے لیڈروں خاص طور پر کڑھی نظر رکھی گئی۔ ان ہی دنوں مئی ۱۹۲۰ء میں جواہر لال نہر مسوری ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جیسا کہ جواہر لال نہرو کا بیان ہے کہ: ’’امان اللہ خاں کے تخت نشین ہونے کے بعد افغانستان اور برطانیا میں ۱۹۱۹ء میں ایک مختصر سی جنگ ہوئی تھی۔ اس زمانے میں دونوں حکومتوں کے نمائندے مسوری میں موجود تھے اور مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ افغانی نمائندہ سیوائے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔‘‘(۸۴)

یہ الگ بات ہے کہ جواہر لال نہر و حقیقت میں اپنے کام کی وجہ سے مسوری سیوائے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے یا کہ افغان وفد کی صلح میں مدد کے لیے دانستہ وہاں موجود تھے۔ کیوں کہ افغان اور برطانوی ہند کی جنگ کا معاملہ ایسا تھا جو کانگریسی کے حمایتی مولویوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ افغان وفد جو مولانا عبیداللہ سندھی کی سربراہی میں افغانستان گیا تھا۔ اُس کی کانگریس کے تمام رہنما حمایت کرتے تھے اور اُن کے ہر عمل سے باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ افغان اور برطانیا کی صلح کے وقت جواہر لال نہر و مسوری ہوٹل میں جا کر ٹھہرے تھے۔

سفرنامہ سرگزشتِ کابل میں ریشمی خطوط کے ذریعے ایران، ترکی اور افغانستان کے مابین اتحاد پیدا کر کے برطانوی ہند پر حملہ کرنے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس میں دیگر ضمنی واقعات اور روس، جاپان، نیپال اور عراق وغیرہ کو بھی برطانوی ہند پر حملہ کرنے کے لیے اُکسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان ممالک کو بھی افغان حکومت اور کابل کانگریس کمیٹی نے مل کر خطوط بھیجے تھے۔تمام مشنوں کی خبر انگریز حکومت کو ہونے کے بعد خطوط لے کر جانے والے، خفیہ پولیس کے ہاتھ لگ گئے۔ یوں مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ الہند کی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ساری منصوبہ بندی ناکام ہوگئی۔

ہندوستان کی آزادی میں ہندوستان کے ہر فرد نے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ مذہبی علما، دینی طلبا، کالجوں یونیورٹیوں کے طلبا اساتذہ اور سیاست دانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔عوام پر سخت سے سخت قوانین نافذ کیے گئے؛ قتل و غارت گری کی گئی؛ املاک کو نقصان پہنچایا گیا؛ ظلم و ستم کی کوئی ایسی داستان نہیں جو ہندوستان کے لوگوں پر روانہ گی گئی ہو۔ مالی نقصان پہنچانے کے لیے مقامی دستکاری بے کار کر دی گئی۔ کسان کو ہر دور میں پسماندہ رکھا گیا۔ انگریز کے دور میں اگر کسی طبقے کو فائدہ پہنچا تو وہ صرف انگریزوں کا منظورِ نظر جاگیر دار تھا۔لیکن زندہ ضمیر کے لوگ موجود تھے جن کے دلوں میں مظلوم عوام کے دکھ درد کا احساس موجود تھا۔ ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر آزادی کی تحریکیں چلتی رہی۔ دو عالمی جنگوں سے انگریزوں کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد، امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کی بنیاد پر سامراجی قوتوں نے دنیا کے ممالک کو آزاد کرنا تھا: ''اس وقت صراحت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ اب ہندوستان کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔'' (۸۵) انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دیگر قومیں سبھی خوش تھیں۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی کوششوں سے ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے قریب تھا۔اسی حوالے سے کرنل محمد خان لکھتے ہیں کہ: ''ان دنوں ملک میں ایک سیاسی انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ قائداعظم اور پنڈت نہرو دلی میں لارڈ مونٹ بیٹن سے مل کر انگریزی راج کا قصہ تمام کر رہے تھے۔ اور اُڑتی ہوئی خبر تھی کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔'' (۸۶) یہ آزادی بتدریج تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ نظامِ حکومت ہندوستان کی سیاسی جماعت کانگریس کے حوالے کرنا چاہا۔ کانگریس اور انگریزوں کے اس منصوبے کو قائداعظم محمد علی جناح نے رد کر دیا۔ لارڈ ماؤنٹ کے اس پلان (کیبنٹ مشن پلان) میں مسلمانوں کی خودمختاری خطرے میں تھی جس کے لیے قائداعظم نے اپنے آہنی عزم سے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ کیبنٹ مشن پلان میں یہ کہا گیا تھا کہ:

> ''بیشتر امور صوبوں کے اختیار میں ہوں گے۔ اس طرح اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو مکمل خود مختاری مل جائے گی اور چند امور کو متفقہ طور پر علاقائی نظام کے ماتحت رکھا جائے گا۔ اس لحاظ سے سیکشن بی اور سی میں مسلمانوں کی اکثریت یقینی تھی، اور وہ اپنی تمام تر توقعات پوری کر سکتے تھے۔ جہاں تک مرکز کا

تعلق تھا، اس کے پاس صرف تین محکمے تھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے صوبوں میں تمام انتظام میں نہیں
دے جا سکتے تھے۔"(۸۷)

مذکور بالا بیان ماؤنٹ بیٹن پلان کے تحت ہندوستان میں مسلمانوں کا درجہ دوسرا یا تیسرا بنتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم نے بمبئی میں ہونے والے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پاکستان کے حصول کے موقف کو دہراتے ہوئے کہا تھا کہ: مسلم لیگ کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ کونسل نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے راست اقدام کا بھی فیصلہ کیا۔"(۸۸) پاکستان کا مطالبہ نہ صرف ہندوؤں بلکہ کانگریس کے مسلمانوں رہنماؤں کو بھی ناگوار گزرتا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کو کانگریس نے تسلیم تو کر لیا تھا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور رہے گی۔ لیکن اس کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے سے اُنھیں معلوم ہوا کہ مرکزی حکومت کو کمزور رکھا گیا تو مسلم اکثریت والے تمام صوبے الگ ہو جائیں گے۔ ادھر مسلم لیگ کو خطرہ تھا کہ اگر متحدہ ہندوستان کے اس حکومتی نظام کو تسلیم کر لیا تو ہندو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو غلام بنا لیں گے۔ اس طرح مسلمان انگریزوں کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ ذیل کے اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ:

> لارڈ ماونٹ بیٹن کہتے تھے کہ کانگریس صرف لیگ کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے مرکز کو کمزور رکھنے پر رضامند ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے صوبوں کو مکمل خود مختاری دی گئی تھی۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جو زبان، مذہب اور ثقافت کی وجہ سے کئی حصوں میں منقسم ہو وہاں کمزور حکومت سے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے رجحانات کو تقویت مل سکتی ہے۔ اگر مسلم لیگ نہ ہو تو ایک مضبوط مرکزی حکومت کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک دستور مرتب ہو سکتا ہے جو ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن نے مشورہ دیا کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے چند چھوٹے ٹکڑوں کو دے کر باقی ہندوستان کو ایک مضبوط اور مستحکم ریاست بنایا جا سکتا ہے سردار پٹیل پر اس دلیل کا گہرا اثر ہوا کہ مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک سے ہندوستان کا اتحاد اور استحکام خطرے میں پڑ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ صرف سردار پٹیل ہی نہیں، جواہر لعل بھی ان دلیلوں سے متاثر تھے۔ سردار پٹیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب ان دلیلوں کو دہرایا تو گاندھی جی تقسیم کی مخالفت کرنے میں کمزور پڑ گئے۔(۸۹)

جب ہندوستان آزاد ہوا تو یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نگرانی میں پاکستان اور بھارت دو ملکوں میں تقسیم ہوا۔ اگرچہ تقسیم ایک مشکل تجربہ تھا لیکن اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں زندگی رواں کر دی تھی۔ کرنل محمد خان قیامِ پاکستان اور آزادی کے واقع کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> سیسل ہوٹل مری کا کمرہ نمبر ۲۶ ایک منکسر مزاج سا نگل کمرہ ہے۔ لیکن ہمارے لیے عظیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کمرے میں ہم پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی صبح طلوع ہوئی۔ اسی کمرے میں

ریڈیو پاکستان کا پہلا نشریہ سنا۔ گویا اسی کمرے میں وطنِ عزیز کی آزادی کی ابتدا ہوئی اور اسی کمرے میں اپنی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ یعنی وہ خاتون جو اس شب ہمارے ساتھ شریکِ بزم تھی وہ اس روز شریکِ حیات بن گئی۔ (۹۰)

۱۹۴۷ء میں کرنل محمد خان کے لیے دو خوشخبریاں تھیں۔ ایک تو ۴۷ء میں انھیں ریگولر کمیشن پاس کرنے کا موقع ملا۔ جو انھوں نے پاس کر لیا۔ اور اسی سال ان کی شادی بھی ہوئی۔ کرنل محمد خان کی شادی ۱۴/اگست کو ہوئی تھی جس کی وضاحت انھوں نے خود اس طرح کی ہے کہ:

یہ جمعرات کا دن تھا اور ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء بمطابق ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کی تاریخ تھی اس دن صبح سے ہی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی (موجودہ سندھ اسمبلی) کی عمارت کے سامنے پر جوش لوگ جمع تھے جب پاکستان کے نامزد گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ کی معیت میں ایک مخصوص بگھی میں سوار ہو کر اسمبلی پہنچے تو عوام نے پُر جوش نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ (۹۱)

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ آزادی کی کوششیں پہلے سے زیادہ پُر زور ہوئیں۔ جب سیاسی جماعت ہندوستان کے لوگوں کے حقوق کا تحفظ دینے میں ناکام رہی تو ایک اور سیاسی جماعت مسلم لیگ قائم ہوئی۔ پھر انڈین نیشنل پارٹی بنی۔ اس کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتیں وجود میں آئی، اور بہت سی مذہبی، سیاسی، اور معاشرتی تحریکی وجود میں آئیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے راہ ہموار کی۔

مقامی رہنماؤں کی آزادی کی تحریکوں، انگریزوں کے ظلم وستم کا مقابلے میں انگریزوں کی رائج کردہ جدید تعلیم اور ہندوؤں کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں کے ردِعمل میں ہندوستان کے عوام میں قومی شعور اور سیاسی شعور پیدا ہوا۔ جس کی مثالیں تقسیم بنگال، جلیانوالہ باغ کے واقعہ، ستیاگرہ سول نافرمانی، ترکِ موالات اور تحریک خلافت میں ملتی ہیں۔

☆ ہندوستان کے سیاسی حالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ایسے ہی حالات کے زیرِ اثر مولانا محمود الحسن نے سعودی عرب کا سفر اختیار کیا۔ سفر نامہ اسیرِ مالٹا نومبر ۱۹۱۵ء کے دور کا ہے۔ مولانا محمود الحسن کا سفر سعوی عرب انگریز کے خلاف ایک بڑی سازش تیار کرنے کے لیے تھا۔ انگریز نے بھی مولانا موصوف کے خلاف ایک بڑی اور بین الاقومی کاروائی کر کے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ انگریزوں نے یہ سازش کس طرح ناکام بنائی اس پر آگے چل کر بات ہوگی۔ بہر کیف انھیں بڑی گھمبیر سازش کے سلسلے میں گرفتار کر کے جزیرہ نما مالٹا میں لے جا کر قید کر دیا گیا۔ اس دور میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، طائف اور جدہ کی سرزمین کو حجاز کہا جاتا تھا۔ جزیرہ کے دیگر خطوں کو عرب یا عربستان کہا جاتا تھا۔ عرب کی سرزمین نجد میں محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء تا ۲۲ جون ۱۷۹۲ء) کی وہابی تحریک کا آغاز ۱۷۰۷ء تھا۔ محمد ابنِ سعود نجد کے علاقے درعیہ کے امیر تھے جن پر شیخ محمد بن عبدالوہاب کی توحید پرستی کی تعلیمات نے اثر ڈالا۔ انھوں نے اسلام کی انوکی توجیہی اور تعریف کر

کے عرب میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے نظریات کی ابتداء میں بہت زیادہ مخالفت کی گئی۔ لیکن عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے بزورِ شمشیر محمد بن عبدالوہاب نجدی کی توحید پرستی کے نظریات کو پھیلایا۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ محمد ابنِ عبدالوہاب نجدی کے توحید پرستی کے نظریات نام نہاد تھے۔ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ محمد ابنِ عبدالوہاب کے نظریات شرک کے خلاف تھے۔ بہر کیف ابنِ الوہاب نے واعظ اور قلم کی بجائے تلوار کے ذریعے جہاد کا علم بلند کیا تھا۔ مقالہ نگار کی بحث فی الوقت اس پہلو پر نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصد ہے کہ جب شیخ الاسلام محمود الحسن نے عرب کا سفر اختیار کیا تو وہاں کے سیاسی حالات کس قسم کے تھے۔ لہٰذا عرب میں اس وقت شریف حسین کی حکومت تھی۔ وہ انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ اُسے سلطنتِ عثمانیہ سے بغاوت کرنے یا نقصان پہنچانے پر انگریز باقاعدہ امداد دیتے تھے۔ اس طرح شریف حسین سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ وفادار نہیں تھا۔ وہ ایک طرف ترکی کی سلطنت سے نجات حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کی مدد سے بغاوت کر دیتا اور کبھی نجدی امیر سے نجات حاصل کرنے کے لیے ترکوں سے مدد حاصل کرتا۔ شریف حسین عرب میں دوغلی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔ اس طرح عرب کی سرزمین پر جنگِ عظیم کے دوران جنگ کے فریقین آپس میں مصروف تھے۔ حجاز کے گورنر غالب پاشا نے کئی بار اس کی بغاوت کو کچل کر دوبارہ اسے حکومت سونپی تھی۔ اس دوران ترک اور انگریز فوجیں حجاز میں مورچہ بند تھیں۔ غالب پاشا طائف کے قلعے میں مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ ابن سعود، یوں تو نجد میں حکومت کرتا تھا۔ لیکن کئی بار مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کئی دیگر علاقوں کو فتح کر چکا تھا اور کئی بار ترک فوجوں سے شکست کھا کر پسپا بھی ہو چکا تھے۔ مجموعی طور پر عرب کی سیاسی صورتِ حال بے چینی کا شکار تھی۔

سفرنامہ اسیرِ مالٹا کے مسافران ریشمی رومال یا ریشمی خطوط تحریک کا حصہ تھے۔ زیرِ نظر سفرنامہ اس تحریک کے سلسلے کی بنیادی کڑی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مولانا عبیداللہ سندھی کو اس تحریک کا حصہ بنا کر افغانستان روانہ کیا تھا۔ خود حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ریشمی رومال آزادیٔ ہند کی تحریکوں میں سے ایک تھی۔ اگر ریشمی رومال تحریک کامیاب ہو جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا۔ تاہم تحریک کے ناکام ہونے کی کئی ایک وجوہات ہیں کہ اس تحریک کا راز حکومتِ ہند کو معلوم ہو گیا تھا۔ اور متعدد گرفتاریاں ہو چکی تھیں۔ نہ جانے کتنے علماء کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ آخر کار تحریک ختم ہو گئی۔ ایک سال کے عرصے کے بعد: ''۱۰/اگست ۱۹۱۶ء کو ایک تحریک کا انکشاف ہوا جو حکومت کی فائلوں میں ریشمی رومال سازش کے نام سے معروف ہے۔'' (۹۲) ریشمی رومال تحریک کے بارے میں اسی قسم کی دلیل تاریخ ہند میں اس طرح مذکور ہے کہ: ''دیوبند کے صدر مدرس مولانا محمود الحسن حجاز گئے اور جہاد کے سلطانی اعلان پر مولانا سندھی کو کابل روانہ کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں انقلابِ حکومت کی مفصل تجویز مرتب کی ہے۔ ریشمی رومالوں پر باریک خط سے لکھا تھا۔ اسی سے انگریزی تحریروں میں: ''سرخ رومالوں کی سازش'' موسوم ہے۔'' (۹۳) مذکور تحریک کا آغاز مولانا

عبیداللہ سندھی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے اسفار کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ ایک سال کے عرصے کے اندر ہی اس تحریک کے سارے راز انگریزوں کو معلوم گئے۔ جس کے وجہ سے علمائے ہند کو خاصی سختیاں برداشت کرنا پڑیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی کابل روانہ ہونے کے بعد شیخ الاسلام ترکی سلطنت سے رابطے کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی ہندوستان سے اگست میں روانہ ہوئے اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں افغانستان، کابل پہنچے۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۷ر اکتوبر کو کابل میں داخل ہوئے اور شیخ الہند ۹ر اکتوبر کو جدہ پہنچے۔ شیخ الہند ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء اکبر نامی جہاز سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اس طرح شیخ الہند کی نسبت پہلا سفر نامہ مولانا عبیداللہ سندھی کا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے سفر سے پہلے ہی پولیس اور انتظامیہ ہندوستان میں ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ شیخ الہند کی مکہ کے لیے روانگی کے بارے میں حسین احمد مدنی لکھتے ہیں کہ: ''بمبئی میں جہاز پر سوار ہوتے وقت حضرت شیخ کے رفقاء سے کہہ دیا گیا تھا آپ کے ساتھ آٹھ دس آدمی خفیہ پولیس کے ہیں ان سے احتیاط کی جائے ان کے نام ونشان بھی بتا دیے تھے۔ یہ بات ترکی پولیس تک پہنچ گئی۔ چنانچہ جزیرہ سعد میں ترکی پولیس نے ان کو زیرِ حراست لے لیا۔ اور اسی طرح زیرِ حراست ان کو حج کرایا۔'' (۹۴)

جب شیخ الہند مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، سہول بھاگلپوری، مولوی محمد میاں انبیٹھوی، مولوی عزیز گل کاکا صاحب، حاجی خان محمد مرحوم، مولوی مطلوب الرحمان دیوبندی، حاجی محبوب خان سہارنپوری، حاجی عبدالکریم سردیجی، وحید احمد اور حسین احمد مدنی ان کے شریک سفر تھے۔ ان میں سے اکثر مولانا صاحب کے ساتھ مالٹا کی جیل میں قید رہے۔ ان حباب کے علاوہ اس تحریک میں چند اور اشخاص بھی شامل تھے جو شیخ الہند سے پہلے مکہ پہنچ چکے تھے۔ جیسا کہ: ''مولانا خلیل احمد صاحب کچھ عرصہ پہلے ہندوستان سے روانہ ہو کر مکہ معظّمہ پہنچ چکے تھے۔۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ کوئی مجمع بھی نہ تھا فقط ان کی اہلیہ صاحبہ اور حاجی مقبول احمد صاحب اور بعض حضرات دیگر ہمراہ تھے۔'' (۹۵) شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن نے مکہ معظّمہ میں حج کا فریضہ بھی انجام دیا مگر مکہ پہنچنے کے بعد مکہ کے گورنر سے ملاقات کی کوشش بھی کی۔ کیوں کہ غالب پاشا طائف میں قیام پذیر تھا اس لیے غالب پاشا سے ملاقات کے لیے انتظار کرنے لگے۔ حسین احمد مدنی لکھتے ہیں کہ: ''مولانا کا ملنا غالب پاشا سے یا تو قبل از حج ممکن تھا یا بعد از حج، مگر چوں کہ تمام عالم کو معلوم ہے کہ غالب پاشا طائف میں رہتا تھا، خصوصاً ایام گرما میں اس سے ملاقات قبل از حج ممکن ہی نہ تھی۔ غالب پاشا اس سال بھی طائف سے سیدھے روانہ ہو کر عرفات میں آ کر شریک حج ہوا تھا۔ مولانا بھی حج سے پہلے مکہ معظّمہ سے باہر کہیں تشریف نہیں لے گئے۔'' (۹۶) مولانا محمود الحسن نے گورنر مکہ معظّمہ غالب پاشا سے ملاقات نہیں کی تھی۔ نہ کسی قسم کا رابطہ تھا۔ غالب پاشا سے مولانا کی ملاقات ایک ہندوستانی تاجر نے کرائی جو عرصہ دراز سے جدہ میں تجارت کرتا تھا۔ مولانا سے ملاقات کے دوران: ''گورنر نے تمام باتیں غور سے سنیں ضروری سوالات کے جوابات حاصل کیے اور اپنی طرف سے جواب دینے کے لیے حضرت شیخ کو

اگلے روز اپنے یہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔''(۹۷)مولانا محمود الحسن کی گورنر حجاز سے ملاقات خود اُس کے دی گئی دعوت کے مطابق ہوئی۔ پہلے کی بنسبت اس مرتبہ ملاقات تفصیل کے ساتھ ہوئی۔ گورنر حجاز کا پہلے سے زیادہ اعتماد بحال ہوا جس کی وجہ سے گورنر حجاز:''اتنا متاثر ہوا کہ حضرت شیخ نے اپنے مقصد کے سلسلہ میں تحریر حاصل کرنی چاہیں وہ مرتب کر کے دے دیں۔ان میں سب سے اہم مسلمانانِ ہند کے نام پیغام تھا جس میں حضرت شیخ پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے ان کی جدوجہد کی تحسین کی تھی اور ہدایت کی تھی کہ ان کی حمایت اور امداد کریں۔''(۹۸)مولانا صاحب نے جو تحریر گورنر کو لکھ کر دی تھی۔گورنر نے اُس کی تصدیق کر دی۔اس کے بعد انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریریں چھاپ کر ملک کے کونے کونے میں پہنچائی گئی۔ترکی، ایران اور افغانستان میں بھی تحریریں پہنچانے کی تعقید کی گئی۔ جہادِ عام کے اعلان کے مضامین جگہ جگہ بھیجے گئے۔۱۹۱۶ء میں حجاز کے ترکی گورنر غالب پاشا نے جو:''اعلان جہادِ عام'' شائع کیا تھا اسے لے کر کابل آئے اور راستے میں اس جہاد نامے کی نقلیں تقسیم کرتے آئے۔''(۹۹) یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی افغان مشن پر اور شیخ الہند حجاز کے مشن پر تھے۔ چوں کہ یہ دونوں مشن اگست ۱۹۱۵ء کے زمانے میں شروع ہوئے تھے۔اُس وقت جنگِ عظیم اوّل ہو چھڑ چکی تھی۔کوئی آٹھ نو ماہ کی مدت کے بعد دونوں مشنوں کو افغانستان اور حجاز میں کامیابی حاصل ہوئی۔اس سفارتی کامیابی کے بعد افغانستان کے مشن نے حجاز والوں کو اور حجاز کے مشن نے افغانستان والوں کو اپنے کام کی صورتحال سے آگاہ کرنا چاہا تو اُس وقت انگریز حکومت کو خبر ہو چکی تھی۔ دونوں مشن اپنی اپنی جگہ ایک طرح جمود کا شکار ہو گئے تھے۔اس طرح ایک دوسرے کو اپنی حکمتِ عملی سے آگاہ نہ کر سکے۔کہیں خود خطوط پہنچانے والے پکڑے گئے اور کہیں خطوط جا کر حکومتِ ہند کو پہنچا دیے گئے۔شیخ الاسلام حجاز میں پہلے روپوش ہوئے پھر گرفتار کر لیے گئے۔مولانا عبیداللہ سندھی نے جو مشن جاپان، روس اور ترکی بھیجے تھے ان کی بھی مخبری ہوئی اور گرفتار ہو گئے۔ جب جنگِ عظیم اختتام پذیر ہوئی اور ترکی کے تمام صوبے اتحادیوں کے قبضے میں چلے گئے۔حجاز سے میاں محمد کے ذریعے افغانستان خطوط پہنچانے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قید ہو کر مالٹا گئے تھے یا نہیں۔تاہم مالٹا کی جیل میں پانچ اشخاص مقید تھے۔بہر کیف مُرتضیٰ انجم نے لکھا ہے کہ:''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھی پہلے تو ہندوستان میں ان لوگوں کے پاس گئے جو مذہبی جوش و جذبہ دیوانگی کی حد تک رکھتے تھے اس کے بعد یہ لوگ کابل چلے گئے۔اور ترکی جرمن مشن کے ممبروں سے ملاقات کی ان سے تبادلہ خیال کیا اسی دوران محمد میاں بھی یہاں پہنچ گئے۔وہ پہلے عربستان گئے۔''(۱۰۰)سفر کی دونوں رودادوں سے محمد میاں کے ترک اور جرمن مشن کے ساتھ جانے کا ثبوت نہیں ملتا۔تاہم حجاز کے سفر پر محمد میاں، شیخ الاسلام کے ساتھ تھے۔حجاز کے سفر پر خاص اشخاص میں سے:''مولانا محمد میاں صاحب انبیٹھوی،(جنھوں نے بعد میں اپنا نام منصور الانصاری تجویز کیا)۔''(۱۰۱)ایک تھے۔مولانا محمود الحسن سے کرنل برن کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے محمد میاں کے بارے میں لا

علمی کا اظہار کیا کہ وہ حجاز میں ہیں یا حجاز سے باہر۔ لیکن انگریز تفتیشی افسروں کے بتانے پر معلوم ہوتا ہے کہ محمد میاں غالب پاشا کا خط لے کر افغانستان چلے گئے تھے۔ کرنل برن اور مولانا محمود الحسن کے درمیان اس بارے میں یوں مکالمہ ہوا کہ:

> مولوی محمد میاں کو جانتا ہوں وہ میرا رفیق سفر تھا۔ مدینہ منورہ سے وہ مجھ سے جدا ہوا ہے وہاں سے لوٹنے کے بعد اس نے جدہ اور مدینہ منورہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں۔

سوال کرنے والا:	محمد میاں صاحب کے پاس
حضرت شیخ:	مولوی محمد میاں کہاں ہیں؟
سوالا کرنے والا:	وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا۔
حضرت شیخ:	پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا
سوال کرنے والا:	لوگوں نے بتایا۔(۱۰۲)

محمد میاں ہندوستان سے افغانستان نہیں گئے بلکہ حجاز آنے کے بعد ایک ڈیڑھ ماہ بعد غالب پاشا کا جہاد کے بارے میں حکم نامہ لے کر افغانستان روانہ ہوئے تھے۔ ریشمی رومال تحریک حقیقی معنوں میں تھی جس نے برطانوی استعمار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں تھیں۔ مولانا محمود الحسن نے انگریز تفتیشی افسروں کے سوالات کے جوابات بڑی سیاسی دانشمندی سے دیئے۔ انگریز افسروں نے ان سے حکومتِ برطانوی ہند کے خلاف سازش کے بارے میں سوال کیا کہ: ''ان کاغذات میں لکھا تھا کہ سلطان ترکی، ایران، اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ کرا کے ہندستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہیے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔''(۱۰۳) انگریز افسروں کے اس سوال کا جواب مولانا محمود الحسن نے دیا کہ:

> میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو بھی حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گزر چکے ہیں۔ کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے اور کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرے جیسا شخص زائل کر سکتا ہے اور پھر اگر زائل بھی ہو جائیں تو کیا ان میں ایسی طاقت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زیادہ سمجھ کر ہندوستان کی حدود پر فوجیں پہنچا دیں اور اگر پہنچا بھی دیں تو آیا ان میں آپ سے مقابلہ کرنے کی طاقت ہے۔(۱۰۴)

ایک طرف افغانستان میں مولانا عبیداللہ سندھی کا مشن کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسری طرف مولانا محمود الحسن بھی اپنے مشن بھی ایک حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ ترکی، ایران اور افغانستان کو متحد کرنے کے لیے پیش رفت ہو چکی تھی۔ مگر مولانا موصوف کی انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے عمل کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جب سے مولانا صاحب حجاز کے لیے ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے انگریزوں کی خفیہ پولیس کے اہل کار جدہ کے مضافاتی

جزیرے تک آئے اس کے بعد یہ کام خفیہ پولیس کے اس گروہ کے سپرد ہو گیا جو حجاز میں موجود تھا۔ حجاز میں بھی ان کی ہر قسم کی حرکات وسکنات پر نظر رکھی گئی تھی۔ دوسری وجہ ان کی بغاوت کے کام میں رکاوٹ کی یہ تھی کہ افغانستان تک پہنچنا مشکل ہو گیا تھا۔ عراق اور ایران میں جنگِ ہو رہی تھی۔ ان ملکوں میں انگریزوں نے ترکوں کی رسد روک دی تھی۔ اہم اہم مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ حجاز میں بھی انگریز اپنی پوری مداخلت کے ساتھ اثر انداز ہو چکے تھے۔ جن دنوں مولانا محمود الحسن حجاز میں تھے اُن دنوں: ''گورنمنٹ برطانیا کی طرف کوئی خط شریف کے نام آیا ہے کہ فلاں تاریخ تک یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ ہم شریف علی کو (جو کہ پہلے شریف حجاز تھا اور شریف حسین موجودہ کا بہنوئی ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا) اس کو حجاز کا شریف بنا بھیجیں گے۔'' (۱۰۵) انگریزوں کی اس دھمکی کی وجہ سے شریف حسین ڈر گیا تھا۔ اُسے اپنی حکومت ختم ہوتی نظر آئی۔ ایسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ۲رجون ۱۹۱۶ء کو شریف حسین نے: ''بغاوت کا اعلان کر دیا۔ حسین کے چاروں لڑکے ایک ایک سمت چل پڑے۔ مکہ، طائف، مدینہ اور جدہ فتح ہو گیا۔ ۱۶رنومبر کو مکہ اور جدہ کے اُمرا نے اکٹھا ہو کر شریف حسین کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔'' (۱۰۶) انگریزوں کے کہنے پر شریف حسین نے جس جہاد کا اعلان کیا وہ غیر مذہبوں کے خلاف نہیں تھا۔ بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف تھا۔ نجدیوں نے مقاماتِ مقدسہ پر کتنے حملے کیے تھے۔ عوام الناس کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ مزارات سے قیمتی سامان لوٹ کر لیے گئے تھے۔ شریف حسین نے اُن کے خلاف کبھی اعلانِ جنگ نہیں کیا تھا۔ جس عرصے میں (شعبان ۱۳۳۴ھ) مولانا محمود الحسن طائف میں قیام پذیر تھے۔ اُس دوران شریف حسین نے کئی ایک مقامات سے ایک ساتھ جنگ کا آغاز کر دیا تھا جس کا سدِ باب کرنا ترکوں کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ مراد یہ کہ: ''ناگاہ ایک بندوق کی آواز سنائی دی پھر تو چاروں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں۔ ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگی مورچے بنا رکھے تھے پورے طور جواب دیتی رہی اگرچہ ترک فوج کی مقدار تقریباً ایک ہزار مسلح سپاہی کے تھی۔'' (۱۰۷) یہاں جس جنگ کی بات ہو رہی ہے درحقیقت وہ جنگ شریف حسین والئی حجاز اور ترکی فوجوں کے درمیان میں تھی۔ شریف حسین کو انگریزوں کی پوری حمایت حاصل تھی جس کے سبب وہ ترکی حکومت کے خلاف جنگ میں مصروفِ کار رہو گیا۔ جنگِ عظیم کے دوران ایک ملک دوسرے کے خلاف جنگ میں مصروف تھا۔ انگریزوں نے ترکی کے خلاف ایسی چال چلی کہ خود ترکی کے نائب السلطنت ہی اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ترکوں کے خلاف شریف حسین کی جو جنگ ۱۱رشعبان ۱۳۳۴ھ کو شروع ہوئی تھی۔ اب تک یعنی ۱۵ررمضان تک جاری تھی۔ ترک فوجیں بھی پوری طاقت سے شریف حسین کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ جس کی منظر کشی حسین احمد مدنی یوں کرتے ہیں کہ:

> دن و رات گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ ترکی فوج ان کے مجمعوں پر توپوں سے گولے بھی برسا رہی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالات۔ اس کے بعد مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے

لینے کے بعد اتاری گئی تھیں اور جنھوں نے مکہ معظّمہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں کے ذریعے فتح کیا تھا طائف میں مع توپوں کے پہنچیں اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات سے آٹھ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ کرنے لگیں۔ صبح سے تقریباً بارہ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں۔ ترک بھی ان کا جواب دیتے تھے۔ یہی حال عید کے دن تک رہا۔(۱۰۸)

مولانا محمود الحسن طائف میں مسجد عباس میں قیام پذیر تھے تو وہاں پر بھی شریف حسین کی فوج آ گئی۔ حملہ آور زیادہ تر بدو تھے جو مسلح تھے۔ مسجد پر چوں کہ ترکی فوجی پیرا دے رہے تھے۔ یہاں دونوں فریقین کے درمیان جنگ ہونے لگی۔ اس واقعہ کے مولانا موصوف خود شاہد تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ: ''عشاء کی نماز اور تروایح ادا کرنے کے بعد نوافل کی دائیگی کے بعد چند بدو مسلح مسجد عباس میں آئے اور مسجد عباس کی چھت اور میناروں پر بھی ایک بڑا دستہ ترکی فوجیوں کا تھا اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا وہاں پر مورچہ تھا۔ غرض کہ طرفین میں خوب تیز گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی۔''(۱۰۹) مسجد عباس میں جنگ کے واقعہ کے بعد اگلے دن مولانا محمود الحسن طائف چھوڑ کر چلے تو: ''باب ابنِ عباس سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرتے ہوئے (قیم) میں پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شریف کا بیٹا عبداللہ بیگ جو کہ کماندار بدوؤں کا تھا، مقیم تھا۔ اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے۔''(۱۱۰)

مولانا محمود الحسن اور ان کے احباب حجاز سے جلد از جلد نکلنا چاہتے تھے۔ اُنھیں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ شریف حسین کی خفیہ پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ انھیں گرفتار کر کے شریف حسین انھیں انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ کرنل ولسن نے شریف حسین کو کہا تھا کہ: ''مولانا اور ان کے جملہ ہمراہیوں اور حکیم نصرت حسین صاحب اور سید ہاشم صاحب کو زیرِ حراست یہاں بھیج دو۔''(۱۱۱) اگر چہ مولانا صاحب نے شریف حسین سے معافی بھی مانگی لیکن اُس نے انھیں گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ مولانا کی گرفتاری کا جب عرب میں موجود ہندوستانی تاجروں کو علم ہوا تو انھوں نے بھی شریف حسین سے مولانا کی رہائی کی بات کی۔ مگر شریف حسین انگریزوں سے خوف زدہ تھا۔ اس لیے ہر صورت انھیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے شریف حسین نے ہندوستانی تاجروں سے کہا تھا کہ: ''ہماری اور انگریزوں کی دوستی ابھی نئی ہے، ہم نہیں چاہتے کہ ہم ان کی رعایا کو کوئی سزا دیں اور پھر وہ ہماری دوستی میں فرق اور اختلاف کا باعث ہو۔ ہم کو ان کی دوستی قائم رکھنی ضروری ہے، ہم کسی طرح اس وقت رعایت نہیں کر سکتے۔''(۱۱۲)

مولانا محمود الحسن انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے لیے اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کا اس تحریک کا حصہ بنایا تھا۔ ترکی کے علاوہ ایران اور افغانستان کی اپنی داخلی صورتِ حال ایسی نہیں تھی کہ وہ انگروں پر حملہ کر سکیں۔ ترکی کی

حکومت اگرچہ ایشیا میں موجود تھی لیکن وہ خود افریقہ اور ایشیا میں مسائل کا شکار تھی۔ دوسری طرف یورپ میں انگریزوں کے ساتھ اور زیادہ الجھی ہوئی تھی۔ ادھر افغانستان نے ہندوستان پر حملہ تو کیا مگر خود مسائل میں گھر گیا۔ صلح کرتے ہوئے کسی طرح اپنی آزاد سلطنت آزاد تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ جنگ کے اختتام پر ہندوستان علما کی گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی روس چلے گئے تھے۔ اور مولانا محمود الحسن گرفتار ہو کر زندگی کے باقی ایام مالٹا کی جیل میں گزار رہے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے نظریات بھی کسی قدر سوشلسٹ ہو چکے تھے۔ دوسری طرف قید میں رہتے ہوئے مولانا محمود الحسن کی تحریک بھی دم توڑ گئی تھی۔ ترکی کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ حجاز و عرب شریف حسین کے قبضے میں آ چکا تھے۔ نہر سویز پر انگریز قبضہ کر کے فرانس کو نہر وسویز سے بے دخل کر چکے تھے۔ ایران، عراق اور شام بھی محکوم ہو چکے تھے۔ فلسطین پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ بلقانی ریاستیں پہلے ہی ترکی سے آزادی حاصل کر چکی تھی: ''اب ترکی کے پاس قسطنطنیہ تھا جو واحد یورپی علاقہ تھا۔'' (۱۱۳)

جنگِ عظیم دوم کے ختم ہونے پر عرب کے قومیت پرست ترکی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ترکی نے جنگ میں حصہ لیا تو یورپیوں نے اس کے صوبوں پر حملہ کر دیا۔ ترکوں کے خلاف عربوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے لارڈ کچنار نے شریف حسین کے ساتھ مذاکرات کیے۔ ترکی کی مرکزیت سے تعلق ختم کر کے تیزی سے اپنے آپ کو مضبوط کیا۔ شریف حسین نے اپنے بیٹوں کی خواہشات کے خلاف انگریزوں کے ساتھ معاملات طے کیے تھے۔ اس لیے عبداللہ اور فیصل نے دوبارہ مصر میں انگریزوں کے ساتھ مذاکرات کیے۔ اس طرح انگریز عرب کی دوبارہ معاونت کرنے پر راضامند ہو گئے اور یہ اعلان کیا کہ جنگ کے بعد عرب آزاد ہو جائیں گے۔ اسی لیے شریف حسین نے: ''۱۹/ اکتوبر (۱۹۱۴ء) کو عرب کی آزادی اور پھر عرب مملکت کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے تلخی بڑھی۔ اتحادی اسے حجاز کا بادشاہ تو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن عرب ملکوں کا بادشاہ ماننے میں انھیں کوئی منطق نظر نہ آئی۔'' (۱۱۴) حقیقت میں انگریزوں نے عرب کے علاقے میں دہری سیاسی منصوبہ بندی اپنا رکھی جس کی وجہ سے شریف حسین نے اپنی خود مختاری اور آزادی کا اعلان کیا تھا۔ جیسا کہ عبدالقیوم لکھتے ہیں کہ: ''جنگِ عظیم کے دوران ابنِ سعود اور شریف حسین کے مفادات کا کئی بار تصادم ہوا جولائی ۱۹۱۴ء میں شریف حسین نے عثمانی بالادستی کا جوا اتار پھینکا اور ترکوں کے خلاف اتحاد کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ اسی مہینے میں شریف حسین نے ایک اور اقدام یہ کیا کہ ینبوع کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔'' (۱۱۵) جنگ میں ترکی کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے عرب کی خود مختاری تو تسلیم کر لی مگر فلسطین، شام اور عراق کو ترکوں سے آزاد کرنے کے لیے انگریزوں کا ساتھ دیا، اس مرحلے پر امام الدین لکھتے ہیں کہ:

> Husayn negotiated with the Bakris of Syria and the decret Syrians Society. Al- Fatat- Ahd , who had joined the revolt

against (excluding, adan), Palestitne,Syria and Iraq.Husyan opened corresponence with McMahon, the British High Commissioner in Egypt, in July 1915 after a long negotiation the British agreed in 1916 to accept, Arab independance with certain reservations viz.,Lower Egypt to be under British influnce and the Lebanan Under the French.(۱۱۶)

عرب ممالک کی آزادی کے بارے میں امام الدین کے بیان سے متعلق محمد عبدالقیوم کا بیان اس طرح ہے کہ:'' شریف حسین نے جون ۱۹۱۶ء میں ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور ترکوں کو حجاز، عراق اور شام و فلسطین سے نکالنے کے لیے برطانیا کا مقدور بھر ساتھ دیا۔''(۱۱۷) انگریزوں نے جنگ میں کامیابی کے بعد فلسطین، شام اور عراق اپنے پاس رکھے اور لبنان فرانس کے حوالے کر دیا۔ شریف حسین کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ انگریز اسے پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کریں گے۔ اس طرح انگریزوں نے صرف ملک عرب و حجاز کی آزادی تسلیم کی باقی علاقے اپنے پاس ہی رکھے۔ امام الدین کا یہ بیان اس بات کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ:

Husayn suggedted that the solutions of these two points viz. the British and french interstes in certain parts of Arab pamphlets were dropped from the air at Juddah in 1915 declaring that the British were prepared to include in terms of peace the provision that the Holy Places would be independent of any European influence.(۱۱۸)

شریف حسین اور اور ابن سعود کے درمیان جنگ سے انگریزوں کے مشاہدے میں یہ بات سامنے آئی کہ ابن سعود روز بروز طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ عرب قبائل بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے اور انگریز بھی۔ ابنِ سعود کو اب ہر محاذ پر فتح حاصل ہو رہی تھی: ''ابن سعود نے شروع میں تو شریف حسین کے ان اقدامات پر خاموشی اختیار کی لیکن ۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں خرمہ کے سرحدی نخلستان میں دونوں کی افواج میں مسلح تصادم ہو گیا۔''(۱۱۹) اس جنگ میں شریف حسین کو بہت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ: ''فتح نے ابنِ سعود کے قدم چومے۔ شریف حسین کے تین ہزار سے زائد آدمی مارے گئے۔''(۱۲۰) شریف حسین اور ابنِ سعود کے مابین اب جنگ جاری تھی۔ جس کی وجہ سے موقع پا کر: ''شریف حسین نے ۱۹۱۹ء میں ابن سعود کی مملکت پر حملہ کر دیا۔ تربہ کے مقام پر دونوں افواج کا مقابلہ ہوا۔''(۱۲۱) ابنِ سعود کے شریف حسین کے

ساتھ ساتھ رشیدیوں کے ساتھ بھی معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ابن سعود نے رشیدیوں کے علاقے جبل الشہر اور حائل پر حملہ کر کے فتح حاصل کی اور پورے نجد کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ابن سعود کے سامنے:"۱۹۲۰ء میں عبداللہ بن متعصب بن عبدالعزیز نے ہتھیار ڈال دیے۔۱۹۲۱ء میں انھوں نے رشیدیوں کو آخری فیصلہ کن شکست دی۔جبل الشہر اور حائل کے علاقوں پر قبضہ کر لیا گیا۔اسی سال محمد بن طلال نے ہتھیار ڈال دیئے۔اس طرح پورا نجد سعودیوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔"(۱۲۲)

ابنِ سعود کی کامیابیوں کا سلسلہ طویل ہو گیا تھا جسے دیکھ کر انگریزوں نے اپنی توجہ ابنِ سعود کی طرف مرکوز کر لی۔ انگریز اب ابنِ سعود کو اسلحہ اور نقد امداد دینے لگے۔اسی بنا پر انگریزوں نے شریف حسین کو امداد دینا بند کر دی تھی۔دوسری طرف شریف حسین نے مقاماتِ مقدسہ پر ٹیکس لگا۔اس سے پہلے ان مقامات پر ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا۔اتاترک کمال پاشا نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کر کے سلطان عبدالحمید کو ملک بدر کر دیا تھا۔اس سیاسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے شریف حسین نے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔اس طرح شریف حسین کی خلافت صرف تین دن برقرار رہ سکی۔حجاز پر ٹیکس لگانے اور خلافت کا اعلان کرنے کی وجہ سے عرب عوام اس کے خلاف ہو گئی۔عوام نے ابنِ سعود کا ساتھ دیا۔اس طرح سے شریف حسین کو بادشاہت اور خلافت دونوں سے دستبردار ہونا پڑا،عبدالقیوم لکھتے ہیں کہ:

> کمال اتاترک نے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید اور ان کے خاندان کو جلاوطن کر دیا۔تو سات مارچ ۱۹۲۴ء کو شریف حسین نے اپنے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔اس کا خیال تو یہ تھا کہ لوگ فوراً ان کی بیعت کر لیں گے،لیکن اس اعلان کا ردِعمل عرب سے باہر ناخوشگوار ہوا خصوصاً برِصغیر کے مسلمانوں نے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں سخت مخالفت کی۔(۱۲۳)

امام الدین نے عرب میں ابنِ سعود کے عروج کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> As early as July 1922 the British had Pacified Ibn Sa'ud by giving him 35000 rifles and as annual grant of Pounds 6000. The British Also paid annual subsidy to Husayn of the Hijaz but relation between the two because of the British policy in Palestine. In march 1924 the British withdrew both the grants and left the toe rival dynasties to compete for power and existence. The annaul grand being stoped Husayn had to levy taxes on Makkas and Madinah which had been so long tax-free cities.This antagoniged the people and helped Ibn Sa'ud in advancing his interest in the

Hijaz. In spite of this being unpopular at home and abroad, Husayn proclaimed himself caliph of Islam on March 6, 1924 just three days after the abolition of the Ottoman Khilafat. The Wahhabis Attacked and capured Ta'if in nov. 1924 massacring its inhabitants whom they considered idolartous.(۱۲۴)

شریف حسین کی خلافت اور حکومت ختم ہونے کے بعد سارے عرب پر اب ابنِ سعود کا قبضہ ہو گیا تھا۔ سوائے طائف اور مکہ کے، ابنِ سعود کو ان مقام پر برائے نام سی فوج کشی کرنے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی۔ شریف حسین کی بادشاہت کے تابوت میں آخری کیل لگانے کے لیے: ''آخر شریف حسین کا خدشہ مٹانے کے لیے ابنِ سعود کی فوجوں نے طائف کو گھیر لیا۔ شدید مزاحمت کے بعد طائف فتح ہو گیا۔ اب سعودی افواج مکہ کی طرف بڑھیں ۳۰/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو شریف حسین نے تخت سے دستبردار ہونے کا اعلان کیا۔ پندرہ روز بعد مکہ معظمہ پر سعود کا پھریرا لہرانے لگا۔'' (۱۲۵) ایک رائے کے مطابق شریف حسین حکومت سے دستبردار ہو کر قبرص کو فرار گیا تھا۔ تاہم طائف کے بعد ابنِ سعود نے مکہ فتح کر کے دسمبر ۱۹۲۴ء کو عرب میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ جس کی وضاحت کے لیے امام الدین نے لکھا ہے کہ:

In October 1924 the Wahhabis had marched into Makkah. thus after 120 years of the first Wahhabi entry under the leadership of Abd al- Aziz I, Abd al - Aziz II (Ibn Sa'ud) made his solemn entery in Dec 1924.(۱۲۶)

☆ مولانا غلام رسول مہر نے اکتوبر ۱۹۲۵ء حجاز کا سفر اختیار کیا تھا۔ ۲۹/ مئی ۱۹۳۰ء مولانا غلام رسول مہر۔ مولانا ظفر علی خان، مولانا سید احمد، سردار عبدالرب نشتر اور دوسری نامور شخصیات سفر میں ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر ولی محمد بھوپالی، بھوپال کی کونسل کے ممبر، تاریخ اندلس لکھ رہے تھے، وہ بھی دورانِ سفر ساتھ تھے۔ انھوں نے اس سے پہلے ''سفر نامہ اندلس'' لکھا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے مولانا اسمٰعیل غزنوی اور چند دوسرے احباب کو خطوط لکھتے رہے تھے۔ ان کے خطوط ترتیب وار روز نامہ ''انقلاب'' لاہور سے قسط وار شائع ہوتے رہے۔ بعد میں ان کا سفر نامہ مرتب کیا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اُس وقت حجاز کا سفر کیا جب سلطان عبدالعزیز ابنِ سعود انگریزوں کی مدد سے شریف حسین کو شکست دے کر قابض ہو چکا تھا۔ عبدالقیوم نے اس دور کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ: ''اب شریف حسین کا بڑا بیٹا جانشین ہوا۔ اس نے جدہ کو دارالحکومت بنایا دسمبر ۱۹۲۵ء کو مہینے کے محاصرہ کے بعد مدینہ منورہ فتح ہو گیا۔ اور ۲۳ دسمبر کو سعودی فوج نے جدہ پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ ۸/ دسمبر ہی کو جدہ سے نکل گیا تھا۔ شریف حسین قبرص جا چکا تھا۔ اب ابنِ سعود اپنی مملکت کے بلا شرکت غیرے

حکمران تھے۔"(۱۲۷)غلام رسول مہر نے اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ہندوستان سے سفر کیا تھا۔ان کے سفر کا مقصد خلافت کمیٹی کا پیغام سلطان بن عبدالعزیز تک پہنچانا تھا۔تاہم:"مولانا غلام رسول مہر نے بیرونِ ملک متعدد سفر کیے جو اپنی بعض یادگاروں کی بنا پر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔سب سے پہلا سفر انھوں نے ۱۹۲۵ءمجلسِ خلافت کے وفد کے ساتھ حجاز کا کیا۔یہ وہی وفد خلافت ہے جس کے ایک رکن مولانا ظفر علی خاں تھے۔انھوں نے مولانا ظفر علی خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کیا تھا۔"(۱۲۸)یہ غلام رسول مہر کا پہلا سفر تھا۔جس وقت شریف حسین کو ملک بدر کر کے قبرص روانا کیا گیا تھا۔شریف حسین کے اس سفر کے بارے میں امام الدین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں:

> Husayn was now forced to abdicate the throne in favour of his son, Ali and sail in a British warship to Cyprus from jaddad in july,1925.(۱۲۹)

مولانا غلام رسول مہر کے سفر نامے کا تعارف ضیا اللہ کھوکھر نے لکھا ہے۔وہ شریف حسین کے ملک بدر ہونے سے لاعلم ہیں یا پھر کہیں ان کے مطالعہ میں یہ بات آئی ہے کہ شریف حسین شکست خوردہ ہو کر فلسطین میں جا کر آباد ہوا۔ضیاءاللہ کھوکھر کا بیان ہے کہ:"۱۹۲۴ء میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود انگریزوں کے آلہ کار اور حاشیہ بردار شریف حسین اور اس کے حواریوں کو شکست سے دوچار کر چکے تھے۔حسین مکہ سے فرار ہو کر فلسطین چلا گیا۔"(۱۳۰)مولانا غلام رسول مہر چوں کہ سعودی شہنشاہ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔اس لیے وہ سلطان عبدالعزیز کے بارے میں لکھتے ہوئے القاب و آداب کا خیال رکھتے ہیں۔حالاں کہ آل سعود کی سفاکی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔غلام رسول مہر کے دوسرے سفر کے بارے میں ہے کہ:"مولانا غلام رسول مہر نے خادمِ حرمین الشریفین سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر اس سفر مبارک کا عزم فرمایا اور ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ کو کراچی سے روانہ ہوئے۔"(۱۳۱)جس وقت مولانا غلام رسول مہر حجاز میں تھے تو اسی دوران میں ان کی ملاقات مولانا عبیداللہ سندھی سے ہوئی تھی۔ریشمی رومال تحریک کی ناکامی کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی کابل سے روس اور بعد میں ترکی کے سفر پر چلے گئے۔اس کے بعد حجاز و عرب چلے آئے۔غلام رسول کی پہلے بھی ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔لیکن اس وقت انھوں نے:"۱۹۱۵ء میں ہندوستان چھوڑا تھا اور اب تین چار سال سے مکہ معظمہ میں ہیں"(۱۳۲) مولانا عبیداللہ سندھی کوئی قریب تین سال کے عرب میں رہے۔

غلام رسول مہر کے سفر نامہ حجاز میں ایک اہم تاریخی واقعہ نہر زبیدہ کا ذکر کیا گیا ہے۔جیسا کہ عرب کی زمین بے آب و گیا تھی۔اس میں پانی کی ترسیل مشکل سے ہوتی تھی۔حج کے دنوں میں حاجیوں اور عوام کو بہت زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ۱۹۳ء میں:

> خلیفہ ہارون الرشید کی محبوب بیگم زبیدہ خاتون نے حج کیا اور حاجیوں کی تکالیف کا اسے احساس ہوا تو اس

نیک اور خدا پرست خاتون نے پانی کا انتظامات کو زیادہ مستقل صورت دینے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی جیب سے روپیہ دیا۔ مہندسوں کو طائف و عرفات کے درمیان پہاڑوں کو بھیجا، آخر حنین کے قریب ایک چشمہ ملا، اس کو مرکز و منبع بنا کر نہر بنائی اور راستے کے دوسرے چشموں کو بھی اس کے ساتھ ملا دیا،...... یہ وہ نہر ہے جو ساڑھے گیارہ سو سال سے حرم پاک میں خیر جاریہ کا بہترین عمل شمار ہوتی ہے، اور زبیدہ خاتون کے نام کو تا قیامت زندہ رکھے گا...... یہ نہر اپنے مرکز سے چل کر وادی عرفات تک زمین کے اندر اندر آتی ہے۔ عرفات پہنچ کر سطح کے برابر پہنچ جاتی ہے اور پھر مکہ تک کہیں زمین کے اندر کہیں باہر۔ (۱۳۳)

ملکہ زبیدہ کی نہر کے بارے میں بہت سے حجاج نے تاریخی حوالے سے لکھا ہے۔ اس طرح جان کوئیس برکھارٹ نے بھی خاص طور پر تحقیق کے انداز میں مذکورہ نہر کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

اس نہر کی تاریخ جو عربی مورخوں نے بیان کی ہے وہ بہت طول طویل ہے۔ زبیدہ خاتون ہارون الرشید کی بیگم پہلے ایک چشمہ کو جسے عین نعمان کہتے ہیں۔ اس کے منبع سے جو جبل قریٰ میں واقع ہے شہر میں لائی اس کے بعد عین عرف کو جو جبل قریٰ کی شمال کی طرف جبل شامخ میں واقع ہے اور حنین کی زرخیز وادی کو سیراب کرتا ہے۔ عین نعمان سے لاکر ملا دیا اور آخر میں چار اور چشمے' برود، زعفرانم میمون اور مقاش سے اس کو مدد پہنچائی کچھ دن بعد نہر بند ہوگئی لیکن ۶۴۳ ہجری میں ملک کوک پوری شاہ اربل نے اس کی مرمت کرائی پھر ۷۲۶ھ میں سلطان ابوسعید خدا بندہ کے حکم سے مرمت ہوئی اور تیسری مرتبہ ۸۱۱ھ میں شریف حسین ابنِ عجلان نے جو اُس وقت حکمران تھا اس کی درستی کرائی لیکن کامل طور پر نہ ہوئی ۸۷۹ھ میں سلطان قائد بے مصری نے ایک بڑی رقم صرف کی ۹۱۶ ہجری میں مصر کے آخری چرکسی فرمانرواں میں سے ایک نے اس کو صاف کرایا لیکن اس کے بھی نہر اکثر بند ہوتی رہی۔ اور جب کبھی یہ بند ہو جاتی تو مکے والوں اور حاجیوں کو بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا تھا۔ ۹۳۱ھ میں سلطان سلیمان نے اس کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی کوشش کی مگر تکمیل کو نہ پہنچی آخری اس کے بیٹے سلطان سلیم ثالث نے بڑی کوشش اور بڑے مصارف کے بعد عرفات کے نیچے سے ایک راستہ پہاڑوں میں کھودا اور ایک نہر بنوائی جو اب اس وقت موجود ہے ۹۰۹ھ میں سلطان سلیم کو شہر میں پانی لانے میں بڑی کامیابی ہوئی اور بڑی کثرت سے پانی آیا۔ نہر کی کل لمبائی کوئی سات آٹھ گھنٹہ کا رستہ ہے۔" (۱۳۴)

ملکہ زبیدہ کی نہر کی روانی اور مرمت کے بارے میں ایک تاریخی تسلسل موجود ہے لیکن سوائے چند تاریخی حقائق کے اس پہلو پر زیادہ بحث نہیں کی جائے گی۔ تاہم اس نہر کو کئی بار حملہ آوروں نے برباد بھی کیا اور کئی ایک نے آباد بھی کیا۔ جیسا کہ: "گزشتہ محاصرے میں وہابیوں نے اس نہر کا سلسلہ نہر کاٹ دیا تھا اور اس سے جو صدمہ اس عمارت کو پہنچا اس کی تلافی ایک عرصے کے بعد مرمت سے ہوئی۔" (۱۳۵) نہر ایک صدقہ جاریہ اور رفاع عامہ کا کام دیتی تھی۔ کارِ خیر کے لیے اس کی مرمت جاری توسیع وقت کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ جیسے کہ غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ: "شریف حسین کے آخری

زمانے میں یہ بالکل معطل ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شریف حسین کے عہدِ حکومت کے آخری دو برسوں میں پانی کی قلت کے باعث حاجیوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ سلطان ابن سعود مکہ معظمہ آئے تو انھوں نے بہت بڑی رقم اپنی گرہ سے صرف کر کے نہر کو نجدیوں کے ذریعے سے صاف کرایا۔''(۱۳۶) جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ ملکہ زبیدہ کی نہر کا باقاعدہ تاریخ کا ایک سلسلہ ہے۔ خود ملکہ نے بھی اس نہر کے اخراجات کا احساب نہیں لگایا۔ جب اس کے پاس اخراجات کی فہرس لائی گئی تو اُس نے بغیر دیکھے ہی وہ فہرست دریا بُرد کرادی تھی۔

حجاز میں افغانستان کے ایک سفیر تھے وہ ان دنوں سعود عرب میں آئے ہوئے تھے جن دنوں مہر علی صاحب وہاں موجود تھے۔ اس سفیر کا نام سردار گل محمد خان تھا۔ افغانستان کے بادشاہ کی طرف سے تھے سعودی عرب میں کسی سفارت کے سلسلے میں آئے تھے۔ افغانستان کے سفیر ۱۹۲۹ء میں حج کے موقع پر حجاز آیا ہوا تھا اور غلام رسول کے قیام ۱۹۳۰ء کے دوران میں ان کی ملاقات افغانی وفد کے ساتھ ہوئی جس سے انھوں نے دریافت کیا کہ: ''سردار صاحب نے سلطان کے حالات دریافت کیے اور بعد میں فرمایا کہ میرے جذبات کی حالت تو یہ ہے کہ میں اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی کے جھنڈے تلے ایک عام لشکری کی حیثیت سے اسلام کے لیے لڑنا باعث فخر سمجھتا ہوں۔''(۱۳۷) مولانا غلام رسول مہر کو اس کے علاوہ اور بہت سی خبر ملتی رہتی تھیں جن کا تعلق سیاست یا تحریک آزادی سے ہوتا تھا۔ اس طرح مناسکِ حج ادا کرتے ہوئے: ''گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ہمیں منیٰ میں مل چکی تھی، نیز کسی نے بتادیا تھا کہ پشاور میں ہنگامہ ہوگیا ہے۔ اسماعیل جدہ سے بہت سی خبری لایا۔ یعنی ڈاکٹر عالم، ڈاکٹر ستیہ پال اور مولانا ظفر علی خان کی گرفتاری، پشاور کے ہنگامے کی تفصیلات، مولانا عبدالقادری قصوری کا بیان، پریس ایکٹ کا بذریعہ آرڈی نینس نفا۔''(۱۳۸) گاندھی جی، ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر عالم اور مولانا ظفر علی خان ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنما تھے جنھیں وقتاً فوقتاً گرفتار کیا جاتا تھا۔

ایشیا میں مشرقِ وسطیٰ عرب ممالک کی سیاسی صورتِ حال کے بعد دیکھا جائے تو ہندوستان کے جنوب مشرقی میں مشرقِ بعید ہے، جس میں برما جنوب واقع ہے۔ اس کے ہمسائیوں میں بھارت، چین، بوٹان، اسام شامل ہیں۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا میں اور ان سے ملحقہ جزیزے سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ ایک طرح سے یہ جزائر بھی برما کے ہمسایہ ممالک ہیں۔ برما کا ایک حصہ اسام کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف ایک پٹی کی صورت میں پھیلا ہوا۔ یہ پٹی بندر گاہوں کا کام دیتی ہے۔ برما کی اہم بندرگاہ رنگون ہے۔ جسے نوآبادیاتی عہد پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اس کے توسط سے انگریز و برما پر قابض ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں نے برما کو ہندوستان کا ایک صوبہ بنادیا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں برما جنگ کا ایک اہم مرکز بنا رہا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے کے بعد جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر کے اس کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کردیا۔ جنگ کے دوران جاپانیوں کی وجہ سے دو طرح کی تبدیلیاں

آئیں جن کا ذکر مینگ ہن ہانگ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> The war itself introduction some important change in the situation which were not fully appreciated by the British at the outset. In the first place, the circumstances and rapidity of the Japanese conquest of Burma solessend British prestige that, in spite of Japanese conduct it was impossible for them to reclaim the position of 1937-1941. and in the second place ,by the end of the war new leadership hademerage which had gained experience and assurnce and a feeling of power through organization and operation of an anti Japanese movement with in Burma.(۱۳۹)

جاپانیوں کے برما آنے پر ان کی مخالف سیاسی تحریک نے جنم لیا۔ شروع میں جاپانیوں کو برما پر قبضہ برقرار رکھنے میں دشواریوں کا سامنا رہا۔ اس کی وجہ انگریز نہیں تھے۔ انگریز تو بذاتِ خود وسطی ایشیا، یورپ اور افریقہ میں مصروفِ جنگ تھے۔ جاپانیوں کی مخالفت کی وجہ برمیوں کا اپنا سیاسی شعور اور قومی تحریکیں تھی۔ ایک رائے کے مطابق: ''برمی سیاسی جماعتیں انگریزوں سے نفرت کرتی ہیں اور اپنے ملک برما کو ان کے قبضے سے نجات دلانا چاہتی ہیں۔ ہوسکتا ہے یہاں برمی لوگ انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کردیں توڑ پھوڑ ہونے لگے۔'' (۱۴۰) جب جاپانیوں نے برما پر حملہ کیا تو عوام انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔ عوام انگریزوں سے جاپانیوں کے توسط سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جاپانیوں کا منصوبہ پر قبضہ کر کے حکومت کرنا تھا۔ برما پر جاپانیوں نے ۱۹۴۱ء میں فضائی اور زمینی حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ جس دور میں جاپانیوں نے برما پر قبضہ کیا اے حمید برما میں موجود تھے جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد وہاں سے فرار ہوئے۔ دوران سفر انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا ذکر بڑی تفصیل سے انھوں نے اپنے سفرنامے ''رنگوں سے فرار'' میں کیا ہے۔ عمومی واقعات سے قطع نظر اے حمید نے تاریخی واقعات کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ برما پر اس دور کے فضائی حملے کی تفصیل اخباروں میں چھپتی رہتی تھی۔ لیکن اے حمید کی آنکھوں دیکھا حال یہ ہے کہ: ''اس وقت رنگون میں موجود تھا۔ جاپانیوں کے بمبار جہاز بالکل سفید رنگ کے تھے، شاید المونیم کے تھے، کیوں کہ دھوپ میں چمک رہے تھے۔ یہ بمباری طیارے (V) وی کی شکل کی تین ٹکڑیوں میں دن کی روشنی میں رنگون کے آسمان پر نمودار ہوتے تھے۔'' (۱۴۱) جنوب مشرق سے تمام ممالک سے جاپانی انگریزوں کو بے دخل کر چکے تھے۔ اسی طرح رنگون میں بھی انگریزوں کی حکومت ختم ہو گئی

تھی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپان نے رنگون (برما) پر شدید بمباری کی۔ یوں بھی جنوب مغرب میں جاپانیوں کی اجارہ داری قائم ہو رہی تھی۔ اے حمید اس تاریخی حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> جب سنگاپور بھی انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو جاپانی فوجیں انگریزوں کے دفاع کو خس و خاشاک کی طرح اڑاتی برما میں داخل ہو گئیں۔ رنگون شہر میں افراتفری مچ گئی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا کہ ریڈیو جاپان نے اعلان کیا کہ ہم رنگون کے لوگوں کو کرسمس کا خاص تحفہ دینے آ رہے ہیں اور پھر ایک روز جب کہ رنگون کا آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ آسمان پر وی (V) کی شکل میں کتنے ہی جاپانی بمبار طیارے نمودار ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی رنگون شہر سائرن کی آوازوں سے گھونج اُٹھا۔ (۱۴۲)

رنگون پر جاپانیوں کے قبضے کے بعد انگریزوں کی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ اب رنگون میں جاپانی جہازوں کی: ''گھن گرج سنائی دی۔ اس وقت کوئی سائرن نہیں بجا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ انگریزوں کے طیارے ہوں گے۔ مگر انگریزوں کے طیارے وہاں کہیں بھی کسی بھی وقت آسمان پر نمودار نہیں ہوئے تھے۔'' (۱۴۳) جاپان کے طیاروں کو برمی ٹارچ کی روشنی لگا کر بمباری کے لیے رہنمائی کرتے تھے۔ اے حمید کا کہنا ہے کہ: ''برمی لوگ جاپانیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ رنگون میں تو لوگوں کا کہنا تھا کہ برمی ففتھ کالم والوں نے ٹارچ کی روشنیوں کے سگنل دکھا دکھا کر جاپانیوں سے بمباری کرائی ہے۔'' (۱۴۴) اسی لیے جاپانیوں نے کرسمس کا تحفہ خاص طر پر انگریزوں کو دیا تھا۔ جاپانیوں کے: ''طیاروں نے غوطے لگا کر عمارتوں اور بازاروں پر مشین گنوں کی فائرنگ کر رہے تھے۔ رنگون بم کے دھاکوں سے جل رہا تھا۔'' (۱۴۵)

برما میں جاپانیوں کے عروج زوال کی داستان اپنی مثال آپ ہے۔ جب انگریز کسی قدر افریقہ میں سنبھلے تو انھوں نے جنوب مشرق کی طرف توجہ دی۔ اتنی دیر میں امریکا بھی جنگ میں کود پڑا تھا۔ امریکا کے جنگ میں شامل ہونے کی وجہ سے جنگ کا میدان انگریزوں کے حق میں ہونے لگا۔ کرنل محمد خان بھی برما میں رہے ہیں۔ کچھ برما کے چشم دید بیانات ان کے بھی ہیں۔ برما میں انگریزوں نے جاپانیوں کو شکست دینے کے لیے ایک طویل جنگ لڑی۔ جاپانی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن برما کی آبادی ویران ہو گئی۔ کرنل محمد خان لکھتے ہیں کہ: ''تین سالوں کی دردناک جنگ سے اس کی کھیتیاں ویران اور بستیاں سنسان ہو گئی تھیں اور دردناک تر یہ کہ اہل برما کے دن ویران ہو گئے تھے۔'' (۱۴۶) کرنل محمد خان مکٹیلا میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ برما میں جاپانی فوج کی موجودگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ: ''ہمیں بتایا گیا کہ یہ چند روز پیشتر زندہ جاپانی دلیروں کے سر پر غرور تھے لیکن اس وقت برما میں زندہ جاپانی صرف دو قسم کے تھے۔ وہ جو اسیران جنگ تھے یا وہ جو اس حالت میں بھی کمین گاہ میں اپنے فاتحین کی خاطر اپنی آخری گولی محفوظ رکھے بیٹھے تھے۔'' (۱۴۷) انگریزوں نے ہندوستانی لیڈروں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ جنگ میں معاونت کریں تو انھیں فتح حاصل ہونے کی صورت

میں انگریز ہندوستان کو جلد آزاد کر دیں گے۔ سر ونسٹن چرچل کے اس بیان نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ برما کے قیام کے دوران کرنل محمد خان اسی طرح کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:'' جب کبھی تمام ہندوستانی افسر میس میں مل کر انگریزوں کو سنانے اور ستانے کے لیے ''برما کی لونڈیا'' کا کورس گاتے تو کیپٹن محمد امین کی سربراہی میں اودھم مچاتے کہ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی ایمپائر کی بنیادیں ہلتی ہوئی نظر آتیں اور وہ چاروناچار ہمارے کورس میں شامل ہو کر چلانے لگتے۔.... ''ملتی ہے چہرے پر مٹی ٹالاب کی'' (۱۴۸)

☆امیر افغانستان امان اللہ خان نے جنگ کے بعد انگریزوں سے صلح کی۔ انگریز چوں کہ پہلی جنگِ عظیم میں بُری طرح مصروف ہو چکے تھے۔ وہ افغانوں کے ساتھ کوئی نیا محاذ نہیں کھولنا چاہتے تھے۔ سابقہ جنگوں سے انگریزوں کو یہ سبق حاصل ہو چکا تھا کہ برطانوی ہند کی بقا اسی میں ہے کہ افغانستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں افغانستان کو آزاد اور خود مختار ملک تسلیم کر لیا۔ افغانستان کا امیر امان اللہ خان ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ جس نے یورپ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی بیوی ثریا بھی ایک روشن خیال قسم کی خاتون تھی جو افغانستان کی لڑکیوں کو جدید یورپی تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ اسی بنا پر اس نے سقوی خاندان کی چند لڑکیوں کو اپنے ساتھ یورپ کے سفر پر لے جانا چاہا۔ ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا امان اللہ کا ایک اچھا اقدام تھا مگر عوام میں لادینی پھیلانا عوام کو گوارا نہیں تھا۔ تاہم:
''۱۹۲۷ء ۱۹۲۸ء امیر امان اللہ خان نے یورپ کا سفر اختیار کیا کیوں کہ وہ یورپ کی ترقی کا بچشم خود مشاہدہ کر کے اپنے ملک میں افغانستان کو جلد سے جلد ان کی سطح پر لانا چاہیے تھے۔'' (۱۴۹) یورپ کے علاوہ امان اللہ نے اسلامی ممالک کا بھی ایک جائزہ لیا۔ وہ ایران کے پہلوی شاہ ملا سے متاثر تھا اور اس سے اکبر کے حوالے سے مشورے کیا کرتا تھا۔ ایران پر اس وقت امریکا اثر انداز تھا اس لیے اس ملک میں بھی عورت پردے سے باہر آ کر ملک کو ترقی دینے کی راہ پر گامزن تھی۔ اس طرح:
''امان اللہ خان نے اسلامی ملکوں کی ترکی اور استحکام کا ایک طویل المعیاد پروگرام طے کیا۔ ایران کے شاہ پہلوی کے ساتھ بھی راز کی گفتگو ہوئی۔'' (۱۵۰) ملک میں روشن خیالی اور جدت لانے کے لیے امان اللہ نے اپنی بیوی کو اپنا ہم نوا بنایا جس کی وجہ سے بعد میں بہت سے مسائل نے جنم لیا اور امان اللہ کی حکومت کے خاتمے کی وجوہات بھی امان اللہ کی بیوی بنی۔ جواہر لال نہرو کے تجزیہ کے مطابق:

> امان اللہ نے اپنے ملک میں نئی پالیسی اپنا کر مزید توجہ حاصل کرنا شروع کر دی۔ یہ مغربی انداز میں اصطلاحات کا نفاذ تھا۔ اس نے ملک کو مغرب کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ اس کام میں اس کی بیوی ملکہ ثریا نے بھی زبردست مدد کی۔ اس نے کچھ تعلیم یورپ میں حاصل کی تھی۔ وہ عورتوں کو پردے سے باہر نکالنے کی خواہشمند تھی۔ یوں ایک انتہائی پسماندہ ملک کو تیز رفتار زمانے میں بدلنے کا حیرت انگیز عمل شروع ہوا۔ (۱۵۱)

درحقیقت امان اللہ نے یورپ کے اہم شہروں روم، پیرس، لندن، برلن، ماسکو، وغیرہ کا سفر اختیار کی تھا۔ ملکہ ثریا چوں کہ شریک سفر تھی اس لیے امیر امان اللہ کے خلاف انگریزوں نے پر پیگنڈا کیا۔ اور افغانستان کے ملاؤں کو پیچھے لگا دیا۔ ملکہ ثریا کے طرزِ معاشرت پر بہت زیادہ اعتراض ہوئے۔ امیرِ افغانستان امان اللہ اور ملکہ ثریا کی اس صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:

> غازی امان اللہ خان اس سفر میں اپنی بیوی ملکہ ثریا خانم کو بھی ساتھ لے گئے۔ ملکہ ثریا ایک تعلیم یافتہ افغان خاتون تھی۔ اس نے بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے روانہ ہوتے وقت ہی برقعہ اتار دیا اور اس آزادی کے ساتھ سفر کیا جو فرنگستان کی عورتوں کا عام بن چکا تھا۔ برطانوی جاسوسوں نے افغان قوم میں ملکہ کی اس حرکت کے خلاف بڑے زور سے پروپیگنڈہ کیا۔ (۱۵۲)

ایک طرف انگریزوں نے ملکہ ثریا کی طرزِ معاشرت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ دوسری طرف جب دیکھا کہ بچہ سقہ اب زیادہ طاقتور ہو رہا ہے تو اس کی مالی اور اسلحہ بارود کی مدد بھی کی۔ چوں کہ امان اللہ کے خلاف سید حسین اور بچہ سقہ ایک ساتھ مل کر بغاوت کر رہے تھے۔ اس لیے بچہ سقہ سے: ''سید حسین نے امیر بننے سے انکار کرتے ہوئے کہا اے بچہ سقہ امیر بننے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اب بچہ سقہ نے مطمئن ہو کر اپنی امارت کی بیعت لی۔ اس طرح اب امان اللہ خان کے مقابلے میں اس کا لڑنا ایک صحیح کام تصور کیا جانے لگا۔'' (۱۵۳) بچہ سقہ کا واقعہ تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بچہ سقہ نے اتنی آسانی سے افغانستان کی حکومت بحال کر لی تھی کہ کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ خود انگریز بھی حیرت میں تھے کہ افغانستان کے اندرونی حالات اس قدر کمزور تھے۔ مگر تاریخی واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ افغانستان پر قبضہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مگر وہاں پر قیام کرنا مشکل ہے۔ قبضہ برقرار رکھنا مشکل عمل ہے۔ حاصلِ بحث یہ ہے کہ بچہ سقہ افغانستان کا مقامی باشندہ تھا اُس نے بغاوت کے ذریعے افغانستان کی حکومت حاصل کی جس کی وضاحت جواہر لعل نہرو نے اس طرح کی ہے کہ: '' ۱۹۲۸ء کے اختتام تک ہر طرف بغاوت کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک معمولی پانی ڈھونے والا (ماشکی)۔ بچہ سقہ بغاوت کا سرخیل بن کر سامنے آ گیا۔ اس کی قیادت میں چلنے والی بغاوت ۱۹۲۹ء میں کامیابی سے ہم کنار ہوگئی۔ ملکہ امان اللہ اور ملکہ ثریا فرار ہو گئے۔ اور بچہ سقہ افغانستان کا امیر بن گیا۔'' (۱۵۴) بچہ سقہ کی حکومت کے حصول کے بارے میں حمید اللہ کا کہنا یہ ہے کہ: ''بچہ سقہ عنایت اللہ خان کے جانے کے اگلے روز شاہی محل میں کرّ و فر سے داخل ہوا۔ کابل کے جن لوگوں نے تین دن عنایت اللہ خان کی بادشاہی کی بیعت کی تھی۔ آج انھوں نے بچہ سقہ کی بیعت کر لی۔ بادشاہ بننے کے بعد بچہ سقہ نے خادم دین رسول کا لب اختیار کیا۔'' (۱۵۵)

بچہ سقہ کی بغاوت کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ خواجہ حسن نظامی اور سید سلیمان ندوی نے یکے بعد دیگرے افغانستان کے سفر کیے۔ لیکن ان سے پہلے بچہ سقہ کی حکومت اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ بچہ سقہ افغانستان کی تاریخ کا ایک

معما تھا جس کے کا کسی نہ کسی طرح ذکر تاریخ میں ملتا رہے گا۔ بچہ سقہ کے متعلق غیر ملکیوں کی رائے حاصل کرتے ہوئے خواجہ محمود نظامی لکھتے ہیں کہ:

> نہ امان اللہ کے عہد میں کوئی ظلم تھا، نہ بچہ سقہ نے کچھ ظلم کیا نہ سب کچھ ظلم ہے۔ بچہ سقہ کے دور میں مسلمانوں کو جان و مال کا بہت نقصان ہوا۔ مگر ہندو اور سکھ اور یورپین سب محفوظ رہے۔ ان کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ کہتے تھے یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ اور بادرشاہ تو ایک اولیا اور بادشاہ ہے۔ اس کے عہد میں تو ہندو مسلمان دونوں ہی بہشت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔(۱۵۶)

بچہ سقہ کی موت کا حال بھی خواجہ حسن نظامی ایک سید مومن نامی شخص کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ:

> سید مومن صاحب نے بچہ سقہ کی موت کے حالات سُنائے وہ اس کے قتل کے وقت موجود تھا۔ کہتے ہیں بارہ آدمیوں کو ایک وقت میں گولیوں سے مارا گیا۔ مرنے سے پہلے ان کا خون خشک ہو گیا۔ اور چہرے سفید ہو گئے تھے۔......رعایا بچہ سقہ کے ظلم سے اس قدر ناراض تھی کہ اس کی لاش کے جوتیاں ماریں اور ایک عورت نے اس کا گوشت کاٹ کباب بنائے اور سب کے سامنے کھائے۔(۱۵۷)

افغانستان کی قوم جس کی دوست بنتی ہے تو دل سے دوستی کا حق ادا کرتی ہے اور جس سے دشمنی کرتی ہے تو ظلم کی آخری انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی جب افغانستان کے سفر پر گئے تو اُس وقت افغانستان میں نادر خان کی حکومت تھی۔ سید سلمان ندوی اور سر اقبال وغیرہ کو بھی افغانستان کے سفر پر نادر خان نے ہی دعوت دی تھی۔ خواجہ محمود نظامی نے نادر خان کا بڑے منفرد انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''افغان تو ابھی ایشیا کی ان قوموں میں ہیں جو صدیوں سے دوری ہیں۔ ان کو تو اب بیدار ہو جانا چاہیے۔ اگر نادر شاہ افغان قوم کو صبح جلد بیدار ہونے کا عادی بنا دیں گے۔ تو وہ ایشیا میں بہت بڑا کام کریں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا جو دنیا اور دین میں ترقی بلندی چاہتا ہے۔ اس کو رات کے وقت جاگنا چاہیے۔''(۱۵۸) نادر خان نے خود کو نادر شاہ کا خطاب رکھا تھا۔ اگر چہ یہ افغانستان کا ایک بہادر جنرل تھا۔ اس نے ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کو جنگ میں بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے علاوہ افغانستان کی عوام میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سر اقبال، سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی جب افغانستان سے کوئٹہ کے رستے واپس آ رہے تھے تو ان کو خبر ملی کہ: ''شاہ افغان نادر شاہ نے شہادت پائی۔''(۱۵۹) حقیقت میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس طرح: ''۱۹۳۳ء کو جلسہ تقسیمِ انعامات میں ایک طالب علم عبدالخالق بامی نے پستول سے فائر کر کے نادر شاہ کو شہید کر دیا۔ جس کے باپ کو غالباً نادر شاہ نے قتل کر دیا تھا۔''(۱۶۰) نادر شاہ کے قتل کی مذکورہ بالا وجہ ممکن ہے درست ہو لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انگریزوں کا دوست تھا اور وہ اُسے بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے جس کی وجہ سے: نومبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ قتل ہو گیا۔ اس کی جگہ افغانستان کا سربراہ ان کا نوجوان بیٹا ظاہر شاہ بنا۔''(۱۶۱)

اس طرح افغانستان کی تاریخ کا ایک اور باب بند ہو گیا۔ افغانستان کے حالات بیرون میں رہنے والوں کے لیے بہت ہی پیچیدہ تھے۔ خود علامہ محمد اقبال نے بھی نادر شاہ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن افغانستان کی بے یقینی کی صورتِ حال نہ صرف خود افغانستان بلکہ دوسرے برطانوی ہند کے لیے بھی خطرے کا باعث تھی۔ افغانستان کی سیاسی اور سماجی حالات برطانوی ہند پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

ایشیا کے مغرب میں فلسطین ایشیا کا آخری ملک ہے۔ اسے سرزمینِ انبیا ہونے کے ساتھ ساتھ وادیٔ سینا کی ہمسائیگی کا شرف بھی حاصل ہے۔ مغرب میں بحرہ روم اور جنوب مغرب میں وسیع و عریض افریقی اور شمال مغرب میں ترقی یافتہ یورپی ممالک ہیں۔ جنوب میں سرزمینِ سعودی عرب، یمن، عمان اور متحدہ ریاست ہائے عرب واقع ہیں۔ شمال میں اردن، لبنان، ترکی، شام اور وسط ایشیائی ریاستیں واقع ہیں۔ جواہر لا نہر نے لکھا ہے کہ: ''شام سے منسلک فلسطین کی ریاست ہے جس پر قبضہ کے لیے برطانوی حکومت کو لیگ آف نیشنز کا مینڈیٹ حاصل ہے۔ فلسطین بہت ہی چھوٹا سا ملک ہے جس کی آبادی دس لاکھ سے بھی کم ہے۔ لیکن قدیم تاریخ اور مذہبی وابستگیوں کی وجہ سے اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔'' (۱۶۲) فلسطین ایک مذہبی مناسبت رکھنے والا چھوٹا سے مگر دنیا کی توجہ کا مرکز ملک ہے۔ یہاں کے یہودی اسے اپنے انبیا کی مقدس زمین تصور کرتے ہیں۔ اور مسلمان اسے قبلہ اوّل ہونے کی بنا پر اپنے لیے مقدس تصور کرتے ہیں۔ ایک طرف یہودی دعوے دار ہیں اور دوسری طرف مسلمان حقیقت پر مبنی اپنے حق پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہودیوں کی صورتِ حال رام کہانی کی طرح ہے۔ جیسے ہندوؤں نے جودھیا میں رام جنم بھومی کا بہانہ بنا کر مسلمان حکمرانوں کی بنائی گئی بابری مسجد کو شہید کر دیا۔ اسی طرح یہودیوں نے فلسطین یا یرشلم کو انبیا کی سرزمین ہونے کی وجہ سے اپنا حق سمجھا۔ پھر اُوپر سے دنیا کے عیسائیوں نے اپنا پیچھا چھڑانے اور یہویوں کی سازشوں سے بچنے کے لیے انھیں فلسطین میں آباد کرنے کا منصونہ بنایا۔ اس طرح پوری دنیا سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کیا۔ مرتضٰی انجم لکھتے ہیں کہ: ''یورپ اور امریکہ کے سرمایہ دار یہودیوں نے بڑے بڑے فنڈ قائم کئے۔ جس سے فلسطین جا کر آباد ہو جانے والے غریب یہودیوں کو کرایہ اور زمین خریدنے کے لیے رقمیں دی جاتی تھیں۔ یہودیوں کی خاموش لیکن منظم ہجرت کا سلسلہ ۱۸۸۲ میں شروع ہوا۔'' (۱۶۳) پوری دنیا کی دولت پر قابض قوم یہودیوں کے بارے میں جواہر لال نہرو کا نقطۂ نظر ہے کہ: ''لفظ ''یہوی'' ایک گالی بنا دیا گیا۔ اس کا مطلب کنجوس اور دولت سینت سینت کر رکھنے والا بن گیا۔ اس کے باوجود یہ حیرت انگیز لوگ اپنی بقا میں کامیاب رہے بلکہ اپنی نسل اور ثقافتی خصوصیات بچا کر رکھنے میں کامیاب رہے۔ وہ آسودہ و خوش حال رہے۔'' (۱۶۵) امریکا اور برطانیا نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کا منصوبہ صرف اس لیے بنایا کہ یہ ممالک یہودیوں کی دولت سے فائدہ اُٹھانے چاہتے تھے۔ مرتضٰی انجم لکھتے ہیں کہ: ''۱۸۹۷ء میں بھل کے مقام پر علمی صیہونی کانگریس میں منظم ہجرت کے منصوبے کو حتمی شکل دی گئی۔ اور

ساتھ ہی ساتھ برطانیا اور امریکا میں با اثر یہودی سرمایہ داروں نے وہاں کی حکومتوں پر بھی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور یہ دونوں حکومتیں یہودی سرمایہ داروں کی دولت پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔" (۱۶۵) اسی وجہ سے برطانیا نے پہلی جنگِ عظیم میں فلسطین پر قبضہ کر کے اس میں یہودیوں کو آباد کرنے کا اعلان کر دیا: "جنگ عظیم کے دوران برطانوی افواج نے فلسطین پر حملہ کر دیا۔ جب وہ یروشلم کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں تو نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی حکومت نے مشہور اعلان بالفور کیا۔ اس اعلان کا مقصد بین الاقوامی برادری کی حمایت حاصل کرنا تھا۔" (۱۶۶) یہودیوں سے مالی امداد حاصل کرنے اور انھیں فلسطین میں آباد کرنے کے حوالے سے مرتضیٰ انجم لکھاتے ہیں کہ:

> ۱۹۱۷ء میں برطانوی حکومت نے پہلی جنگ عظیم سے ذرا قبل اعلان کیا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ اعلان تاریخ میں "اعلان فی الفوز" کے نام سے مشہور ہے۔ برطانیا کے اس اعلان کو اس کے اتحادیوں کی حمایت حاصل تھی۔ برطانیا کو دنیا بھر کے یہودیوں نے یقین دلایا کہ وہ یہویوں کے وطن کے قیام میں مدد دے گا تو ساری دنیا کے یہودی برطانوی حکومت اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دیں گے۔ (۱۶۷)

فلسطین میں یہویوں کی آبادکاری کے لیے برطانیا کے اعلان کے مطابق عرب میں بہت سے مسائل پیدا ہوئے عربوں نے یہودیوں کے خلاف غم وغصے کا اظہار کیا۔ تاہم برطانیا کے منصوبے کے ردعمل میں: "اگست ۱۹۱۹ء میں وسیع پیانے پر عرب۔ یہودی بلوے ہوئے۔ اصل سبب عربوں کی تلخی اور یہودیوں کی تعداد میں اضافہ اور آزادی کے لیے عربوں کے مطالبہ کی یہودیوں کی طرف سے مخالفت تھی۔" (۱۶۸) فلسطین اور عربوں کے تحفظ کے لیے اہلِ عرب میں اتحاد پیدا ہو گیا۔ انھوں نے باقاعدہ فلسطین کی آزادی کے لیے نوآبادیاتی نظام حکومت کو رد کر دیا۔ جواہر لال نہرو اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ: "۱۹۲۸ء میں مختلف گروہ ایک بار پھر عرب کانگریس میں متحد ہو گئے اور ایک جمہوری پارلیمانی طرزِ حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ انھوں نے بڑی بے باقی سے یہ اعلان کیا کہ فلسطین کے عوام کبھی نوآبادتی نظام کو قبول نہیں کریں گے۔" (۱۶۹)

فلسطین میں یہودیوں کی آبادی کاری کے تاریخی پس منظر میں بہت سی جنگیں اور واقعات پوشیدہ ہیں۔ مگر دوسری جنگِ عظیم کے دوران کرنل محمد خان کا فلسطین سے گزر ہوا۔ انھوں نے فلسطین کی صورتِ حال یوں بیان کی کہ: "۱۹۴۲ء میں اسرائیل ابھی وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن یہودی فلسطین پر قابض ہو رہے تھے۔ اور حیفہ تو ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی گود میں گرنے کو تھا۔ اکثر یہودی یورپ سے ترک وطن کر کے یہاں آئے تھے۔" (۱۷۰) یہودی، فلسطین پر چھا رہے تھے۔ آغاز میں تو انھوں نے فلسطینیوں سے زمیں خریدیں مگر جب انھیں پاؤں رکھنے کی جگہ مل گئی، تو انھوں نے زبردستی قبضے کرنے شروع کر دیے۔ اس طرح یہویودی فلسطینی علاقے میں آباد ہو گئے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں یہودی آبادی کے متعلق جو بات کرنل محمد خان کے مشاہدے میں آئی وہ اس طرح ہے کہ: "فلسطین کی اُٹھان کشمیر یا سوات سے مشابہ ہے۔

انگریز اسے دیکھتے ہی ہوم یاد کرنے لگے۔ اور ہمیں صحرائے عراق کی ریت اور لاوے کی درشتی کے بعد فلسطین کا سبزہ محسوس ہوتا تھا کہ زیر پا چوں پر نیاں آمد ہے! چھوٹی چھوٹی یہودی بستیوں سے گزرتے تو معلوم ہوتا ٹیکنی کلر میں خواب دیکھ رہے ہیں۔"(۱۷۱) اگرچہ اس وقت یہودیوں کی بستیاں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن مستقبل کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ آئندہ یہ یہودیوں کی معصوم بستیاں فلسطینیوں کے لیے سنگین نتائج لے کر آئیں، جس منصوبے کا پہلی جنگِ عظیم میں آغاز کیا گیا تھا اور دوسری جنگِ عظیم میں اسے حتمی شکل دینے کے لیے برطانیا نے یہودیوں کی مدد کی اور اہل فلسطین کو زبردستی نکالنے لگے: "۱۹۴۵ء میں یہودیوں نے ہتھیاروں کی مدد سے عربوں کو نکالنا شروع کیا۔ جب کہ ساٹھ برس سے زیادہ عرصے سے اس کی تیاری کی جا رہی تھی۔"(۱۷۲) یہویوں کی آبادی فلسطین میں آئے روز بڑھتی گئی۔ اسرائیل کی سرحدیں وسیع ہوتی گئیں۔ یہودیوں کی طاقت اور ظلم وستم کے خلاف عربوں نے آواز اُٹھائی تو دنیا برطانیا اور امریکا کی حمایت یہودیوں کو حاصل ہوئی۔ عربوں نے فلسطین کا ساتھ دیا مصر ان سب میں پیش پیش تھا۔ مگر فلسطین کے ساتھ ساتھ مصر کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مصر کی حکومت کی طرف سے: "فلسطین کی جنگ کے لیے فوج کو ایسے ناکارہ ہتھیار تقسیم کیے گئے تھے۔ جنھیں بعض مقتدر افراد نے (جن میں بادشاہ کا نام بھی لیا جاتا تھا) اطالیہ سے سستے داموں خرید کر کئی کروڑ روپے منافع حاصل کیا تھا۔ مالی طور پر ملک بدحالی کے گڑھے میں گر چکا تھا۔"(۱۷۳)

عرب اسرائیل جنگ میں جب یہودیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ پیش قدمی کر چکنے کے بعد اسرائیل کے حمایتوں نے اسرائیل اور عربوں کے درمیان میں صلح کرانے کی پیش رفت کی۔ یہ معاملہ سویڈن کے صدر کے قتل کے بعد اسرائیل کی مرضی کے مطابق طے ہوا۔ جسے غلام رسول مہر نے یوں بیان کیا ہے کہ:

> نومبر ۱۹۴۷ء میں انجمن میں فلسطین کی تقسیم کا خاکہ منظور کیا، جو عربوں کے خلاف تصریح بے انصافی پر مبنی تھا اور مسلمانانِ عالم کے علاوہ حق شناسوں کا کوئی بھی گروہ اسے صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ اس پر عربوں اور یہویوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی، انجمن نے سویڈن کی ہلالِ احمر کے صدر کاونٹ فوک برنادوت (Follke Bernadootte) دہشت پسند یہودیوں کے ہاتھ مارا گیا۔(۱۷۴)

فلسطین کی تقسیم کے بارے میں مرتضیٰ انجم یوں لکھتے ہیں کہ: "۲۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقسیمِ فلسطین کی تجویز منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ بیت المقدس سے اعلان کیا جاتا کہ ابھی راستہ کھلا ہوا ہے۔ عربوں کو چاہیے کہ وہ نکل جائیں ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔"(۱۷۵) مختصر یہ ہے عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودیوں کے حوصلے پہلے سے زیادہ بلند ہوئے۔ جہاں یہودیوں کی سرمایہ کاری بڑھی وہاں ان کے حمایتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ عرب اور اسرائیل جنگ سے پہلے: "فلسطین میں رہنے والے یہودیوں کی تعداد ۳۴ ہزار تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء تک بڑھ کر یہ تعداد ۶ لاکھ آٹھ ہزار ہو گئی۔"(۱۷۶)

فلسطین میں یہودیوں کے آباد ہونے پر صرف فلسطین ہی مغلوب نہیں ہوا بلکہ پورا عرب ہی اسرائیلی غلبے میں آ گیا۔ ایشیا اور افریقہ کے عرب ممالک میں اتنی جرأت نہیں رہی کہ اسرائیل کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکیں۔ اہل عرب یورپ کی دولت اور شخصیات سے اس حد تک متاثر ہو جاتے تھے کہ یورپ کا ایک جاسوس ہی پورے پورے ملک اپنی سوچ پھیلا کر عربوں کو اپنے ساتھ ملا لیتا تھا۔ عام لوگوں نے صرف کرنل لارنس کی کہانیاں سنی رکھی ہیں۔ جس نے سعودی عرب میں اپنی حکومت یا خلافتِ عثمانیہ کے خلاف لڑنے کے لیے قائل کر لیا۔ یہ جنگِ عظیم اوّل کی بات ہے کہ کرنل لارنس نے سعودی عرب میں انقلاب برپا کر دیا۔ اسی طرح کی صورتِ حال عرب کے دوسرے ممالک کی تھی جس کے بارے میں شفیق الرحمان نے بڑے طنزیہ انداز میں تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو لڑے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ ترکوں کے خلاف لڑے جب انگریز جنرل ایلن بی Allenby دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو خوش فہم باشندوں نے آل بنی کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔'' (۱۷۷) اس طرح پہلی جنگ عظیم کے دوران عراق میں موجود ایک برطانوی جاسوس کے بارے میں بھی شفیق الرحمٰن نے اسی طرح کے انداز میں لکھا ہے کہ: ''۱۹۱۹ء میں برطانیوی ایجنٹ Gertrude Bell نے بغداد سے اپنے رشتہ داروں کو خط میں لکھا'' آپ حیران ہوں گے کہ میں بغداد میں اتنی مقبول ہوں کہ سب مجھے اُم امومنین کہتے ہیں، یہاں میرا قیام بے حد ضروری ہے ...... فی الحال میں انگلستان نہیں آسکتی۔'' (۱۷۸) عرب میں انگریزی مخبروں کے علاوہ انھیں مقامی عرب ایجنٹوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ جنرل ایلن بی، کرنل لارنس اور دوسرے ایجنٹوں نے ترکی کو شکست دینا ممکن بنایا۔ محمد عبدالقیوم قادری آلِ سعود کی کامیابی کی وجوہات بیان کرتے ہیں کہ:

> اگست ۱۹۱۷ء میں فیصل اس کی فوجوں اور لارنس کو ونگیٹ کی کمانڈ سے نکال کر جنرل ایلن بی کی کمان میں دے دیا گیا۔ اس تبدیلی نے فیصل اور لارنس کو حجاز کی آزادی کے محدود ملٹری آپریشن سے عالمی سیاست اور عالمی جنگ کے وسیع اور پیچیدہ میدان میں لا کھڑا کیا۔ ایلن بی کی ماتحتی میں لارنس کے لیے فضا بڑی ساز گار تھی جس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے مقابلے میں خصوصی مراعات اور لامحدود اختیارات کے ساتھ دو لاکھ پونڈ سونے کی شکل میں اسے دیئے گئے۔ اس سونے نے عرب بغاوت کی کامیابی میں کیا کردار ادا کیا یہ امر اب کوئی راز نہیں رہا۔ (۱۷۹)

امریکا اور برطانیا پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں مالی مدد حاصل کرنے کے لیے یہویوں کے محتاج ہوئے۔ ورنہ دنیا کے عیسائیوں کو یہ معلوم تھا کہ یہودی ان کے پیغمبر عیسیٰؑ کے (نعوذ باللہ) قاتل تھے۔ تاہم یہودیوں کی دولت سے متاثر عیسائی رہنماؤں نے یہودیوں کی آغوش میں نجات تلاش کی۔ اس طرح عیسائی بھی یہودیوں کے مغلوب ہو گئے۔ یہودی صرف مسلمانوں کے لیے ہی خطرے کا باعث نہیں ہیں بلکہ عیسائیوں اور دوسری قوموں کے بھی دشمن ہیں۔ عیسائیوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب ان کے پیغمبر دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو عیسائی یہودیت نوازی کا کیا جواز تلاش کریں گے۔

یوں تو مصر یوں کہ افریقہ کا ایک وسیع عریض ملک ہے۔ مصر برِ اعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم پر موجود ہے۔ ایشیا کی طرف اس کا خطہ زمین وادیٔ سینا کہلاتا ہے۔ افریقہ کی طرف والا خطہ وادیٔ نیل۔ وادیٔ نیل اور وادی سینا کے درمیان نہرِ سویز تعمیر کی گئی ہے۔ اس نہر کی تعمیر کی وجہ سے نہ صرف ایشیا کا فاصلہ اہل یورپ کے لیے سمٹ گیا ہے۔ بلکہ یورپ بھی ایشیا سے قریب تر ہو گیا ہے۔ اگر چہ مصر قدیم تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ ایشیا کے لیے مصر کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی افریقہ کے لیے ہے۔ مصر کے بہت سے ایسے سفرنامے جن میں تاریخی عناصر پائے جاتے ہیں۔ لیکن تحقیق کام کا دائرہ کار صرف ایشیائی خطے تک محدود ہے۔ اس لیے مصر کے سفرنامے کو زیرِ مطالعہ اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ سلطنتِ عثمانیہ کا صوبہ رہا ہے۔ اس وجہ سے ایشیا کی سیاسی وسماجی اور تاریخ اس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔

ج: ایشیائی ممالک میں معاشی صورت حال نو آبادیات کے زیرِ اثر: تاریخی عناصر کا تقابلی مطالعہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے لیے انگریز جہانگر کے دور میں برِ صغیر آئے۔ جب انگریز یہاں پہنچے تو اکبر: ''بادشاہ نے جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ (مطابق اکتوبر ۱۶۰۵ء) میں عالم آخرت کی راہ لی۔'' (۱۸۰) اکبر کی وفات کے کوئی دس سال بعد طامس رو برِ صغیر آیا اور تین سال قیام کرنے کے بعد جہانگیر شہنشاہ سے تجارت کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یاد رہے کہ ہندوستان کی معاشی صورت حال انگریزوں کے آنے کے بعد ان کی لوٹ مار کی وجہ سے خراب ہوئی تھی۔ اکبر کے دور میں جب سلیم شہزادہ تھا اور آسام یا بنگال کی مہم پر تھا۔ تو اکبر سے ملاقات کے لیے آتا ہے تو اپنے باپ اکبر کو سیکڑوں کی تعداد میں سونے کی اینٹی پیش کرتا ہے جن کا ذکر اُس نے تزک جہانگیری میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'': جہانگیر نے شہنشاہ کی خدمت میں پیش ہو کر سو سو تو کی دو سو مہریں، پچاس پچاس تولے کی چار مہریں، پچیس تولے کی ایک اور بیس تولے کی ایک، تین پانچ پانچ تولے کی مہریں،'' (۱۸۱) اور دیگری کئی چیزیں پیش کیں۔ خود بادشاہ کے خزانے میں کتنی دولت ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا اتنا مشکل نہیں ہے۔ کیوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوٹ مار کے بعد اور حکومتِ برطانیا قائم ہونے سے پہلے برِ صغیر میں کئی بار قحط سالی آئی۔ اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ چوں کہ ایک تو انگریز ہندوستان اور دوسرے جنوبی مشرقی ممالک سے خام مال برطانیا لے جاتے تھے۔ وہاں سے مال تیار کرا کر ایشیائی ممالک کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ ہندوستان میں افیون اور نیل کی کاشت زبردستی کرائی جاتی تھی۔ نیل کپڑے کی صنعت میں استعمال ہوتا تھا اور افیون کی بڑی منڈی چین تھا۔ سورت اور کلکتہ کی تجارتی کوٹھیاں افیون سے بھری رہتی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی زبردستی کسانوں سے افیون اور نیل کاشت کراتے تھے۔ یہاں تک کہ کسان اپنی ضرورت سے زیادہ اناج پیدا نہ کرنے کے پابند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اناج ملک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہو جاتے اور دوسرے یہ کہ

گندم یا اناج درآمد بھی نہ کیے جاتے تھے۔اس طرح کسانوں کی حالت بہت خراب سے خراب ہوتی گئی۔ بڑے کاشت کار بھی اس سے متاثر ہوئے۔مگر معاشی دباؤ میں ہمیشہ مزدور طبقہ پس جاتا تھا۔جاگیردار اپنے گزارے کے لیے گندم کی کاشت کرلیا کرتے تھے۔جس سے ان کا گزارا راہ چلتا رہتا تھا۔انیسویں صدی میں جب:''مشرقی بنگال کے شعبہ رفاہ عامہ کی مدکا تمام بجٹ کلکتہ اور مغربی بنگال کے دوسرے علاقوں پر خرچ ہورہا تھا۔اس سے زیادہ پریشانی آڑیسہ کے لوگوں کو تھی کیوں کہ اڑیسہ بنگال، آسام اور متوسط ممالک میں تقسیم تھا۔''(۱۸۲)اڑیسہ کے کسان ہمیشہ پسماندہ رہے۔گاندھی نے ایک بار اور جواہرلال نہرو نے دوبار اڑیسہ کے کسانوں کی حالتِ زار کا جائزہ لیا۔ہندوستان میں خاص طور پر بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی حالت بہتر تھی۔جب تقسیم بنگال ہوئی تو مسلمانوں نے اس اقدام کا بڑے پُر جوش انداز میں خیر مقدم کیا۔ لیکن یہ فیصلہ ہندوؤں کو بہت بُرا معلوم ہوا۔تقسیم بنگال کے فیصلے سے مسلمانوں کو فائدہ ہورہا تھا جس کی وجہ سے:''ہندوؤں کی جتنی تحریکیں تھیں۔مثلاً ''برہموسماج''''آریہ سماج''''تھیوسوفیکل سوسائٹی''''شدھی''اور''سنگھٹن'' کی تحریکیں ہندو لیڈروں نے ان سب کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیر دیا اور وہ تمام تقسم تنسیخ بنگال کی کوششوں میں مصروف ہوگئی ۔''(۱۸۳)جنگِ آزادی کے بعد سے تو ہندوستان کے عوام، خاص طور پر مسلمانوں کی معاشی حالت ابتر ہوگئی تھی۔سرکاری نوکریوں میں ہندوؤں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ بنگال کے علاوہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے پیچھے تھے اس لیے انھیں سرکاری نوکریوں میں پیچھے رکھا جاتا تھا۔یا کم درجے کی سطح کی اسامیوں پر تعینات کیا جاتا تھا۔خام مال کی ابھی تک وہی صورتِ حال چلی آرہی تھی کہ خام مال برطانیا کے کارخانوں میں جاتا تھا وہاں سے مصنوعات تیار ہوکر مہنگے دام ہندوستانیوں کے آگے فروخت کی جاتی تھیں۔

ایشیا میں جہاں تک عرب ممالک کی معاشی صورتِ حال کا تعلق ہے تو ان کی معیشت زیادہ اچھی نہیں تھی۔عرب ممالک اور کچھ افریقی ممالک ترکی کے صوبہ جات کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کی دولت کی ایک کثیر مقدار ترکی کو ٹیکسوں اور دفاعی اخراجات کے طور پر دی جاتی تھی۔ جب انگریزوں نے نہر سویز پر سرمایہ کاری کی تھی اُس وقت نہر کے موصولات بھی ان کے حصے میں آگئے تھے۔اور ترکی برائے نام حاکم رہا۔یاد رہے کہ:''نہر سویز فرانس اور برطانیا کے تعاون سے ۱۸۵٦ء میں تعمیر کی گئی تھی۔''(۱۸۴)مصر کی داخلی معاملات میں انگریزں کی مرضی چلتی تھی۔جب انگریز، ہندوستان کی طرف بڑھے تو سب سے پہلے انگریزوں نے نہرِ سویز پر قبضہ کیا۔نہر سویز آمدورفت کے لیے جاری ہوچکی تھی۔جہاں تک نہرِ سویز کھلنے کا معاملہ ہے تو:''نہر سویز کا افتتاح ۱۸٦۹ء میں ہوا تھا۔''(۱۸۵)انگریزوں کی نہر پر اجارہ داری قائم ہونے سے پہلے اس کے تمام ترٹھیکے اور منصوبے فرانسیسوں کے پاس تھے۔محمد علی والیٔ مصر نے نہر سویز کے حصص انگریزوں کے آگے چالیس ہزار پونڈ میں فروخت کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی کو دعوت دی۔دوسری طرف عرب ممالک میں ابھی تیل کی دولت دریافت

نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی تلاش میں کام جاری تھا۔عرب کی آمدنی فقط حجاز میں حاجیوں کے نذرانوں کی بدولت اوران کے خریداری کرنے سے چلتی تھی۔ جان برکھاٹ اپنے سفر نامہ حجاز میں لکھتا ہے کہ:''امیروں اور مالداروں کے چھوڑ کر باقی مکے والوں نے تمام مکان کرایہ داروں کے ٹھہرانے کے لیے بنائے ہیں۔اوراس وجہ سے ہر مکان میں الگ الگ بہت سے حجرے بنائے اور ہرایک کے متعلق ایک چھوٹا سا باورچی خانہ رہتا ہے،آج کل وہابیوں کی فتح کے قبل سے حج کو تنزل ہونے لگا ہے اوراس وجہ سے بہت مکی اپنے مکانوں کا کرایہ پر نہیں دے سکتے،مکان خالی پڑے رہتے ہیں۔''(۱۸۶) جہاں تک حجاز کے عام لوگوں اور تاجروں کی حالت کا ذکر ہے تو عام لوگ کوڑیوں کو محتاج تھے اور تاجر دولت کو دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عرب میں موجود ایک ہندوستانی تاجر جو مکہ کے کسی ٹیلے میں رہتا تھا اُس کا ذکر جان برکاٹ ذکر کرتے ہیں کہ:

> مدعٰی کے پاس کی گلیوں میں ہندوستان لکھ پتی سوداگر رہتے ہیں اور چوں کہ ان کو اس قدر غرور ہے کہ سر بازار دکان کھولنا یا رکھنا ان کے لیے باعث کسر شان ہے اس لیے وہ مکان پر ہی مال رکھتے ہیں اور بیوپاری وہیں سے خود جاتے ہیں۔ایک ہندوستانی سورت کا رہنے والا جس کا نام شمسی ہے اسی محلے میں رہتا ہے۔ اور حجاز بھر میں سب سے زائد مالدار سمجھا جاتا ہے۔مگر اس کا روبار جیلانی اور دوسرے سوداگروں سے کم ہے اگر چہ یہ شخص کئی لاکھ پونڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔مگر مجھ سے بذاتِ خود ایک شال کے سودے میں جس کی قیمت دس روپے سے زیادہ نہ تھی کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک جھائیں جھائیں کرتا رہا۔
> (۱۸۷)

ترکوں کو شام اور عراق سے بذاتِ خود ترکوں کو کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔الٹا ان ممالک کی حفاظت پر ترکوں کا سرمایہ خرچ ہو رہا تھا۔لبنان،فلسطین،یمن،مسقط،دبئی،بحرین،قطر،کویت اور عراق،وغیرہ کی مالی حالت ابتر تھی۔ یہاں پر بھی انگریزوں نے اپنی لوٹ سے ملکوں کا دیوالیہ نکال دیا تھا۔

چین اگر چہ بہت بڑا ملک تھا لیکن بندر بانٹ کا شکار تھا۔امریکا،جاپان،فرانس،انگلینڈ ایک طرف اور روس ایک طرف اس پر پل رہا تھا۔زراعت کی ساری آمدنی اوراناج قریبی ممالک لے اُڑتے تھے۔امریکا،فرانس اور برطانیا خام مال کی تجارت کرتا یا پھر منڈیوں پر قابض تھا۔فلپائن کے جزیروں پر پہلے سپین قابض تھا بعد میں امریکا نے اسے خرید لیا۔ فلپائین جنوب مغربی ایشیا میں ایسا ملک تھا جہاں کوئی تجارتی منڈی نہیں بنی تھا۔سپین اورامریکا دونوں ہی فلپائن میں ترقیاتی کام کرواتے رہے۔انڈونیشیا، ملائیشیا،جاوا،سماٹر،آسام وغیرہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گودام بنے ہوئے تھے۔کوریا پر جاپان کی اجارہ داری تھی۔لیکن وہاں بھی آزادی کی تحریکیں بیدار ہو چکی تھی۔چین میں قومی اور تہذیبی شعور اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ بیرونی طاقتیں چین پر قبضہ کرنے کے باوجود بھی شروع دن سے مشکلات کا شکار رہیں۔بیرونی قبضے کی وجہ سے اہل چین اگر چہ مالی مشکلات کا شکار رہے لیکن انھوں نے ہر وہ چیز جو اپنے ملک میں دستیاب تھی اُسے خوراک بنایا۔اس طرح

ایشیائی ممالک میں جو معاشی دباؤ نچلے طبقے، کسان اور مزدور پر رہا اُس نے آزادی کی تحریکوں کو جنم دیا۔ یوں چھوٹی تحریکیں کہیں نہ کہیں بڑی تحریکوں میں ضم ہوتی رہی اور سیاسی تحریکیں پروان چڑھتی رہیں۔

د: ایشیائی ممالک کی آزادی تحریک: منتخب ایشیائی سفرناموں کے تناظر میں مجموعی جائزہ

جنگ عظیم اوّل میں دنیا کی صورت حال یک لخت تبدیل ہوگئی تھی۔ بظاہر تو برطانیا کو اس جنگ میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ لیکن امریکی صدر سر ولسن نے چودہ نکات پیش کر کے برطانیا کو یہ پیغام دے دیا تھا کہ اب زیادہ دیر تک نوآبادیاتی نظام قائم نہیں رہے گا۔ دنیا کے ممالک کو مرحلہ وار آزاد کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں اس مقصد کے تحت ہندوستان میں کرپس مشن آیا تھا۔ یہ مشن سر اسٹیفر ڈ کرپس کی کارکردگی میں ہندوستان آیا تھا۔ اُنھوں نے ہندوستان کے رہنماؤں کو اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ جنگ میں فتح حاصل ہونے کی صورت میں ہندوستان کو ان کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ جب کرپس مشن ہندوستان آیا تو اس کی رپورٹ بی بی سی ریڈیو پر نشر کی گئی۔ اس میں مرکزی نکتہ یہ تھا کہ: ''اب ہندوستان کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کرپس نے بھی پہلی ملاقات میں اسی انداز میں گفتگو کی تھی۔'' (۱۸۸)

اگرچہ ہندوستان کا آزاد ہونا پوری دنیا کے سامنے ایک بہت بڑا کا نامہ ہے۔ لیکن پاکستان اور ہندستان کی آزادی سے پہلے افغانستان آزاد ہوا۔ ۱۹۱۹ء کی افغانستان اور برطانوی ہند کی جنگ کے بعد صلح نامے کی شرائط کی رو سے افغانستان کو آزاد اور خود مختار ملک تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن برطانوی ہند اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کے معاملے میں انگریزوں نے افغانستان کی شرط منظور نہ کی اسے سابقہ حد بندی پر قائم رہنے دیا گیا۔ افغانستان کی آزادی کے حوالے سے حمید اللہ لکھتے ہیں کہ: ''۱۹۱۹ء کے انگریز اور حبیب اللہ خان کے اس معاہدے کو شامل نہ کرنے کی بہت کوشش کی جس کی رو جس حد بندی کو مان لیا گیا تھا۔ مگر اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی اور وہی حد بندی باقی رہی اس معاہدے کی رو سے برطانیا نے افغانستان کو خود مختار ملک تسلیم کر لیا۔'' (۱۸۹) افغانستان کے آزاد ہونے کے پس منظر میں بہت سی سیاسی باتیں پوشیدہ تھیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ: ''جب افغانستان کا پہلا جشنِ آزادی منعقد ہوا تو ایک مشہور انگریز جنگی افسر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ''سلطنت برطانیا کی مہربانی ہے کہ افغانستان کو آزاد کر دیا'' اور یہ بھی کہا کہ ''یہ افغانستان کی کامیابی نہیں بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی کی فتح ہے۔'' (۱۹۰) افغانستان کے بعد دوسرا ملک ترکی ہے۔ جنگِ عظیم اوّل میں ناکامی کے بعد برطانیا، فرانس اور اٹلی، ترکی کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں جنگ کے بعد تین سال کی بحث کے بعد ترکی کو اس

شرط پر آزادی ملی کہ ایک تو خلافت عثمانیہ کو ترک کریں دیں دوسرے یورپ کے کسی دوسرے ملک کا قانون ترکی میں نافذ کریں۔ترکی کے مستقبل کے لیے:''۲۴نومبر۱۹۲۳ءکو دستخط ہوئے،اس طرح سلطنت عثمانیہ کے فاتح کے بعد ترکوں نے اپنی آزاد اور خودمختار حکومت قائم کرلی اور ترکی کو جمہوریہ بنانے کا اعلان ہوا۔''(۱۹۱) آزادی حاصل کرنے کے بعد ترکی نے سویزرلینڈ کا قانون ترکی میں رائج کیا جس کی اہل یورپ نے بڑی تائید کی۔مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ:''تم یورپین سلطنت کا کوئی قانون لے کر اپنی حکومت چلاؤ۔ترکی نے قبول کیا اور سویزرلینڈ کا قانون جاری کرنے کا وعدہ کیا۔یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے اشارہ کیا تھا۔''(۱۹۲)

ترکی کی آزاد کے بعد بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دو ملک اور آزاد ہوئے ایک پاکستان اور دوسری ہندوستان۔۱۴راگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان آزاد ہوا اور ۱۵راگست ۱۹۴۷ء میں بھارت آزاد ہوا۔بھارت نے اپنی آزادی کی تاریخ ۱۵راگست کیوں رکھی اس کا منطق سمجھ میں نہیں آیا۔پاکستان نے تو انگریزوں سے آزادی حاصل کی تھی۔مگر بھارت نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ اور مسلمانوں سے بھی آزادی حاصل کی تھی۔کیوں کہ مسلم لیگ نے کانگریس کے لیے حالات بڑے مشکل بنادیے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم، ولیم ایل لنگر، مولف، مولانا غلام رسول مہر، مترجم، جلد سوم، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۷۲۳

۲۔ Vincent A. Smith,The Oxford History of India From the Earliest Times to The End of 1911, Oxford Clarendon, 1919, page773

۳۔ عبدالرحمٰن امرتسری، ساحتِ ہند، نولکشور؟ لکھنؤ؟ ۱۹۰۷ء، ص ۱۶

۴۔ Vincent A. Smith,The Oxford History of India From the Earliest Times to The End of 1911, pg.774

۵۔ As obive pg774

۶۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات، یوپبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰

۷۔ حارث بشیر، آر ایس ایس، کوسمس بکس، نیو دہلی، بھارت، اشاعتِ سوم ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۸۔ انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم، ولیم ایل لنگر، مولف، مولانا غلام رسول مہر، مترجم، جلد سوم، ص ۷۳۴

۹۔ عبدالرحمٰن امرتسری، سیاحتِ ہند، ص ۳۳۷۔۳۳۸

۱۰۔ جواہر لال نہرو، میری کہانی، ترجمہ تخلیقات، لاہور، ص ۴۱

۱۱۔ ایس ایم سیروائی، تقسیمِ ہند، حقیقت اور افسانہ، ص ۳۲

۱۲۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات، یوپبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹

۱۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ہندو آزاد ہو گیا، نعیم اللہ ملک، مترجم، نشریات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵

۱۴۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخِ مسلمانان پاک و بھارت، جلد دوم، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۵۲۲

۱۵۔ عبدالرحمٰن امرتسری، سیاحتِ ہند، ص ۳۳۸

۱۶۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات، ص ۱۹۔۲۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ہندو آزاد ہو گیا، ص ۱۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۵

۲۲۔ عبدالرحمٰن امرتسری، سیاحتِ ہند، ص ۳۳۶

۲۳۔ مولانا محمد الحسن، سفرنامہ اسیر مالٹا، مکی دارالکتب، لاہور، ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۰

۲۴۔ انسائیکلوپیڈیا تاریخِ عالم، غلام رسول مہر، مولانا، مترجم، ص ۶۴۵۔۶۴۶

۲۵۔ جواہر لال نہرو، تاریخ عالم پر ایک نظر، جلد دوم، ص ۶۱۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۶۵

۲۷۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص ۲۱۔۲۲

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۹۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات، ص ۲۳۔۳۳

۳۰۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، اشاعت سوم ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۹

۳۱۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۴۹

۳۲ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، اشاعت سوم ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۹

۳۳۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص ۴۲

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۵۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد دوم، ص ۵۳۹

۳۶۔ موہن داس کرم چند گاندھی، آپ بیتی گاندھی جی، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۳۷۔ غلام رسول مہر، سفرنامہ حجاز، مرتب، عبدالحمید کھوکھر لائبریری، گجرانوالہ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۳

۳۸۔ جواہر لال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر، جلد سوم، ص ۱۳۷

۳۹۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص ۴۲

۴۰۔ جواہر لال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر، جلد سوم، ص ۲۳۹

۴۱۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص ۶۵

۴۲۔ ایضاً،ص۴۱

۴۳۔ ایضاً،ص۴۱

۴۴۔ ایضاً،ص۴۲

۴۵۔ جواہرلال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلدسوم،ص۱۳۸

۴۶۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل،ص۶۵

۴۷۔ جواہرلال نہرو،تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۱۴۱

۴۸۔ ایضاً،ص۱۴۰

۴۹۔ ایضاً،ص۱۳۶

۵۰۔ ایضاً،ص۱۴۴

۵۱۔ غلام رسول مہر، سفرنامہ حجاز،مرتب،عبدالحمید کھوکھر لائبریری،ص۱۳۶

۵۲۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل،ص۶۰

۵۳۔ ایضاً،ص۶۰

۵۴۔ جواہرلال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۶۵

۵۵۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل،ص۶۰

۵۶۔ جواہرلال نہرو،تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۶۶

۵۷۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل،ص۶۳

۵۸۔ ایضاً،ص۶۳

۵۹۔ سید ہاشمی فریدآبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان وبھارت،جلددوم،ص۵۴۱

۶۰۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل،ص۶۳

۶۱۔ جواہرلال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۶۶

۶۲۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل،ص۶۳

۶۳۔ ایضاً،ص۸۳

۶۴۔ ایضاً،ص۸۹

۶۵۔ ایضاً،ص۸۹

۶۶۔ ایضاً،ص ۸۷

۶۷۔ ایضاً،ص ۸۷

۶۸۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص ۳۴

۶۹۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبید اللہ سندھی کی سر گزشتِ کابل،ص ۸۸

۷۰۔ ایضاً،ص ۶۰

۷۱۔ ایضاً،ص ۶۴

۷۲۔ پنڈت جواہر لال نہرو،تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلد سوئم،ص ۶۶

۷۳۔ سید ہاشمی فرید آبادی،تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت،جلد دوم،ص ۵۵۱

۷۴۔ جواہر لال نہرو، تاریخِ عالم پر ایک نظر،جلد سوئم،ص ۲۳۹

۷۵۔ ایضاً،ص ۲۷۱

۷۶۔ ایضاً،ص ۸۳

۷۷۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبیداللہ سندھی کی سر گزشتِ کابل،ص ۹۰۔۹۱

۷۸۔ ایضاً،ص ۸۲

۷۹۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص ۳۵

۸۰۔ مولانا عبداللہ لغاری،مولانا عبید اللہ سندھی کی سر گزشتِ کابل،ص ۱۱۸

۸۱۔ ایضاً،ص ۶۰

۸۲۔ ایضاً،ص ۸۲

۸۳۔ ایضاً،ص ۸۹

۸۴۔ جواہر لال نہرو، میری کہانی، تخلیقات،ص ۸۳

۸۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان آزاد ہو گیا،ص ۶۴

۸۶۔ کرنل محمد خان، بجنگ آمد، غالب پبلشرز، لاہور،۱۹۹۲ء۔ص ۲۲۲۔۲۲۳

۸۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان آزاد ہو گیا،ص ۱۴۵

۸۸۔ ایضاً،ص ۱۶۱

۸۹۔ ایضاً،ص ۱۹۶

۹۰۔ کرنل محمد خان، بجنگ آمد،ص۲۲۳

۹۱۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات ،ص۱۵۱

۹۲۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۳۲

۹۳۔ ہاشمی فرید آبادی، تاریخِ ہند،ص۵۳۹۔۵۴۰

۹۴۔ مولانا حسین احمد مدنی، اسیرانِ مالٹا، سید محمد میاں، مرتب، جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء،ص۵۴

۹۵۔ مولانا محمود الحسن، سفرنامہ اسیر مالٹا، مکی دارالکتب، لاہور، ۱۹۹۴ء۔ص۲۲

۹۶۔ ایضاً،ص۲۴

۹۷۔ مولانا حسین احمد مدنی، اسیرانِ مالٹا،ص۵۵

۹۸۔ ایضاً،ص۵۵

۹۹۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۳۳

۱۰۰۔ ایضاً،ص۳۳

۱۰۱۔ مولانا حسین احمد مدنی، اسیرانِ مالٹا، سید محمد میاں، مرتب،ص۵۳

۱۰۲۔ ایضاً،ص۶۵

۱۰۳۔ ایضاً،ص۶۶

۱۰۴۔ ایضاً،ص۶۶۔۶۷

۱۰۵۔ مولانا محمود الحسن، سفرنامہ اسیر مالٹا،ص۴۷

۱۰۶۔ عشرت علی صدیقی، ممالکِ اسلامیہ کی سیاست، مکتبہ جامعہ، دہلی، لاہور، ۱۹۴۰ء،ص۸۳

۱۰۷۔ مولانا محمود الحسن، سفرنامہ اسیر مالٹا،ص۴۸

۱۰۸۔ ایضاً،ص۵۰

۱۰۹۔ ایضاً،ص۵۱

۱۱۰۔ ایضاً،ص۵۲

۱۱۱۔ ایضاً،ص۶۲۔۶۳

۱۱۲۔ ایضاً،ص۶۸

۱۱۳۔ مولانا وحید الدین خان، سفرنامہ: غیر ملکی اسفار، پبلیشرز اسلامک سنٹر، ۱۹۹۲ء،ص۲۰۹

۱۱۴۔ مفتی محمد عبدالقیوم، تاریخ نجد و حجاز، رضا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۸ھ، ص۲۱۱۔۲۱۲

۱۱۵۔ ایضاً، ص۲۱۱

۱۱۶۔ S.M.Imamddin, A Modren History of The Middle East and NorthAfriqa,Pg.192

۱۱۷۔ مفتی محمد عبدالقیوم، تاریخ نجد و حجاز، ص۲۱۱

۱۱۸۔ S.M.Imamddin, A Modren History of The Middle East and North Afriqa pg.192

۱۱۹۔ مفتی محمد عبدالقیوم، تاریخ نجد و حجاز، رضا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۸ھ، ص۲۱۳

۱۲۰۔ ایضاً، ص۲۱۳

۱۲۱۔ ایضاً، ص۲۱۳

۱۲۲۔ ایضاً، ص۲۱۳

۱۲۳۔ ایضاً، ص۲۱۳

۱۲۴۔ S.M.Imamddin, A Modren History of The Middle East and North Afriqa pg194

۱۲۵۔ مفتی محمد عبدالقیوم، تاریخ نجد و حجاز، ص۲۱۳)

۱۲۶۔ S.M.Imamddin, A Modren History of The Middle East and NorthAfriqa,pg.194

۱۲۷۔ مفتی محمد عبدالقیوم، تاریخ نجد و حجاز، ص۲۱۴

۱۲۸۔ غلام رسول مہر، سفرنامہ حجاز، ص۲۳۔۲۴

۱۲۹۔ S.M.Imamddin, A Modren History of The Middle East and North Afriqa, pg.194

۱۳۰۔ غلام رسول مہر، سفرنامہ حجاز، ص۶

۱۳۱۔ ایضاً، ص۵

۱۳۲۔ ایضاً، ص۷۶

۱۳۳۔ ایضاً، ص۱۰۶۔۱۰۷

۱۳۴۔ جان لوئیس برکھاٹ، سفرنامہ حجاز، مرتب، مولوی شبیر حسین، ص۸۳

۱۳۵۔ ایضاً، ص۷۲

۱۳۶۔ غلام رسول مہر، سفرنامہ حجاز، ص۱۰۸

۱۳۷۔ ایضاً، ص۱۳۵

۱۳۸۔ ایضاً،ص۱۳۶

۱۳۹۔ Maung Htin Aung, A History of Burma, Columbia University Press New York, and London, 1867,Pg782

۱۴۰۔ اے حمید، ''رنگون سے فرار'' غالب پبلیشرز، لاہور:۱۹۹۶ء۔ص۱۰۲

۱۴۱۔ ایضاً،ص۸

۱۴۲۔ ایضاً،ص۱۱۱

۱۴۳۔ ایضاً،ص۱۲۲

۱۴۴۔ ایضاً،ص۱۶۹

۱۴۵۔ ایضاً،ص۱۱۲

۱۴۶۔ کرنل محمد خان، بجنگ آمد،ص۲۰۳

۱۴۷۔ ایضاً،ص۲۰۳

۱۴۸۔ ایضاً،ص۲۰۹

۱۴۹۔ پروفیسر صاحب زادہ حمید اللہ، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲۰۶

۱۵۰۔ ایضاً،ص۲۰۷

۱۵۱۔ جواہر لال نہرو، تاریخ عالم پر ایک نظر، جلد سوم،ص۲۳۹

۱۵۲۔ پروفیسر صاحب زادہ حمید اللہ، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲۰۷

۱۵۳۔ ایضاً،ص۲۱۴

۱۵۴۔ جواہر لال نہرو، تاریخ عالم پر ایک نظر، جلد سوم،ص۲۴۲

۱۵۵۔ پروفیسر صاحب زادہ حمید اللہ، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲۱۸

۱۵۶۔ خواجہ حسن نظامی، قدیم و جدید افغانستان کے دو سفر نامہ، خواجہ برقی پریس، دہلی،۱۹۳۳،ص۴۳

۱۵۷۔ ایضاً،ص۲۱

۱۵۸۔ ایضاً،ص۴۲

۱۵۹۔ سید سلمان ندوی، سیر افغانستان،ص۲۰۲

۱۶۰۔ پروفیسر صاحب زادہ حمید اللہ، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲۲۷

۱۶۱۔ جواہر لال نہرو، تاریخ عالم پر ایک نظر، جلد سوم،ص۲۴۲

۱۶۲۔ ایضاً،ص۲۰۹

۱۶۳۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۵۲۔۱۵۳

۱۶۴۔ جواہرلال نہرو،تاریخ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۲۱۱

۱۶۵۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۵۳

۱۶۶۔ جواہرلال نہرو، تاریخ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۲۱۱

۱۶۷۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۵۳

۱۶۸۔ جواہرلال نہرو،تاریخ عالم پر ایک نظر،جلدسوئم،ص۲۱۲

۱۶۹۔ ایضاً،ص۲۱۲

۱۷۰۔ کرنل محمد خان، بجنگ آمد،ص۱۰۴

۱۷۱۔ ایضاً،ص۱۰۳

۱۷۲۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۵۳

۱۷۳۔ محمود نظامی،نظر نامہ،گوشۂ ادب،لاہور،۱۹۶۳ء،ص۵۱

۱۷۴۔ انسائیکلوپیڈیاتاریخ علم،غلام رسول مہر،مرتب،ص۸۳۵

۱۷۵۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۵۴

۱۷۶۔ ایضاً،ص۱۵۳

۱۷۷۔ شفیق الرحمٰن،دجلہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء۔ص۲۴۸

۱۷۸۔ ایضاً،ص۲۴۸

۱۷۹۔ محمد عبدالقیوم قادری، تاریخِ نجد و حجاز،ص۳۴۱

۱۸۰۔ سید ہاشمی فرید آبادی،تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت،ص۴۹۴

۱۸۱۔ جہانگیر بادشاہ،تزکِ جہانگیری،احمد علی مولوی،مرتب،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۳۱

۱۸۲۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۹

۱۸۳۔ ایضاً۔ص۱۹

۱۸۴۔ https://www.bbc.com/urdu/world/2015/01/23(مورخہ،۱۶/۱اکتوبر،۲۰۲۱ء،بوقت۳۰:)

۱۸۵۔ https://www.bbc.com/urdu/world/2015/01/23(مورخہ،۱۶/۱اکتوبر،۲۰۲۱ء،بوقت۱:۳۰)

۱۸۶۔ جان برکھاٹ،سفرنامہ حجاز،مولوی محمد شبیر،مترجم،ص۷۰

۱۸۷۔ جان برکھاٹ، سفرنامہ حجاز، مولوی محمد شبیر، مترجم، ص ۸۷

۱۸۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان آزاد ہو گیا، ص ۶۴

۱۸۹۔ پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ خان، مختصر تاریخ افغانستان، ص ۲۰۴

۱۹۰۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص ۶۸

۱۹۱۔ انجم مرتضیٰ، بیسویں صدی کے اہم واقعات، ص ۶۹

۱۹۲۔ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص ۶۶

باب چہارم:

ایشیائی ممالک میں آزادی کے مراحل اور اردو سفرناموں میں تاریخی عناصر (۱۹۴۷ء-۲۰۱۵ء)

ایشیائی ممالک کی مرحلہ وار آزادی حاصل ہوئی ہے اس مرحلہ وار آزادی حاصل کرنے کرنے کے دن سے ہی کسی ملک کی جشنِ آزادی کا دن مقرر کیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی ملک کی آزادی کا دن اُس کی سالگرہ کے دن کی حیثیت رکھا ہے۔ کوئی ایسا ملک جو طویل یا مختصر عرصے تک کسی دوسرے ملک کے ماتحت رہا ہو، لیکن تحریکِ آزادی چلا کر یا جدوجہد کر کے مذکورہ ملک سے آزادی حاصل کر لے تو وہ دن اُس ملک کی آزادی کا دن کہلاتا ہے۔ کیوں کہ مذکورہ ملک اُس دن سے آزاد حیثیت سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہو جاتا ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں اکثر ممالک کسی نہ کسی طاقتور ملک کے ظلم وستم کے آگے غلام کی حیثیت سے زیرِ قبضہ رہے تھے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد آزاد ملک بن کر دنیا کے نقشے پر اُبھرے اور اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے یوم آزادی مناتے ہیں۔ یوں تو پوری دنیا کے ممالک چند آزاد قوموں کے آگے محکوم رہے ہیں۔ خود امریکہ بھی ایک وقت تھا کہ پہلے سپین اور بعد میں برطانیا کے آگے محکوم رہا۔ افریقہ کے تمام ممالک کسی یورپی ممالک کی غلامی میں رہے۔ بعض افریقی ممالک پر ترکی کا قبضہ رہا۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد ویانا کانفرنس میں صدر ولسن نے چودہ نکات پیش کر کے دنیا کے ممالک میں آزادی کے شعور کا بیدار کیا۔ چوں کہ خود امریکا ۴ر جولائی ۱۷۷۶ء میں برطانیا سے آزاد ہوا تھا۔ اس لیے آزادی کا شعور رکھتا تھا اور خود مختار سے اپنے ملک پر حکمرانی کرتا تھا۔ اب امریکا نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کر کے حکمرانی کی جائے۔ امریکا دنیا کے ممالک کو مقروض کرتے ہوئے، اپنے نظریات اور ثقافت پھیلا کر دوسرے ممالک پر دور بیٹھے ہوئے اجارہ داری قائم کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں جاپان، تھائی لینڈ اور بوٹان ایسے ممالک تھے جن پر برطانیہ یا کسی دوسرے ملک کا قبضہ نہیں تھا۔ یہ ممالک یا تو آزاد اور خود مختار تھے یا پھر مذکور ممالک طاقتور ملکوں کی پہنچ سے باہر رہے۔ برِاعظم ایشیا میں دوسرے مماک سے آزادی حاصل کرنے والے ممالک کی فہرست خاصی لمبی ہے۔ جیسا کہ جنوبی

ایشیا میں افغانستان ۱۹؍اگست ۱۹۱۹ء، پاکستان ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء، بھارت ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء، برما ۴؍جنوری ۱۹۴۸ء، سری لنکا ۴؍فروری ۱۹۴۸ء اور مالدیپ ۲۶؍جولائی ۱۹۶۵ء کو برطانیا سے آزاد ہوئے۔ جب کہ بنگلہ دیش ۲۶؍مارچ ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے آزاد ہوا۔..... **مغربی ایشیا** میں عراق ۳؍اکتوبر ۱۹۳۲ء، لبنان ۲۲؍نومبر ۱۹۴۳ء، کویت ۲۵؍فروری ۱۹۶۱ء، یمن ۳۰؍نومبر ۱۹۶۷ء، بحرین ۱۵؍اگست ۱۹۷۱ء اور متحدہ عرب امارات ۲؍دسمبر ۱۹۷۱ء میں برطانیا سے آزاد ہوئے۔ جب کہ اردن ۲۵؍مئی ۱۹۴۶ء میں سویت اتحاد سے ۱۹۹۱ء میں آزاد ہوا۔ اسرائیل کا ۱۵؍اپریل ۱۹۴۸ء میں فلسطین کی سرزمین پر برطانیا کی ایما پر قیام عمل میں آیا۔ **جنوب مشرقی ایشیا** میں آزادی کے سلسلے میں جنوبی کوریا ۱۵؍اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان سے آزاد ہوا تو انڈونیشیا ۱۷؍اگست ۱۹۴۵ء کو نیدرلینڈ، ویت نام ۲؍ستمبر ۱۹۴۵ء میں جاپان سے آزاد ہوا تو شمالی کوریا ۹؍ستمبر ۱۹۴۸ء کو جنوبی کوریا سے الگ کر دیا گیا۔ ملائیشیا یا مالی ۲۲؍ستمبر ۱۹۶۰ء کو فرانس سے آزاد ہوا جب کہ سنگاپور ۹؍اگست ۱۹۶۵ء کو ملائیشیا سے الگ ہوا۔ **وسطی ایشیا** میں تبت ۱۳؍فروری ۱۹۱۳ء میں چین؛ آذربائیجان ۲۸؍مئی ۱۹۱۸ء کو روس؛ کرغیزستان ۳۱؍اگست ۱۹۹۱ء کو سویت؛ ازبکستان یکم ستمبر ۱۹۹۱ء میں سویت؛ تاجکستان ۹؍ستمبر ۱۹۹۱ء سویت اور ترکمانستان ۲۷؍اکتوبر ۱۹۹۱ء میں سویت اتحاد سے آزاد ہوا۔ **مشرقی ایشیا** میں چین، ۱۹۴۹ء میں برطانیا، امریکا، جاپان، روس اور فرانس سے آزاد ہوا۔ جاپان ہمیشہ ایک خود مختار ملک تھا۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد نو آبادیاں وجود میں آئیں۔

ایشیا میں آزادی کے حصول کا سلسلہ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے اختتام سے شروع ہوا اور نصف دوم کے آغاز میں بھی جاری رہا۔ اس میں بہت سے ممالک کو خود مختاری کی بنیادوں پر آزاد کر دیا گیا اور بہت سے ممالک کے ساتھ ان کی غلامی کا تحریری (ہانگ کانگ) سودا طے کر کے انھیں محکوم رکھا گیا۔ جاپان جیسے ملک کو جنگِ عظیم دوم میں تباہ کر کے اُسے آزادی تو دی گئی۔ مگر اپنی فوج رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ کوریا کو امریکی سازش نے دولخت کر کے اپنے آپ کو تحفظ دینے کی کوشش کی ہے۔ جنگِ عظیم اوّل سے پہلے جتنے ممالک ترکی کے زیرِ نگین تھے وہ سب الگ کر لیے گئے۔ ان پر فرانس، برطانیا اور اٹلی نے قبضہ کر لیا تھا، دوسری جنگِ عظیم تک اگرچہ ترکی کے اتنا وہ وقت نہیں تھا، تاہم پھر بھی اسے جنگ کا فریق بننا پڑا، برصغیر میں سے پاکستان، بنگلہ دیش، انڈیا اور سری لنکا برآمد ہوئے۔ امریکا نے نیو ورلڈ آرڈر پالیسی سے پہلے پاکستان کو بھارت کی مدد سے دولخت کرایا اور پھر روس کی طاقت ختم کو پاش پاش کر کے اس سے درجن بھر ممالک الگ کرائے۔ نیو ورلڈ آرڈر میں نئی پالیسیاں وضع کی گئی جس میں عرب ممالک کے تیل پر قبضے کو سب سے مقدم رہا۔ اس کے علاوہ ایشیا اور عرب ممالک میں امریکی ثقافت کو رائج کرنے جیسے معاملات اہمیت کے حامل رہے۔ نیو ورلڈ آرڈر ایسی پالیسی تھی جو لارنس آف عربیہ سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اسی زمرے میں عراق، افغانستان پر حملہ کیا گیا اور ایران پر سخت ترین پابندیاں لگائی گئی۔ فلسطینیوں کا عرصۂ حیات اسی پالیسی کے تحت تنگ کیا گیا۔

الف: جنوبی ایشیائی ممالک کی مرحلہ وار آزادی واسباب وواقعات، تاریخی عناصر

ایشیائی اردو سفرنامے کی رو سے ایشیائی ممالک کی آزادی حاصل کرنے کے مرحل دیکھیں جائیں تو بیسویں صدی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی خطوں میں آزادی کی تحریکیں پروان چڑھیں۔ ایشیا میں جاپان، روس اور افغانستان کے علاوہ اور کوئی ملک ایسا نہیں تھا جو ایسٹ انڈیا کے تسلط اور نہ ہی انگریز حکومت کے محکوم رہا۔ چین اس قدر وسیع وعریض ملک تھا کہ اس پر پانچ سامراجی طاقتوں قبضے کے باوجود بھی کئی علاقے ایسے تھے جو ابھی تک خودمختار تھے۔ لیکن یہ علاقے بھی مکمل طور پر خودمختار نہیں تھے۔ افغانستان میں جب امیر امان اللہ خان کا جرنیل نادر شاہ خان قتل ہوا، جو کہ افغانستان کا باشاہ تھا۔ اس کے بعد اس کے نوجوان بیٹے ظاہر شاہ کو ۱۹۳۳ء میں بادشاہ بنایا گیا۔ ظاہر شاہ نے حکومت سنبھالی تو اُس وقت ملک کے حالات بالکل اچھے نہیں تھے تاہم محمد ظاہر شاہ نے ترقیاتی کاموں کو جاری رکھا۔ افغانستان میں تیل کی تلاش کے لیے روس اور ایران کو ٹھیکے دیے گئے۔ پشتو زبان وادب کی ترکی کے لیے پشتوں کو سکولوں میں قومی زبان کے طور پر رائج کیا۔ نیر یہ کہ محمد ظاہر شاہ نے افغانستان کی مرکزی شاہراہوں کی تعمیر وتوسیع جاری رکھی۔ لیکن افغانستان کی روایت کے مطابق جب ظاہر شاہ ملک سے باہر تھا اس کے بھائی نے حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر قبضہ کرلیا۔ سردار داؤد خان کے افغانستان کے حاکم بننے کے بارے میں حکیم محمد سعید نے لکھا ہے کہ: ”افغانستان میں انقلاب خونی کا آغاز اس وقت ہوا کہ جب سردار داؤد خان نے شاہ افغانستان ظاہر شاہ صاحب کو ملک سے نکال دیا اور خود حاکم بن گئے۔“(۱) محمد ظاہر شاہ کو ملک سے باہر دورے پر بھیجا گیا یا وہ خود یورپ کے دورے پر گیا۔ اس کے پیچھے جو بھی کہانی ہو مگر افغانستان کے اکابر کا یہ دستور رہا ہے کہ موقع ملتے ہی اگلی حکومت ختم کر کے نئی حکومت قائم کردی جائے جیسا کہ: ”جولائی ۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہ کے چچازاد بھائی اور بہنوئی سردار داؤد خان نے جو لیوانی سردار (دیوانہ سردار) کے نام سے معروف تھا اس وقت حکومت کا تختہ الٹ کر اس پر قبضہ کیا جب ظاہر شاہ یورپ کے دورے پر اٹلی کے صدر مقام روم میں موجود تھا۔“(۲) محمد ظاہر شاہ نے ایک طویل عرصہ تک ملک سے باہر جلاوطنی کی زندگی کاٹی۔ اس دوران افغانستان میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جنگِ عظیم کو تو ظاہر شاہ نے خود نبٹایا تھا مگر پہلے افغانستان پر روس نے حملہ کیا اور افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا چاہی۔ پھر اس کے بعد امریکا نے افغانستان پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا اپنی مرضی کی حکومت قائم کی۔ افغانستان جب امریکا نے ۲۰۰۳ طالبان کی حکومت ختم کر کے: ”کوئٹہ میں مقیم افغان مہاجر حامد کرزئی افغانستان کا صدر بنا تو وہ روم جا کر بڑے تپاک سے محمد ظاہر شاہ کو بیس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن واپس لایا۔“(۳)

سردار داؤد خان کے دور میں افغانستان کے پاکستان کے ساتھ تعلقات کچھ زیادہ نہیں رہے۔ سردار داؤد خان کا جھکاؤ روس کی طرف تھا اس لیے وہ روس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ لیکن روس کو سردار داؤد خان کی آزادروی پسند نہ آتی

تھی۔اسی وجہ سے کمیونسٹوں کی دو پارٹیوں خلق اور پرچم نے طاقت حاصل کی: ''خلق دھڑے کا سربراہ نور محمد ترہ کئی غلجی تھا، یہ پشتونوں کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ ''پرچم'' دھڑا غیر پشتونوں یعنی فارسی بولنے والے کمیونسٹوں پر مشتمل تھا۔جس کی سربراہی ببرک کارمل تاجک کے سپرد تھی۔داؤد خان نے ان دونوں پارٹیوں پر پابندی عائد کردی تھی۔''(۴) مذکور دونوں پارٹیاں روس کی حمایتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ روس مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔جب دیکھا کہ سردار دوٗد خان اپنی مرضی زیادہ کررہا ہے تو روس نے سردار داؤد خان کو راستے سے ہٹانے کے لیے افغانستان میں بغاوت کرادی تھی جس کی وجہ سے:

> ۲۷/اپریل ۱۹۷۸ء بروز جمعرات کابل میں دن کے ایک بجے فوجی کرنل ڈگروال عبدالقادر نے فوجی انقلاب برپا کیا اور قصرِ صدارت پر جنگی ہوائی جہازوں سے بمباری کی جمہوری حرس گارڈ کے دو ہزار میں سے تقریباً اٹھارہ سو آدمی مارے گئے۔صدر داؤد، ان کے تین بیٹوں، بیوی اور تین بہنوں سمیت کل ۲۹ افراد کو جمعہ کے روز ۲۸/اپریل کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔(۵)

سردار داؤد خان کے بعد روس افغانستان میں کمیونسٹ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔افغانستان میں روس نواز حکومت آنے سے ہمسایہ ممالک کے ساتھ افغانستان کے تعلقات مزید خراب ہوگئے۔تاہم حکیم محمد سعید کہتے ہیں کہ افغانستان میں کمیونسٹ حکومت آنے کی وجہ سے تین اہم ہمسایہ ممالک کا اتحاد ختم ہوگیا۔وہ لکھتے ہیں کہ: ''ترہ کئی صاحب۔ افغانستان کی وجہ سے اتحاد پارہ پارہ ہوگیا......اتحاد افغانستان، پاکستان و ایران پارہ پارہ ہوگیا۔''(۶) افغانستان میں ایک حکومت کے بعد دوسری حکومت جنگ و جدل یا بغاوت کے ذریعے قائم ہوتی تھی۔کمیونسٹ دھڑے (پارٹی) کے سربراہ: ''نور محمد ترہ کئی (غلجی) ساکن علاقہ قندھار کو صدر بنا دیا گیا ملک کا نام بدل کر جمہوریہ افغانستان رکھ دیا گیا۔۲۹ وزیروں کی کابینہ میں تین فوجی یعنی ڈگروال عبدالقادر، وطن گیر وغیرہ ایک عورت اور ایک مولوی شاہ محمد شامل تھے۔جنھیں بعد میں شہید کر دیا گیا۔''(۷) افغانستان میں نور محمد ترہ کئی کے صدر بننے کے بعد ملک میں انتشار پھیل چکا تھا۔روس کی مدد سے کمیونسٹ سوچ رکھنے والے لوگ ملک پر قابض ہو چکے تھے۔نور محمد ترہ کئی کو مکمل روس کی حمایت حاصل تھی۔نور محمد ترہ کئی غلجی قبیلے کی ایک شاخ تراہکئی سے تعلق رکھتا تھا۔افغانستان میں خانہ جنگی کی صورت حال پیدا ہونے والی تھی۔پاکستان میں کمیونسٹ سوچ یوں تو چین اور روس سے براہ راست پاکستان پہنچ چکی تھی۔۱۹۵۱ء کی راول پنڈی سازش جیسی مہم جوئی کے بعد کمیونسٹ سوچ سرد پڑ چکی تھی۔جس وقت افغانستان میں کمیونسٹ حکومت آئی تو اس وقت ایران میں امام خمینی کی سربراہی میں اسلامی انقلاب پروان چڑھ رہا تھا۔پاکستان کے حکمران جنرل ضیاء اگرچہ اسلامی سوچ کے پیشِ نظر اسلامی قانون نافذ کرنے کا نعرہ بلند کر چکے تھے مگر اسے کئی طرح کی رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ایران میں تو ایک ہی مسلک تھا۔مگر پاکستان مختلف مسالک کے پیروکاروں کو ایک ساتھ چلانے کی کوشش کررہا تھا۔افغانستان میں پائیدار امن اور جمہوری استحکام ہوتا تو افغانستان، پاکستان اور ایران کے اتحاد کی وجہ سے: ''آٹھ عظیم ریاستوں کا اتحاد وسطی ایشیا میں ایک ایسی طاقت بن سکتا ہے۔کہ جو طاغوت کی

قوتوں کو بخوبی شامل کر سکتا ہے۔"(۸)

وسط ایشیا کی ریاستیں روس کے زیرِ قبضہ تھیں شاید یہی وجہ ہے کہ افغانستان، پاکستان اور ایران ایشیا کے تینوں اہم ملک آپس میں متحد ہو جاتے تو وہ وسط ایشیا کی ریاستوں کو بھی اپنے ساتھ اتحاد میں شامل کر لیتے۔ جس بات کی مذکورہ بالا میں حکیم محمد سعید نے وضاحت کی ہے در حقیقت وہ اسلامی دنیا کے ممالک میں ایک بڑے اتحاد کے حامی تھے۔ لیکن افغانستان کے حالات ہمیشہ سے خراب رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلامی اتحاد کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔

جیسا کہ افغانستان پر قبضہ کے بعد روس کا اگلا منصوبہ مکران کے رستے پاکستان کے صوبہ بلوچستان پر قبضہ کر کے سمندر تک رسائی حاصل کرنا تھا، جب: "افغانستان میں روسی نظریے کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور افغانستان کے تیل اور گیس نیز لعل و جواہرات کی کانوں اور خزانوں تک ان کی رسائی ہو گئی تھی۔ ان کا سو سال سے افغانستان کو لینے کا خواب پورا ہو گیا۔ اب انھوں نے بحرہ عرب کے گرم ساحل تک پہنچنے کا خواب تیزی سے دیکھنا شروع مگر نور محمد ترہ کئی کی حکومت کو کوئی سال بھر کے قریب عرصہ گزرا ہو گا کہ ملک میں خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی: "حفیظ اللہ امین نے محض اپنی انانیت کے باعث جوابی انقلابی برپا کر کے ۱۹۷۹ء کے ستمبر میں ایک رات کو نور محمد ترہ کئی کو اس طرح ہلاک کر دیا اس کی لاش کہیں ٹھکانے لگائی جس طرح ترہ کئی نے سردار داؤد کے ساتھ سلوک کیا تھا۔ حفیظ اللہ کو سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ کہا گیا اس کے حکم سے نور محمد کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کیا گیا تھا۔"(۱۰) جب روس کا پسندیدہ مہرہ نور محمد ترہ کئی افغانستان میں قتل ہو گیا اور اس کی جگہ حفیظ اللہ تخت نشین ہوا تو روس کو بہت نا گوار گزرا۔ روس نے افغانستان پر قبضہ کرنے کے لیے روسی افواج اُتار دی۔ روسی صدر نکولائی برژنیف نے: "ایک لاکھ پندرہ ہزار سرخ فوجوں کو ہوائی جہازوں میں بھر بھر کر افغانستان بھیجا اور ہر پانچ منٹ بعد ایک ایک طیارہ کابل کے ہوائی اڈے پر اترنے لگا۔ سوویت فوجوں نے فوراً قصرِ صدارت کا محاصرہ کر کے حفیظ اللہ کو اسی طرح گولی ماردی جس طرح اس نے نور محمد ترہکئی کو راہ سے ہٹایا تھا۔"(۱۱) اس طرح روس نے باقاعدہ طور پر افغانستان میں مداخلت کا بیڑا اُٹھایا۔ بڑے پیانے پر فوج کے ذریعے دارالحکومت کابل اور پورے افغانستان پر: "روسی افواج نے ببرک کارمل کو جو پرچم دھڑے کا سربراہ اور نسلاً تاجک تھا اپنے ٹینکوں پر بٹھا کر قصر صدارت میں براجمان کر دیا۔"(۱۲) اس طرح افغانستان میں حفیظ اللہ کے قتل کے بعد ایک اور کمیونسٹ پرچمی دھڑے کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ روسی افواج کے خلاف افغانستان میں مجاہدین کی جماعتوں نے مزاحمت کرنا شروع کر دیا تا کہ روسی افواج کو افغانستان سے نکالا جا سکے۔ مجاہدین کی جن تنظیموں نے خاص طور پر روس کے خلاف اعلان جنگ کیا ان میں:

> انجینئر گلبدین حکمت یار کی "حزب اسلامی" مولوی محمد یونس خالص کی "جمعیت اسلامی" پروفیسر برہان الدین ربانی (تاجک دھڑا) کی جمعیت اسلامی" مولوی محمد نبی محمدی کی "حرکت اسلامی" پیر سید گیلانی کی "جبہہ ملی اسلامی" اور عبدالرسول سیاف کی "جبہہ اسلامی" روس کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔ پنجشیرہ میں

احمد مسعود کی ''شورائے نظارہ اور'' شیعہ ہزارہ [کی] ''حزب وحدت'' بھی اپنے اپنے طور پر روس کے خلاف مصروفِ پیکار تھیں۔ (۱۳)

روس کے خلاف بڑی تعداد میں مذہبی اور ملی تنظیموں نے جہاد کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف افغانستان کے اندر سے مجاہدین کو معاونت ملی بلکہ امریکا نے مجاہدین کی کھل کر مدد کی اور عرب ممالک کے مجاہدین باقاعدہ روس کے خلاف جہاد کرنے کے لیے میدان میں اترے۔ اس مرحلے پر پاکستان نے اپنی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے مجاہدین کی خفیہ مدد جاری رکھی جو بعد میں واضح ہوگئی تھی: ''پاکستان میں مجاہدین کے اہل وعیال کی خبر گیری اقوامِ متحدہ کی مدد سے پاکستان کر رہا تھا۔ اور اندرونِ افغانستان اور عرب مجاہدین اپنے قیمتی خون سے مزحمت وشجاعت کی نئی اور بے مثل تاریخ رقم کر رہے تھے۔'' (۱۴)

روس کے افغانستان پر حملے کے نتیجے میں لاکھوں لوگوں نے پاکستان، ایران، ترکی وغیرہ میں ہجرت کی۔ اس عرصے کے دوران افغان مہاجرین کی بڑی تعداد پاکستان آئی۔ صوبہ خیبر پختون خواہ میں تیس لاکھ اور بلوچستان میں دس لاکھ مہاجرین نے پناہ لی تھی۔ پاکستان پر یہ ایک بہت بڑا معاشی دباؤ تھا۔ اس کے علاوہ افغانستان کے مذہب اور ثقافت پر بھی ایک نئے انداز میں سپر طاقت نے یلغار بھی کی تھی۔ افغان جہاد ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ روس نے سات سال کی جنگ کے بعد: ''۱۹۸۶ء میں روسیوں نے ببرک احمد زئی کے قابل اور ذہین فرد ڈاکٹر نجیب اللہ کو افغانستان کا صدر بنایا۔'' (۱۵) لیکن افغانی مجاہدین نے جہاد کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس دوران: ''برژنیف کے جہنم رسید ہونے پر روس کا نیا صدر گورباچوف بنا۔'' (۱۶) روس کے افغانستان پر حملے کے بعد کئی سال تک جہاد کا سلسلہ جاری رہا۔ جب سے عرب جہادی گروہ افغانستان میں آئے تھے اُس وقت سے روس کو شکست کا سامنا کرنا پڑھ رہا تھا۔ یوں تو: ''افغانستان میں اٹھانوے فیصد مسلمان مگر صرف دو فیصد خلقی اور پرچمی تھے۔ علمائے کرام نے تین ماہ جہاد کے بعد پکتیکا صوبے کو سوائے خیبر کوٹ، ارگون شرنہ کو فتح کر لیا۔'' (۱۷)

اس طرح افغان جہاد کے آغاز سے روس کو شدید شکست سے دوچار کرنے تک بہت سے مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس دوران کئی بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے۔ راول پنڈی اوجڑی کیمپ کے واقعہ سے لے کر جنرل ضیاء کے طیارے کے حادثہ تک خود پاکستان بڑے بڑے مسائل میں مبتلا رہا۔ جب روس میں: ''برژنیف کے انتقال پر میخائیل گورباچوف روس کا صدر بنا اس نے افغانستان کو روس کے لیے ناسور قرار دے کر اس سے نجات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ۸/فروری ۱۹۸۸ء کو اعلان کیا کہ روس یک طرفہ طور پر افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلا لے گا۔'' (۱۸) روس نے اس اعلان کے بعد افغانستان سے فوجیں نکالنے کے وقت کا تعین کر لیا مگر پاکستان کا یہ ہمیشہ سے موقف رہا کہ افغانستان میں ان کے عوامی نمائندوں کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جنرل ضیاء کے حادثہ کے بعد جب پاکستان میں پیپلز پارٹی کی سربراہ بے

نظیر بھٹو کی حکومت قائم ہوئی تو کمیونسٹ ہونے کی بنا پر وہ روس اور بھارت کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔ لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت کوئی دو سال کے عرصہ بمشکل گزار سکی تھی کہ ختم کر دی گئی اور اس کے بعد: ''پاکستان مسلم لیگ کے میاں نواز شریف عام انتخابات میں کامیاب ہو کر ملک کے وزیر اعظم بن گئے تھے۔ انھوں نے کابل کا دورہ کر کے مجاہدین کو حکومت کے قیام پر مبارک باد اور مدد دی، ملک کے انتظام کے لیے چار کروڑ روپیہ کا عطیہ بھی کیا تھا۔'' (۱۹) پاکستان میں نواز شریف کے بعد بے نظیر کی حکومت آئی اور بے نظیر کے بعد نواز شریف کی۔ اس طرح خود پاکستان بھی سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا۔ لیکن ریاستی پالیسی ٹھوس بنیادوں پر افغانستان جہاد کے حق میں رہی۔ افغانستان سے روسی فوج کے انخلا کے بعد افغانستان میں کئی مختصر مدتی حکومتیں آئیں اور ختم ہو گئیں۔ نواز شریف کے تیسرے دورِ حکومت ۱۹۹۸ء کے دوران افغانستان میں طالبان کی جماعت وجود میں آئی۔ افغانستان ہمدرد گرہوں نے اسلامی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں نے:

> ایک گم تحریک کی ابتداء کی ''طالب'' پشتو میں مسجد یا اسلامی مدرسہ سے دینی علم حاصل کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع پشتو میں ''طالبان'' ہے یعنی اسلامی طلباء۔ ان لوگوں کی رہنمائی جید علماء نے کی اور طالبان کے لشکر نے ملک میں جاری ظلم و ستم کے تدارک کا ارادہ کیا۔ شروع میں ملا عمر برکاتہ کی رہنمائی میں بیس پچیس طالب علم منظم ہوئے۔ انھوں نے یکدم اٹھ کر ظلم و ستم کرنے والوں کا ہاتھ روکا۔ (۲۰)

طالبان کی ایک مختصر جماعت نے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے سب سے پہلے: ''قندھار کے علاقے میں خانہ جنگی کمانڈروں دیگر جنگجوؤں کی بنائی گئی پھاٹکوں اور لگائی گئی زنجیروں کو اکھاڑ کر علاقے میں آمد و رفت پر عائد رکاوٹوں کو دور کیا۔ اور ایک بدنام ڈاکو منصور کو پھانسی پر چڑھایا۔ یہ ۱۹۹۳ء کا واقعہ ہے۔'' (۲۱) کیوں کہ طالبان کی ابتدائی کاروائیاں قندھار میں شروع ہوئی تھیں اس لیے: ''قندھار ہی طالبان کا مرکز قرار پایا۔ چوں کہ طالبان ۹۰ فیصد پشتون تھے۔ اس لیے پشتو ہی نئی حکومت کی سرکاری زبان ٹھہری۔'' (۲۲) طالبان نے افغانستان میں مسلح کاروائیاں جاری رکھتے ہوئے: ''دو سال بعد ہی ۱۹۹۵ء میں دالحکومت کابل پر قبضہ کر لیا۔'' (۲۳) طالبان کی ایک طویل جدوجہد کے بعد جب کابل پر مکمل قبضہ ہو گیا تو باقاعدہ اسلامی قانون کا نفاذ کیا جس کا مقصد جرائم کا خاتمہ تھا طالبان نے: ''اہتمام نماز کے ساتھ ساتھ وصول زکوٰۃ کا نظام قائم کیا۔ بے شمار مساجد اور مدارس تعمیر کرائے۔ پاکستان سعودی عرب اور عرب امارات نے ان کی اسلامی حکومت کو تسلیم کیا مگر باقی دنیا نے طالبان کی صدفی صد اسلامی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔'' (۲۴) طالبان نے پورے افغانستان خاص طور پر شمالی علاقہ جات یا شمالی اتحاد پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی کاروائیاں جاری رکھیں۔ شمالی علاقوں میں طالبان کو بہت زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود سوائے وادی پنج شیر کے باقی پورے افغانستان پر طالبان کی قبضہ ہو گیا تھا۔ افغانستان میں طالبان حکومت کو تسلیم کرنے میں پاکستان بھی پیش پیش تھا۔ پاکستان کے صدر پرویز مشرف نے طالبان حکومت کو پہلے ہی مرحلے میں تسلیم کر لیا تھا۔ حکومت قائم ہونے کے بعد طالبان ہمسایہ ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات

استوار کرنے شروع کر دیے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ جو ایک بین الاقوامی سیمنار کے سلسلے میں نیپال گئے اس دور میں افغانستان سے طالبان کا ایک نمائندہ مسعود بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔ درحقیقت طالبان نے آتے ہی افغانستان کی قدیم ثقافت کو بموں، راکٹوں اور بارود سے برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح کا ایک واقعہ بامیان میں پیش آیا جہاں پر افغانستان کی قدیم ثقافت کے آثار موجود تھے۔ بامیان میں پہاڑ کو تراش کر بنائے گئے بڑے بڑے بتوں کو فنا کر چکے تھے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ بت شکن ہیں بت فروش نہیں۔ مستنصر حسین نے بامیان کے واقعہ کے پیشِ نظر طالبان پر طنزیہ انداز میں تاریخی حقیقت بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ہیں:

> مجھ پر بابر بھی رشک کرے گا..وہ بے شک فرغانہ سے اُترا تھا اور اب کابل میں آرام سے سوتا تھا اور اُس کے روضے کی جالیاں نوادرات کے طور پر پاکستان میں سمگل کی جا چکی تھیں اس لیے کہ طالبان اُسے اپنی سرزمین کا فرزند نہیں گردانتے تھے۔ یہ بابر کی خوش قسمتی ہے کہ طالبان زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں اگر ہوتے ''تزک بابری'' کا مطالعہ کر کے اُس کی ہڈیوں کو قبر میں سے نکال کر کابل سٹیڈیم میں دُرے لگاتے اور گردن کا منکا مل جاتا تو اُس کے گرد پھندا کس کے اُسے پھانسی پر لٹکاتے......کہ بابر نے تزک کے ہر دوسرے صفحے پر شراب اور معجون کا ذکر کیا ہے کہ جنگ کے بعد ہم نے دشمنوں کی کھوپڑیوں کا مینار تعمیر کروایا، رات کو جشن منایا اور پہلے معجون کھائی۔(۲۵)

بامیان میں طالبان کے ہاتھوں بت تباہ کرنے کے واقعہ کی وجہ سے دنیا کے ممالک نے طالبان پر کڑھی تنقید کی تھی اور سخت ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

> ۲۰۰۰ء کے نصف اوّل میں طالبان حکومت نے مہاراجہ اشوک یا کنشک کے بامیان کے پہاڑوں میں تراشے گئے دو عظیم اور دیوہیکل بتوں کو بارود کی بہت بڑی مقدار لگا کر اُڑا دیا۔ طالبانے اپنی مالی تنگ دستی کے باوجود جاپان کی طرف سے بتوں کو نہ اُڑانے کے بدلے کروڑوں روپے کی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا ان کے پاس اس عمل پر عیسائی اور بدھی ممالک آگ بگولا ہو گئے۔(۲۶)

دراصل افغانستان پر امریکا کے حملے کی وجوہات میں ایک وجہ بامیان میں بت شکنی بھی تھی۔ جہاں مستنصر حسین تارڑ نے طالبان دورِ حکومت کو تہذیب وثقافت کے آثار مٹانے کے سلسلے میں طنز کا نشانہ بنایا ہے وہاں پر بے جا دینی دباؤ اور نام نہاد دینی رواداری کی بھی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> مسعود ایک خوشگوار طبع کا ہمہ وقت مسکراتا ہوا سیاہ ریش نوجوان تھا جو کانفرنس میں طالبان کے افغانستان کی نمائندگی کر رہا تھا.....سنہری بابا کا کہنا ہے کہ طالبان ہر دو چار روز بعد اُس کی داڑھی مٹھی میں لے کر چیک کرتے ہیں کہ یہ مطلوبہ طالبانی معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں......کیوں کہ انہی دنوں کابل میں ایسے ایمان افروز مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے کہ اگر آپ داڑھی مٹھی میں لینے سے ان کے چند بال مٹھی سے

باہر نہیں جھانکتے تو آپ کو برسرِ عام سزا دی جاتی ہے۔(۲۷)

جن ایمان افروز واقعات کی طرف سفرنامہ نگار کا اشارہ ہے درحقیقت ایسے واقعات تو میڈیا پر دکھائے جاتے رہے لیکن باقاعدہ طور پر کسی تاریخی حیثیت کا حصہ نہ بن سکے۔ اس کے علاوہ دیگر ایسے واقعات جن کا براہ راست اسلامی قوانین سے تعلق ہوتا تھا، وہ ایک طرف طالبان کے عمل سے سرزد ہوئے تو دوسری طرف تاریخ کا حصہ بھی بنے۔ ان کا ذکر مختصر تاریخ افغانستان میں اس طرح کیا گیا ہے کہ:

> امریکا اسلامی حکومت کو برداشت کرنے کے لیے کسی طور پر تیار نہیں تھا۔ اقوامِ متحدہ کی آڑ میں طالبان حکومت پر طرح طرح کی پابندیاں لگوانا شروع کر دیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے خواتین کے حقوق کو غصب کرنے کا پروپیگنڈہ کیا اہل مغرب نے اسلامی تعزیرات کو عیاذاً باللہ ظالمانہ قرار دیا۔ قصاص قطع ید و قطع رجل نیز شادی شدہ زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے کی سزاؤں کو اچھالا۔ دوسری طرف شمالی اتحاد کے ازبک، تاجک اور ہزارہ دھڑوں نے بغاوت و مزاحمت کی روش جاری رکھی سوائے بدخشاں اور ایک دو اور تاجک صوبوں کے باقی تمام ملک میں طالبان کی اسلامی حکومت کی عملداری تھی۔ لوگ امن وسکون سے رہتے تھے۔ فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو بیخ بُن سے اُکھاڑ دیا گیا۔(۲۸)

تاہم طالبان اپنے پہلے دورِ حکومت میں خواتین کے کسی میدان میں کام کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ سوائے مدرسوں کے خواتین کسی اور شعبہ زندگی میں نظر نہیں آتی تھیں۔ مرد حضرات کو اسلامی دستور کے مطابق کام کرنے کی ہدایت کی گئی۔ معاشرتی بُرائیوں کے شبہ پر سزائے موت جیسی سزائیں دی جاتی تھی۔ افغانستان میں خود عوام کے ساتھ طالبان کا رویہ انتہائی سخت تھا۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ: ''اس کے باوجود مسعود ایک سلجھا ہوا پُر امن اور نفیس طبیعت کا نوجوان تھا اور خاص طور پر میری باتوں کا بُرا نہیں مانتا تھا کہ مجھے پہچانتا تھا اور کسی حد تک مجھ سے محبت کرتا تھا....''(۲۹) طالبان کے نمائندہ کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کو مستنصر حسین تارڑ نے بھرپور معنی سے بیان کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ نیپال میں طالبان کا نمائندہ موجود تھا مگر وہاں پر کسی قسم کا طالبانائزیشن کو خوف نہیں پہنچا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ: ''میں نے نیپال میں اب تک کوئی ایک کلاسنگوف نہ دیکھی تھی۔ کوئی ایک کاربین، ماؤزر یا آٹومیٹک رائفل نہیں دیکھی تھی، ہلاکت کا کوئی سامان نہ دیکھا تھا.... افغان جہاد کے ثمرات یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔''(۳۰)

طالبان حکومت جس طرح طاقت کے زور پر آئی تھی اسی طرح طاقت کے زور سے ختم کر دی گئی۔ طالبان کی انتظامی کاروائیوں کو دنیا میں ظلم اور زیادتی کے روپ میں پیش کیا گیا۔ جس کی بنا پر امریکا کو افغانستان میں طالبان حکومت پر حملہ کرنے کا موقع ملا کہ: ''۷ اراکتوبر ۲۰۰۱ء کو پُر امن اسلامی افغانستان پر بحرۂ عرب میں کھڑے اپنے بحری جہازوں سے بھاری بھرکم کروز مزائلوں اور اپنے دیوہیکل بی باون B-52 بمباری ہوائی جہازوں کے ذریعے قندھار، کابل، جلال آباد،

مزارشریف، غزنی، ہرات اور دیگر شہروں پر بلاتمیز لوہے اور آگ کی بارش شروع کر دی۔"(۳۱)

طالبان کی حکومت ختم کرنے کے لیے امریکا نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ جہازوں سے بڑے بڑے بم گرائے گئے۔ زمینی فوج نے طالبان کے خلاف کارروائیاں کی۔ امریکی بحریہ پاکستان کے ساحلوں کے قریب آ کر کروز مزائل داغتے۔ جہاں پر طالبان کا نقصان ہوتا وہاں پر امریکا کا بھی نقصان ہوتا۔ ایک اندازے کے مطابق، جہاں پچیس سے تیس ہزار سے زیادہ طالبان جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے، وہاں پر امریکا اور نیٹو کے بھی ہزاروں فوجی مارے گئے۔ آخر کار کابل، افغانستان سے طالبان کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کی جگہ امریکا کی طرف سے کابل میں: "حامد کرزئی کو ۲۲ر دسمبر ۲۰۰۱ء کو چھ ماہ کے لیے افغان عبوری حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ تاکہ وہ چھ ماہ میں "لویہ جرگہ" کے ذریعے آئندہ افغانستان کے مستقبل کے سربراہ کا فیصلہ کرے۔"(۳۲)

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ "لویہ جرگہ" ایسا عمل تھا جس کے بون معاہدے کے تحت کئی ایک مراحل تھے۔ سب سے پہلے لویہ جرگہ کمیشن کے ذریعے قوانین کا مسودہ تیار کرنا شامل تھا۔ پھر ۲۱ر افغانوں کا ایک گروپ جس نے یہ طے کرنا تھا کہ نمائندوں کا انتخاب کیسے کیا جائیگا اور اجلاس میں انھیں کیا کرنا ہے۔ اجلاس میں شرکت کرنے والوں میں دو تہائی کو دو مرحلوں میں بالواسطہ طور پر منتخب کیا جانا تھا۔ جب کہ تیسرے لویہ جرگہ کمیشن کی طرف سے مقرر کیا جانا تھا کہ بالواسطہ انتخابات مرحلہ وار ہوں گے۔ کمیونٹیز کے نمائندوے ایک مخصوص دن جمع ہوتے تھے تاکہ ووٹرز کا ایک گروپ منتخب کیا جا سکے۔ دوسرے مرحلے میں یہ ووٹر ۲۱ر مئی اور ۵ر جون کے درمیان علاقائی مرکز میں جمع ہوتے تھے۔ تاکہ ایمرجنسی لویہ جرگہ کے مندوبین کا انتخاب کیا جا سکے۔ یہ میٹنگ یا ملاقات کابل میں عبوری انتظامیہ کا انتخاب کرے گی جو کہ افغان عبوری اتھارتی (اے آئی اے) کو تبدیل کرے گی۔ مزید اٹھارہ ماہ کے اندر، ایک نیا آئین لکھنے کے لیے ایک آئینی لویہ جرگہ ہونا چاہیے، اور دو سال کے اندر اندر ایک نئی حکومت کے لیے انتخابات کا انعقاد ہونا چاہیے۔ اس امر کی وضاحت ریلیف ویب (reliefweb) میں اس طرح کی گئی ہے کہ:

> The Emergency Loya Jirga process, as laid out under the Bonn Agreement,1 has a number of phases. The first has involved the drafting of rules by the Loya Jirga Commission, a group of 21 Afghans who determined how representatives would be chosen and what they are to do at the meeting. Two-thirds of those attending the meeting are being indirectly elected in a two-stage process while the

> remaining third are to be appointed by the Loya Jirga Commission. In stage one of the indirect elections, representatives of communities gather on a given day to select a group of electors. In stage two, these electors gather in a regional centre between 21 May and 5 June to choose delegates to the Emergency Loya Jirga. That meeting, in Kabul, will then select the Transitional Administration that is to replace the Afghan Interim Authority (AIA). Within a further eighteen months, a Constitutional Loya Jirga must be held to write a new constitution, and within two years elections must be held for a new government.(۳۳)

لویہ جرگہ کے بعد عمل کے بعد افغانستان کا صدر بننے والا شخص حامد کرزئی تھا۔ حامد کرزئی روس کے افغانستان پر حملے کے دوران مہاجرین کی طرح ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا۔ وہ کوئی عرصہ بیس سال سے بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں مقیم تھا جس کے بارے میں مختصر تاریخ افغانستان میں بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ:

> پاکستان خفیہ فوجی تنظیم آئی ایس آئی۔ کے پروردہ دو افراد امریکی ڈالروں اور قبائلی تعلقات اور قبائلی رنجشوں اور تعصب کے بل بوتے پر قندھار کی امارت کے دعودار بنے۔ ایک پوپلزئی درانی قوم کا حامد کرزئی جو امریکا میں افغان کھانوں کے ریسٹورنٹوں کے ایک سلسلے کا مالک اور گزشتہ بیس سال سے کوئٹہ میں مقیم تھا۔ دوسرا گل آغا شیرزئی جو بارکزئی درانی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور وہ بھی کوئٹہ میں مقیم اور قندھار کا سابق گورنر رہا تھا۔ اس ان پڑھ پشتون کا والد قندھار میں سگبان یعنی کُتے لڑانے والا رہا تھا۔(۳۴)

افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم ہونے کے بعد امریکا نواز حامد کرزئی کی ۲۰۰۴ء کو حکومت بنی۔ ۲۰۰۵ء میں طالبان پھر منظّم ہونا شروع ہوئے۔ ۲۰۰۹ء میں امریکی صدر باراک اوباما نے صدر بننے کے بعد ۳۶ ہزار امریکی اور ۳۲ ہزار نیٹو فورسز افغانستان روانہ کرنے کے بعد مزید ۱۷ ہزار امریکی فوجی عوام کے تحفظ کے لیے افغانستان بھجوائے۔ اس دوران پہلی بار افغان طالبان سے مذکرات کی پیش کش کی گئی تھی۔ نومبر ۲۰۱۰ء میں مزید ۳۰ ہزار اضافی دستے ساز و سامان سے لیس افغانستان بھیجے گئے۔ ۲۰۰۹ء میں کرزئی دوسری مرتبہ صدر بنا تو اُس نے طالبان کو مذاکرات کی پیش کش کی۔ مگر انھوں نے

مسترد کر دی۔ امریکا نے ۲۰۱۴ء میں طالبان سے خفیہ طور پر مذاکرات کیے اور فوج کو ۲۰۱۴ء کے آخیر تک افغانستان سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ درحقیقت امریکا، افغانستان کو طالبان کے سپرد کرنا چاہتا تھا لیکن اس دوران افغانستان کے سابقہ صدر برہان الدین ربانی ایک خودکش حملے میں مارے گئے۔ تاہم ۲۰۱۴ء کے انتخابات میں حامد کرزئی کی حکومت کی جگہ اشرف غنی کی حکومت قائم ہوگئی۔ یاد رہے کہ اشرف غنی حامد کرزئی کا پرانا دوست تھا۔ اسی سال ڈونلڈ ٹرمپ امریکا کا صدر بنا تو اسے نے امریکی فوجی واپس بلانے کے سلسلے میں دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈونلڈ ٹرمپ دومرتبہ امریکا کا صدر منتخب ہوا۔ جب کہ ٹرمپ انتظامیہ کے پہلے دور میں ملا عمر کی موت واقع ہوگئی۔ جس کے بعد ملا اختر منصور طالبان کا نیا سربراہ بنا۔ ملا اختر امریکا کے ڈرون حملے کا نشانہ بنا تو اس کے بعد طالبان مجلسِ شوریٰ نے ہیبت اللہ اخونزادہ کو اپنا نیا سربراہ بنایا۔ اب تک افغانستان میں طالبان کی کاروائیاں جاری ہیں۔ طالبان کو کئی ایک محاذوں پر بھاری جانی اور مالی نقصان کا سامنا رہا ہے۔ مگر ان کے موقف میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آئے روز طاقتور ہوتے جارہے ہیں۔ اب جب کہ مقالہ ہٰذا آخری مراحل میں زیرِ تحریر ہے۔ اس اثنا ۶ ستمبر ۲۰۲۱ء میں افغانستان پر طالبان کا دوبارہ قبضہ ہو چکا ہے۔ امریکا اور نیٹو افغانستان سے اپنی فوجوں کا انخلا مکمل کر چکے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں کہ چند دنوں تک ان کی دوبارہ مسلمہ حکومت قائم ہو جائے گی۔

ب: دیگر ایشیائی ممالک پر آزادی کی تحریکوں کے اثرات ونتائج: اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر

ایشیائی اردو سفرنامے کے تاریخ تجزیہ میں روس کا ذکر ضروری ہے۔ روس ایشیا کے شمال میں ایک وسیع وعریض ملک ہے۔ یہ ملک کسی وقت روسی ریاستوں کے اتحاد کی وجہ سے بہت بڑا ملک تھا۔ روسی سے ریاستوں کے الگ ہونے کی وجہ سے روس کی افرادی قوت میں کمی واقع ہوئی اور عالمی طاقت ہونے کے درجے سے روس تنزلی کا شکار ہوگیا۔ روس کا اس وقت کل رقبہ ۱۷،۰۹۸،۲۴۶ مربع کلومیٹر ہے۔ اور اس کی آبادی پندرہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ ماسکو اس کا دارالحکومت ہے۔ اس ملک کی اوقاتِ کی تقسیم کئی خطوں پر مشتمل ہے۔ سولہ ممالک کے ساتھ اس کی سرحدی ہمسائیگی ہے۔ اس کا کچھ حصہ برِ اعظم یورپ میں واقع ہے؛ لیکن زیادہ حصہ ایشیا میں واقع ہے۔ اس لیے اسے ایشیائی ملک ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔ پورے شمالی ایشیا پر تنہا روس چھا ہوا ہے۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں کہ: ''روس کا نام لیتے ہی ایک ایسی سرزمین کا نقشہ ذہن میں آتا ہے جو انیسویں صدی عیسوی سے یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک (مختصراً یو ایس ایس آر) اور پھر محض سوویت یونین کہلانے لگی ہے۔''(۳۵)

روس میں بیسویں صدی میں دو انقلاب آئے جن کی وجہ سے روس عوام کی قسمت کا بہترین فیصلہ کیا گیا۔ روس کی گزشتہ تاریخ پر نظر دوڑائیں تو: ''دو صدیوں تک روسی اور ترکی فوجوں میں معرکہ آرائی رہی۔ زیادہ نقصان

سلطنت عثمانیہ کو پہنچا۔ اس طرح روس کو یورپ کے معاملات کو سمجھنے اور ان میں دخل دینے کا موقع ملا اور وہ ایک عظیم طاقت بن گیا۔''(۳۶) نو آبادیاتی عہد میں روس ایک ایسا ملک رہا ہے جس کی خود کئی ایک نو آبادیاں قائم تھیں۔ یہ کسی کی نو آبادی نہیں رہا۔ وسط ایشیا کی بڑی وسیع چودہ ریاستیں روس کی نو آبادیاں تھیں۔ شمال میں چین کا صوبہ منچوریا اور جنوبی کوریا بھی اس کی نو آبادیاں تھیں۔ بیسویں صدی میں پے در پے انقلابات کے بعد روس دنیا کی پہلی سپریم طاقت کے طور ایشیا میں اُبھرا۔ روس کی ترکی میں روسی ملکہ کیتھرائن کا بڑا عمل دخل ہے۔ روس کی ملکہ: ''کیتھرین دوم کے نام سے سلطنت کے اختیارات سنبھال لیے۔ اس ملکہ کی انتظامی اصلاحات بھی بڑی معرکہ آرار ہیں۔ روس کو ترقی ہوتی گئی۔''(۳۷) ایشیا میں جوں جوں روس کی طاقت میں اضافہ ہو گیا توں توں امریکا اور روس میں کشیدگی بڑھتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر: ''روسی مندوب پیوٹر پراسیموف نے امریکی سفیر کنتھ رش سے کہا تھا۔ آپ اپنے جرمنوں کو سنبھالیں اور ہم اپنے جرمنوں کو سنبھالیں گے۔''(۳۸) اسی دور میں روس اور امریکا کے مابین خلائی دوڑ میں مقابلہ دیکھنے میں آیا۔ خلا میں راکٹ کے ذریعے کبھی جانور بھیجے گئے کبھی انسان بھیجا گیا۔ سائنسی ترقی میں راکٹ ایک ایسی ایجاد تھی کہ جس کی وجہ سے خلا کی تسخیر ممکن ہو گئی تھی۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں کہ: ''جدید سائنس اور فنیات کی رو سے پہلا کامیاب راکٹ ہٹلر کے جرمنی نے ۱۹۴۳ء میں تیار کیا (تھا)۔''(۳۹) امریکا اور روس کے درمیان میں خلائی دوڑ ۱۹۵۷ میں شروع ہوئی تھی۔ جب ۴ر جولائی ۱۹۵۷ء کو: ''روس یہ اعزاز حاصل ہے ہوا کہ انھوں نے سٹپنک اول کے ذریعہ سے زمین کے مدار میں پہلا مصنوعی سیارہ پہنچایا۔ اس کا وزن ۱۸۴ پونڈ ۸۳ کلوگرام تھا۔ وہ ۲۱ دن تک پیغام بھیجتا رہا اور ۴ جنوری ۱۹۵۸ء تک مدار میں رہا اسی سال ۳ نومبر کو انھوں نے سٹپنک دوم ایک کتے ''لائیکا'' کو خلا میں بھیجا۔...... یہ کتا خلائی سفر کے دوران مر گیا۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۵۸ء کو واپسی پر یہ جہاز بھی تباہ ہو گیا۔''(۴۰) اس کے بعد روس نے چاند کو تسخیر کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے تحت روس نے چاند پر لونگ سوم روانہ کیا جس کے نتیجے میں: ''۱۹۶۰ء میں ان کا پہلے سے بھیجا ہوا خلائی راکٹ لُونگ اول چاند سے گزر کر سورج کا مصنوعی سیارہ جا بنا۔ روس بدستور سٹپنک بھیجتا رہا، سٹپنک ۔۵ میں انھوں نے دو کتے ''بلکا'' اور ''اسٹریلکا'' بھیجے تھے جو ٹھیک حالت میں واپس آ گئے۔''(۴۱) اس سے اگلے سال روس نے خلا میں ایک انسان کو بھیجا۔ روس کا اس خلائی مشن کے تحت: ''۱۲ر اپریل ۱۹۶۱ کو خلا بازی یوری گگارین پہلے شخص تھے جو ورسٹوک اوّل خلائی میں پہنچے اس سال ۶ر اگست کو انھوں نے ایک دوسرے خلا باز غرمان نیتوف کو دوسٹوک دوم خلا میں بھیجا۔ جس نے ۲۴ گھنٹے خلا میں رہ کر زمین کے گرد ے چکر لگائے ۱۹۶۲ء میں روس نے ورسٹوک کو ۱۱ر اگست کو اور ورسٹوک چہارم کو ۱۲ر اگست کو خلا بازوں کے ساتھ بھیجا۔''(۴۲) روس کے مقابلے میں امریکا بھی خلا میں اپنے مشن بھیجتا رہا۔ کئی ایک ناکامیاں بھی ہوئیں۔ مگر کوشش کے بعد کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ روس نے کئی ایک مشن چاند پر روانہ کیے تھے جن تجربات کے مشاہدات کے باعث امریکا کو کافی حد تک فائدہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ:

۱۹۶۹ء میں امریکی خلا باز چاند پر اترنے میں کامیاب ہوئے روس نے بیک وقت تین خلائی جہاز سویوز ۶، ۷،اور ۸ بھیجے کہ وہ خلا میں دوسرے سے ملاپ کریں۔اس واقع پر روسی خلا باز ویلری کوباسوف نے خلا میں پہلی بار دھات کی ویلڈنگ کا کارنامہ اسرانجام دیا۔۱۹۷۰ء میں روس کا بغیر خلا باز کے خلائی جہاز ۱۷رنومبر کو چاند پر 'بارشوں کے سمندر' میں اترا۔اس کا نام لُونا ۱۷رتھا۔(۴۳)

روس کی ترقی میں روس کی ملکہ نے اہم کردارادا کیا۔اہل روس کو دنیا میں مقابلہ کر کے جینا سکھا دیا تھا۔تاہم ملکہ کیتھرائن کی حکومت میں: '' انتظامی اصلاحات بھی بڑی معرکہ آرار ہیں۔روس کو ترقی ہوتی گئی۔'' (۴۴) روس ایک سوشلسٹ ریاست کے طور پر نمودار ہوااور دنیا کے مما لک میں پھیلنا شروع ہوا:

۱۹۴۰ء کی دہائی میں روس (USSR) ایک مضبوط سوشلسٹ ریاست کے طور پر ابھرا تھااور نظریاتی طور پر سوشلزم اور کیمونزم تیزی سے جغرافیائی سرحدوں کو پھلانگ کر دنیا کے مختلف مما لک کو''مفتوح'' بنا رہے تھے۔گانگریس نے اس وقت تو بحرہ عرب سے لے کر چین تک پاکستان کی شکل میں ایک دفاعی بلاک، روس کے سامنے کر دیا اور روسی نظریاتی یلغار سے بچنے کا ممکنہ انتظام کیا۔(۴۵)

تاہم روس کی سوویٹ اتحاد کا جس طرح اتحاد وجود میں آیا تھا اسی طرح سوویٹ ٹکڑے ٹکرے ہو گیا۔اس کی وجہ افغانستان روس جنگ تھی جس میں مرکزی کردار پاکستان نے سرنجام دیا اور امریکا نے روس کو توڑنے میں معاونت کی تھی۔ اس پہلو کا گزشتہ اوراق میں ذکر موجود ہے۔تاہم روس کے حوالے سے یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ:

۲۷ اگست ۱۹۹۱ء کو میخائل گورباچوف نے فوجی انقلاب کی ناکامی کے بعد سوویت یونین کی سپریم سوویت کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں سوویت یونین کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہ بچا سکا تو استعفی دے دوں گا۔دوسری طرف بورس نے رشین کی آزادی کا اعلان کر دیا۔امریکی صدر جارج بش کے ساتھ براہ راست مذکرات شروع کر دئے۔۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کو قازقستان کے دارالحکومت الما تا میں روس کی ۱۵ میں سے گیارہ ریاستوں نے معاہدے کیے جس کے بعد یو ایس ایس آر کا وجود ختم ہو گیا۔(۴۶)

روس کے جنوب اور جنوبی ایشیا کے شمال میں چین کا ملک واقع کی جس کی تہذیب اور تاریخ دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے۔چین کا مجموعہ رقبہ ۹،۵۹۶،۹۶۱ مربع کلومیٹر ہے۔اس کی آبادی ایک ارب، اکتالیس کروڑ اوراٹھارہ لاکھ کے قریب ہے جو دنیا کے کسی ملک سے سب سے زیادہ آبادی ہے۔چین نے پاکستان سے دو سال بعد آزادی حاصل کی: ''۱۹۴۹ء عوامی جمہوریہ چین کا سال تاسیس۔'' (۴۷) مگر آج ترقی کی دوڑ میں دنیا کا عظیم ملک اور طاقت بن چکا ہے۔ چین پر آدھا درجن ملکوں کا قبضہ رہا ہے۔جس کی تفصیلات گزشتہ اوراق میں مذکور ہے۔چین پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنگِ افیون کے بعد قبضہ کیا تھا۔جیسا کہ: ''انگریزوں نے چینیوں پر زبردستی افیم جنگ مسلط کرنے اور نائز مراعات حاصل کرنے

کے لیے چین سے جنگ لڑی اور جیتی۔"(۴۸) عوامی جمہوریہ کی ترقی میں عوام اور رہنماؤں کا ایک ایک عمل قابلِ دید ہے۔ چین میں تعلیم کے فروغ کا وقت آیا تو: "۱۹۴۹ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد چیئر مین ماؤ نے کہا کہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی طاقت کسان ہیں۔ کسان ساری آبادی کا ۸۰ اسی فیصد ہیں لیکن سارے کے سارے ان پڑھ ہیں اگر یہ پڑھے لکھے ہوتے تو تعمیر نو کا کام بہت آسان ہو جاتا۔"(۴۹) اس کے بعد چین کے کسان نے زراعت سے زیادہ تعلیم کی ترقی پر توجہ صرف کی۔ اشفاق احمد یہاں اس بات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ اگر: "پاکستان سے بے ایمانی اور بد معاملگی دور ہو جائے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نکل جائے، ریا کاری رشوت ستانی اور افسر شاہی ختم ہو جائے، اسلام آئے اور اسلام پرستی دور ہو جائے۔...... بیماری، گندگی اور غیر ملکی خوراک ختم ہو جائے تو پاکستان بھی چین جیسا ہی ہے۔"(۵۰)

چین کی آزادی میں سب سے اہم کردار امریکا نے سرانجام دیا تھا۔ امریکا نے چوں کہ بہت بعد میں چین میں اپنی نوآبادی قائم کی تھی۔ روس پہلا، جاپان دوسرا، برطانیا تیسرا اور امریکا کا چوتھا نمبر تھا۔ اس کے بعد دوسرے ممالک، چین پر دیر بعد قبضہ کرنے کے لیے آ گئے۔ چین چوں کے جاپان کا شروع سے مخالف تھا۔ اس لیے امریکا کو چین پر جاپان کی اجارہ داری پسند نہیں تھی اس لیے امریکا نے چین کی آزادی کے لیے راہ ہموار کی جس کا ذکر Kenneth Scott LaTourette نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ:

> The United State had assumed enormous responsibilities in China, But Before collapse of Japan was four years old it was forced to the painful recognition of a colossal failure. It was by way of the Pacific that the United State had been drawn into World War II. This, as we have seen in the preceding chapter, was because, in its pursuance of the open Door Policy with its support of the independence and territorial and administrative integrity of Chine. The United States had opposed Japan' s imperialistic adventure in that land. In assisting the Chinese to free themselves from the Japanese, the United States had spent billions of dollars had the lives of thousands of its sons. In the course of the war the Americans government had sought to strengthen the Chinese resistance by endeavoring to compose

difference between the Nationalists and the Communists. In this it had not succeeded.(۵۱)

چین کی تعمیر و ترقی میں چینی رہنما ماؤزے تنگ نے اپنی قوم کو دنیا کی عظیم قوم بنانے کا کارنامہ انجام دیا، جیسا کہ امجد اسلام امجد لکھتے ہیں: ''ماؤزے تنگ بیک وقت ایک عظیم سیاسی رہنما...... صرف بیسویں صدی کے نہیں تاریخ عالم کے عظیم ترین انسانوں کی صف کا آدمی ہے۔''(۵۲) چینی رہنما ماؤزے تنگ اور وزیر اعظم چواین لائی کی جدوجہد سے چین کی نے آزادی حاصل کی چین دونوں رہنما کئی سال تک عوام میں مشہور و معروف رہے۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں:

> ماؤزے تنگ کے بارے میں چین میں موجود صورت حال میرے دل کو نہیں لگ رہی ہے۔ ماؤزے اور چواین لائی پورے تسلسل کے ساتھ کامیاب جنگ آزادی لڑے اور فتح کامل پا کر کم از کم تیس سال بلا شرکت غیرے چین پر حکمران رہے اور اس قلیل عرصے میں چین دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن کر ابھرا ہے۔ وہ چین کہ جس پر امریکی اقتدار اور برطانوی راج تھا غلامی کا طوق اتار کر صرف ۳۰ سال کے عرصے میں دنیا کی ایک بڑی طاقت بن گیا۔(۵۳)

ماؤزے تنگ نے غیر ملکی استعمار سے قوم کو آزادی دلا کر نہ صرف نئی تاریخ رقم کی بلکہ غیر ملکی سامراج کو یہ بھی باور کرایا کہ، اب چینی جاگ اُٹھے ہیں۔ کسی بھی مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ Thames اور Hunson کی رائے کے مطابق:

> In Peking on I October, Maor read out the proclamation of the people's Repuplic of china from the Gate of Heavenly Peace: the enterance to the imperial palace of the Mings and the manchus.'Our nation will never be an insulted nation' , Mao said, ' We are Stood up.(۵۴)

چین کے عظیم رہنما ماؤزے تنگ چین میں صوبہ ہونان کے ایک گاؤں کے غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروف ہو گئے لیکن مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر کو خیر آباد کہا اور صوبہ چانگشا کے ایک اور پرائمری سکول میں داخلہ لے لیا۔ مرتضیٰ انجم کی رائے کے مطابق: ''ماؤزے تنگ جنھیں چینی زبان کے لہجے کے لحاظ سے ماؤزے دونگ کہا جاتا ہے ۲۶ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو چین کے ایک صوبہ ہونان کے ایک گاؤں شاؤشان میں ایک غریب کسان کے گھر میں پیدا ہوئے۔''(۵۵) چین کے عظیم رہنما کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جو ملک کی آزادی کے فکر اور عمل سے خالی ہو۔ ماؤزے تنگ کی پوری عمر عملِ مسلسل میں گزری تھی۔ ماؤ کی وفات کو دو سے تین ماہ کے عرصے تک صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ وہ اس طرح کے اشفاق حسین اس بارے میں کہتے ہیں کہ پاکستان

سے روانگی سے قبل: ''ٹائم میگزین'' میں پڑھ چکا تھا کہ مشہور چینی راہنما ماؤزے تنگ فوت ہو چکا ہے۔''(۵۵) لیکن جہاں تک ان کی وفات کو صیغہ راز میں رکھنے کا سبب ہے تو وہ یقیناً قومی سطح کی مصلحت ہوگی۔ ماؤزے تنگ کی وفات کو راز میں رکھنے کے انکشاف کو اشفاق احمد نے اس طرح بیان کیا ہے کہ: ''کانفرنس ہال میں موجود ہونے کے باوصف میں اکثر غائب رہتا اور تاسف کیا کرتا کہ اتنی دور آنے کے باوجود چیئرمین ماؤ سے نہ مِل سکوں گا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک مصروف آدمی تھا یا ایک عظیم نظام کا سربراہ تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اس جہانِ فانی میں موجود نہ تھا اور اس کو فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔''(۵٦) ماؤ کی جگہ ماؤ کا ہم شکل آدمی روزمرہ حکومتی امور سرانجام دیتا ہوا دکھایا جاتا رہا۔ لیکن ایک دن ماؤ کی وفات کا اعلان کر دیا گیا جب ایک چینی خبر رساں ادارے نے ریڈیو پیکنگ نے اس بات کی تصدیق کی کہ: ''چین میں آباد تمام قوموں کے عظیم اور جلیل القدر رہنما بین القوامی پرولتاریت کے عظیم مبلغ عوام اور اقوام کے سچے ہمدرد، کمیونسٹ پارٹی کی سنٹر کمیٹی کے ملٹری کمشن کے چیئرمین اور چینی عوام کے سیاسی مشاورتی کانفرنس کی قومی کمیٹی کے اعزازی چیئرمین آج ۹ ر ستمبر ۱۹۷٦ء کو ۱۰ ر بجے انتقال کر گئے۔''(۵٦)

ایشیا میں چین سے ملحقہ ملک کوریا ہے۔ جب بھی دنیا میں کوریا کی صورتِ حالات کا ذکر ہوتا ہے تو چین، جاپان، تائیوان اور سمندر میں گھرے علاقے کی طرف ذہن جاتا ہے۔ کوریا دو حصوں شمالی کوریا اور جنوبی کوریا میں تقسیم ہے۔ شمالی کوریا کا ہمسایہ ممالک چین اور جنوبی کوریا ہیں اور جنوبی کوریا کا ہمسایہ ملک صرف شمالی کوریا ہے۔ باقی اطراف میں سمندر واقع ہے۔ جنوبی کوریا کی آبادی پانچ کروڑ، بارہ لاکھ اور ستر ہزار ہے۔ شمالی کوریا کی آبادی دو کروڑ اٹھاون لاکھ ہے۔ جنوبی کوریا کا دالحکومت تیجاؤن اور شمالی کوریا کا دالحکومت سیول ہے۔ کوریا کے سیکڑوں جزیرے ہیں جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مشرقِ بعید میں ہونے کی وجہ سے کوریا کے بارے میں قدیم تاریخ میں وسط اور مغربی ایشیا کے لوگ ناواقف ہیں۔ چین کی طرح کوریا کی تاریخ بھی بڑی بھرپور ہے۔ آمد و رفت اور رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ کے گوشے پوشیدہ ہیں۔ سترویں صدی عیسویں کے وسط میں:

> روس کی ایک فوجی رجمنٹ دریائے امور کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتی ہوئی کوریا کے قریب منچوریا میں چینی فوجوں سے برسر پیکار ہوئی اور کوریا کے سفر کے ریکارڈ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ۱٦۳۵ء میں ایک عجیب و غریب نسل کے ۳٦ افراد، جن کی آنکھیں نیلی اور بال زدہ تھے اور جن کی ناکیں لمبی اور نوکیلی تھیں یہ ملاح تباہ شدہ جہاز سے ساحل کوریا تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے یہ ملاح دراصل ہالینڈ کے ڈچ باشندے تھے جنھیں ساحل سمندر سے دارالحکومت سیول لیے جایا گیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گئے اور انھوں نے کوریا میں شادیاں کیں اور یہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ بعد میں ان میں سے ۸ افراد وطن واپس چلے گئے، ان میں سے ایک شخص ہینڈرک ہمیلی نے کوریا میں اپنی زندگی کے

واقعات کو کتابی شکل میں بیان کیا اور اس طرح یہ کتاب کوریا کے بارے میں پہلی مغربی کتاب کہی جاسکتی ہے۔(۵۷)

دو حصوں میں تقسیم ہونے سے پہلے کوریا پر جاپان اور روس کا قبضہ تھا۔ شمال میں چین کے صوبے منچوریا پر روس قابض تھا۔ کوریا کا شمالی حصہ منچوریا سے جاملتا تھا کی وجہ سے شمالی حصے پر روس کی اجارہ داری تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں امریکا کا اثر و رسوخ کوریا پر قائم ہوا، تجارتی معاہدے طے پائے اور جنگی حالات میں امریکا نے کوریا کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن امریکا نے اپنی سالمیت کے پیش نظر جب یہ دیکھا کہ روس بھی کوریا پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو امریکا نے جاپان کے ساتھ اپنے سفارتی روابط بڑھائے اور کوریا پر جاپانی قبضے کی صورت میں مداخلت نہ کرنے کا جاپان کے ساتھ معاہدہ طے پایا۔ جس معاہدے کی رو سے: ''جاپان نے کوریا پر قبضہ کرلیا اور اس طرح چار ہزار سالہ پرانی سرزمین روس جاپان جنگ کے اختتام کے فوراً بعد ہی جاپانی توسیع پسندی کا شکار ہوگئی۔''(۵۸) کوریا پر جاپان کا قبضہ طویل عرصے تک قائم رہا۔ جاپان نے کوریا کو اپنے ساتھ ضم کرلیا تھا۔ تاہم کوریا کو جاپانی حکومت سے:

> اس وقت نجات ملی کہ جب امریکہ نے جاپان کو دوسری عالمگیر جنگ میں ایٹمی شکست دے کر جاپان کو کوریا سے ۱۹۴۵ء میں بے دخل کیا۔ امریکا کی مسلح افواج اس وقت کوریا میں داخل ہوئی کہ جب روس اور اس کے مغربی اتحادیوں نے مملکت کوریا کو دو حصوں میں منقسم کرکے شمالی کوریا کے عوام کو روس کے حوالے کردیا اور ۳۸ عرض البلد کو شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان سرحد قرار دے کر کوریا کی تقسیم کو ایک حقیقت کا روپ دے دیا، جنوبی کوریا جاپانی پولیس ہی کے زیر نگین رہا جس نے اہل کوریا کو امریکی فوجوں کے استقبال تک کی اجازت نہیں دی اور جو کوریائی باشندے امریکیوں کے استقبال کے لیے بوسان کی بندر گاہ پہنچے انھیں گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔(۵۹)

کوریا کے ملکی حالات چین کی طرح کے تھے۔ سیاسی صورت حال دونوں ملکوں کی ایک جیسی تھی۔ کوریا اور چین کے صوبہ منچوریا پر جاپان کا قبضہ تھا۔ منچوریا بھی کوریا کے ساتھ ایک بڑا علاقہ ہے جس پر کبھی روس کا اور کبھی جاپان کا قبضہ رہا ہے۔ تاہم کوریا کی حکومت موقتہ نے یہ اعلان کیا کہ چین اور کوریا مل کر جاپان کے خلاف جنگ لڑیں، جاپان کی شکست کے بعد کوریا کو آزاد کردینے کا بھی اعلان کیا۔ جاپان، کوریا اور چین کا مشترکہ دشمن تھا جس کی وضاحت Kenneth Scott نے یوں کی ہے:

> Condition in Korea following the Japan were no less distressing than were those in China. In 1940 a Korea "Provisional Government" had been brought in to existence in Chungking in declared that the Chinese Resistance to

Japan. Japan' s enemies declared that Korea was to become free and independent.(٦٠)

کوریا کی سیاسی صورت حال ایسی تھی کہ کوریا پر قابض ملک روس اور امریکا اسے مل بانٹ کر حکومت کرنے کی سوچ رہے تھے۔ آخری کار ہوا بھی ایسا ہی کہ جب کوریا کو آزادی ملی تو اسے دولخت ہونے کے عمل سے گزرنا پڑا۔ کوریا کی اس نازک صورتِ حال کے بارے میں حکیم محمد سعید لکھتے ہیں کہ:

> لیکن کوریا کے روسی اور امریکی حکمران جنھوں نے اسے شمالی اور جنوبی کوریا میں تقسیم کر رکھا تھا، تقسیم کے باب میں مختلف الرائے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نوزائیدہ ملکوں کے درمیان اب تک کسی قسم کی مفاہمت نہ ہوسکی اور دونوں نے مئی ۱۹۴۶ء میں اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور آخری کوریائی شاہی خاندان کی وہ حکومت جو ۱۳۹۲ء میں شروع ہو کر کسی نہ کسی شکل میں ۲۲/ اگست ۱۹۱۰ء تک قائم رہی تھی اور جس نے کوریا کا اتحاد بحال اور برقرار رکھا تھا ۳۵ سال جاپانی تسلط کے بعد جب دوبارہ آزاد ہوئی تو اب یہ دو واضح ملکوں میں بٹی ہوئی تھی شمالی کوریا اور جنوبی کوریا۔ (٦١)

جاپان سے کوریا کو آزادی دلانے اور ملک کو سیاسی، تعلیمی اور مذہبی لحاظ سے ترقی دینے میں کوریا کے قومی رہنما کم ال سنگ کا اہم کردار تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے والے کوریا کے رہنما کی زندگی کے مصائب ماوزے تنگ سے کم نہیں تھے۔ تاہم حکیم محمد سعید نے کوریا کے ایک باشندے کی زبانی مذکور تفصیل یوں بیان کی ہے: ’’ہمارے عظیم قائد کامریڈ کم ال سنگ عمر کا بہت بڑا حصہ ملک کو آزادی دلانے، جاپان کے استحصال قبضے سے نجات دلائی اور اس ساری جدجہد کی پیش بندی اور نگرانی کرنے میں صرف کر دیا۔‘‘ (٦٢) کوریا کے رہنما کم ال سنگ نے جاپان کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے: ’’۱۹۳۲ء میں جاپان دشمن گوریلا فوج تیار کر لی۔ لیکن اسے بے انتہا مشکلات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا کیوں کہ فوج کا اپنا کوئی علاقہ نہیں تھا نہ ایسی کوئی ٹھوس سیاسی قوت تھی جس پر وہ انحصار کر سکتی۔‘‘ (٦٣) کوریا کی عوام کے پیچھے کم ال سنگ کا وہ ولولہ تھا جو کوریا کو آزادی جیسی منزل سے ہمکنار کر سکتا تھا۔ جیسا کہ: ’’انقلابی فوج کے جوانوں نے جنرل کی کمان میں ارض وطن کی طرف مارچ شروع کیا چونگ پونگ پہنچ کر انھوں نے کیمپ کے گرد و نواح میں مختلف نعرے لکھ دیے، ایک نعرہ یہ تھا کہ ’’کوریائی جوانو! فوراً میدان میں نکل آؤ اور پوری مستعدی سے جاپان کے خلاف جنگ میں حصہ لو۔‘‘ (٦٤)

مشرق بعید میں جاپان ایشیا کا جزیرہ نما ملک ہے۔ جاپان کو ابتدائے تاریخ سے ہی اپنی صلاحیتوں پر ناز تھا۔ جنوبی ایشیا اور مشرقِ بعید کے ممالک کے سفرناموں اور تاریخ میں جاپان کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں آتا رہا ہے۔ جاپان کا رقبہ معہ جزیروں کے ۳۷۷،۹۷۵ ہے اور اس کی کل آبادی بارہ کروڑ اُنسٹھ لاکھ بیاسی ہزار ہے۔ یہ عداد و شمار موجودہ ہیں جس وقت جاپان پر ایٹمی حملہ ہوا تھا، اُس وقت اس کی آبادی آٹھ کروڑ کے قریب تھی۔ اس وقت جاپان صنعتی اور معاشی ترقی کے اپنے مقررہ اہداف سے آگے بڑھ چکا ہے۔ تجزیہ کاروں کی روس سے جاپان جنگ کے بعد سب سے زیادہ امن پسند ملک ہے۔

لیکن اب تک یہ کوئی امن اوارڈ حاصل نہیں کر سکا۔ اس کا دارالحکومت ٹوکیو ہے، سمندری تجارت کے حوالے سے اسے اہمیت حاصل ہے۔ چوں کہ جاپان سمندر میں جزیرہ نما ہے اس لیے سمندر پار اس کے قریبی ہمسائے، چین اور کوریا ہیں۔ تائیوان سمندر میں اس کے جنوب میں واقع ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپان پر ۶ راگست کو گھرائے جانے والے ایٹم بم کے بعد جاپان نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ لیکن اتحادیوں نے جاپان کی عوام کی خطا معاف نہیں کی۔ ہتھیار ڈالنے کی رسم کے دو دن بعد اس پر دوسرا ایٹم بم بھی گرا دیا گیا۔ ایٹم بم کا حملہ ایک ایسی سفاکی تھی جو مہذب امریکا کی طرف سے انجام دی گئی تھی، جس کے نتائج کے پیشِ نظر:

> On August 6, 1945, the United States becomes the first and only nation to use atomic weaponry during war time when it drops an atomic bomb on the Japanese city of Hiroshima. Approximately 80,000 people are killed as a direct result of the blast, and another 35,000 are injured. At least another 60,000 would be dead by the end of the year from the effects of the fallout.(۶۵)

ایٹم بم حملے کے بعد امریکا کو جاپان پر وسیع پیمانے پر کاروائی کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے ۱۹۴۵ء میں ہوائی جہاز سے: ''شاہی محل پر بھی ٹوکیو شہر کی طرح آتشی بموں سے حملے کیے۔۔۔۔۔شہر اور شاہی محل دونوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا۔''(۶۶) اس طرح جاپان کے شاہی خاندان کے ۱۵۰ویں شہنشاہ: ''ہیرو ہیتھو نے ۱۹۴۶ء میں سورج کے ساتھ ہاتھ کر دیا اور سورج دیوتا کا پوتا بننے کے بجائے بندے کا بچہ بن گیا۔''(۶۷) یہ الگ بات ہے کہ جاپان کو شکست کے بعد جو ندامت ہوئی اُس کے نتائج عوام اور فوج میں خودکشی کے صورت میں دیکھنے کو آئے۔ جاپان کو سرے سے ہی ملیا میٹ کر دینے اور مغربی تہذیب وثقافت کو زبردستی جاپانی عوام پر ٹھونسنے کی کوشش کی گئی۔ علی سفیان آفاقی کا جنگ کے بعد نکتہ نظر یہ ہے کہ:

> مشرق ومغرب کا مزاج اگر دیکھنا ہوتو جاپان کو دیکھئے۔ یہ وہ ملک ہے جو عالم گیر جنگ میں بری طرح ہزیمت اٹھا کر ذلیل وخوار ہوا تھا۔ امریکی قالبنوں نے جاپانیوں کو ہر لحاظ سے تسخیر کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ملکی معیشت وصنعت وحرف تو تباہ ہو ہی چکی ہے۔ انھوں نے ملکی کلچر کو ملیا میٹ کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی ایک عظیم اور باقاعدہ مہم کے طور پر جاپانیوں کو مغربی اقدار وروایات کا عادی بنانے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ یہاں تک جاپانی نسل تک کو مغربی آویزش کا شکار بنانے کی کوشش کی گئیں۔(۶۸)

امریکی حملے نے جاپان کو تباہ و برباد تو کر دیا لیکن وہ جاپانیوں کے سوچ اور فکر کو شکست نہ دے سکا۔ اہل جاپان کی یہ سوچ تعریف کے قابل ہے کہ ہم نے سر جھکایا ہے آنکھیں نہیں جھکائیں۔ جاپان کسی وقت بھی امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی صورت میں آسکتا ہے۔ جاپان کے صبر و تحمل اور شبانہ روز عمل کی وجہ سے آج جاپان نے ترقی کی جو منازل طے کی ہیں انھوں نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ تاہم جاپان کے تمام دفاعی معاملات امریکا کے ذمے ہیں اور جاپان کو تعلیم و ترقی دینا جاپان کے ذمہ داری ہے جو انھوں نے خوب نباہی ہے۔ علی سفیان آفاقی لکھتے ہیں کہ: ''دفاعی ضروریات اور اسلحہ سازی پر امریکی پابندیوں کے بعد جاپانیوں نے صنعتی ترقی کی طرف توجہ دی اور غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جو دفاع پر سب سے کم رقم خرچ کرتا ہے۔ امریکا نے دفاع کی ذمہ داری سنبھالی تو جاپانیوں نے شکر کیا اور دوسرے میدانوں میں کامرانیاں حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔'' (۶۹) موجودہ دور میں دنیا کے کئی ممالک کے پاس ایٹم بم موجود ہے اور جاپان کے پاس نہیں ہے۔ تاہم جاپان کے پاس ایٹمی توانائی کے بہت سارے منصوبے ہیں، جو جاپان کی ترقی کو آگے ہی آگے بڑھا رہے ہیں۔ علی سفیان آفاقی لکھتے ہیں کہ: ''آج تک جاپان کے سوا دنیا کے کسی اور ملک پر ایٹم بم نہیں گرایا گیا۔ لیکن آج حالت یہ ہے کہ جاپان میں ۲۹ ایٹمی ری ایکٹر کام کر رہے ہیں۔ جذباتی طور پر تو جاپان کو ایٹم کے نام سے نفرت ہو جاتی۔ لیکن جاپان نے پر امن ذرائع کے طور پر ایٹمی توانائی کا استعمال کیا ہے اور بہت خوب کیا ہے۔'' (۷۰)

ج: برصغیر کی آزادی، تقسیم، سیاسی و سماجی صورتِ حال: اردو سفرنامے کے تاریخی عناصر

برصغیر پاک و ہند میں پاکستان، بھارت کے علاوہ بنگلہ دیش، بھوٹان، نیپال اور سری لنکا بھی شامل ہیں۔ جموں اور کشمیر کا خطہ بھی برصغیر کی حدود میں موجود ہے۔ برصغیر میں بھوٹان واحد ایسا علاقہ تھا جو انگریز تو کیا کسی کی بھی طاقتور ملک کی غلامی میں نہیں تھا۔ دیگر ممالک کشمیر سمیت انگریزوں کی غلامی میں تھے۔ آزادی کے بعد کشمیر کو بھی دولخت کر دیا گیا۔ ایک آزاد کشمیر اور دوسرا مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر کے علاقے کو پاکستانی فوج نے ۱۹۴۸ء میں پیش قدمی کر کے آزاد کرایا تھا۔ اس طرح کشمیر کا نوے فیصد علاقہ بھارت کے قبضے میں ہے اور دس فیصد علاقہ پاکستان کی عمل داری میں ہے جسے آزاد کشمیر کہا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہے۔ مگر اس میں انتظامی ڈھانچہ پاکستان کا ہے۔ قانون اور کرنسی پاکستان کی ہے۔ آبادی کے تناسب کے لحاظ پاکستان کی وفاق کی سرکاری ملازمتوں میں کشمیر کا کوٹا مقرر ہے۔ اب ایسا ہے کہ آزادی کے بعد مذکورہ خطے اپنے اپنے طور پر ایک آزاد اور خود مختار حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور کشمیر کے سیاسی، دفاعی اور سماجی حالات و واقعات ایک دوسرے ملک پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ تقسیم کے وقت اس اصول پر مسلمانوں کے خلاف ہتھیار بنایا گیا کہ مسلم آبادی والے صوبے پاکستان میں شامل ہوں گے اور ہندو یا سکھ آبادی والے صوبے بھارت میں شامل کیے جائیں گے۔ اس طرح بنگال کو مشرقی اور مغربی بنگال؛ پنجاب کو مشرقی پاور

مغربی پنجاب اور کشمیر کا مشرقی حصہ جو کہ مقبوضہ کشمیر کہلاتا ہے، بھارت میں شامل ہے۔اس میں لداخ اور جموں کے علاقے بھی شامل ہیں جب کہ مغربی کشمیر جو آزاد کشمیر کہلاتا ہے پاکستان کے ساتھ ملحقہ ہے۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم نہ کیا جائے۔لیکن پاکستان اور بھارت کے درمیان محاذ آرائی برقرار رکھنے کے لیے: ''حکومتِ برطانیا نے ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ایک نئی سکیم کا اعلان کر دیا۔ جس کا ما حصل یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ بنگال کو بھی جو مسلم اکثریت کے صوبے تھے۔ تقسیم کر دیا جائے۔ مسلم لیگ متحدہ پنجاب و بنگال کا مطالبہ کر رہی تھی۔لیکن وائسرائے نے اعلان کیا کہ ان صوبوں کی تقسیم بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ہندوستان کی۔''(۷۱) تقسیمِ برصغیر کے وقت پنجاب اور بنگال کی بین الصوبائی حدود کی تقسیم کے لیے الگ الگ کمشن مقرر کیا گیا۔جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ حکومتِ برطانیا کی تجویز کے مطابق مقرر تاریخ کو پنجاب اور بنگال:

دونوں صوبوں کی حد بندی کے لیے جدا جدا کمیشن مقرر ہوئے۔جن کا صدر ایک ہی شخص یعنی ریڈکلف مقرر ہوا۔ بنگال حد بندی کمیشن کے ارکان میں مسٹر جسٹس بجن کمار مکر جی، مسٹر جسٹس سی سی بسواس، مسٹر جسٹس ابو صالح محمد اکرام، مسٹر جسٹس ایس اے رحمان شامل تھے اور پنجاب حد بندی کمیشن کے ارکان میں مسٹر جسٹس دین محمد، مسٹر محمد منیر، مسٹر جسٹس مہر چند مہاجن اور مسٹر تیجا سنگھ شامل تھے۔(۷۲)

برِصغیر کی تقسیم کے وقت جیسا کہ بنگال کی ہندو اور مسلم آبادی کے علاقوں کو تقسیم کی گیا تھا۔اس کی ایک تاریخی حیثیت تھی۔ ماضی میں جب بھی مشرقی اور مغربی بنگال کو ملا کر ایک صوبہ بنانے کی کوشش کی گئی تو مشرقی بنگال کے مسلمانوں نے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔اس ردِ عمل کی وجوہات گزشتہ اوراق میں زیرِ مطالعہ رہ چکی ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصد ہے کہ:

سیاسی لحاظ سے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے جغرافیے کا اہم ترین پہلو برصغیر میں اس کا چھوٹا سا سائز تھا، اس کے علاوہ اس میں تضادات بھی تھے جیسے مشرقی حصے کی مغربی حصے سے دوری وغیرہ۔ اگرچہ عمومی طور پر پاکستان چھوٹا ملک ہرگز نہ تھا اس کا رقبہ یونائیٹڈ کنگ دم سے چار گنا اور ٹیکساس اور ایریزونا کے برابر تھا لیکن ہندوستان کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹا ملک تھا۔ پاکستان کی آزادی کے وقت ہندوستان کے کل رقبے کا ۲۳ فیصد اور آبادی کا ۱۸ فیصد حصے میں آیا تھا۔(۷۳)

پاکستان قیام کے وقت بظاہر بھارت کے مقابلے میں بہت چھوٹا سا ملک تھا جس کی وجہ سے ہندوؤں نے تقسیم ہند کے فیصلے کو منظور کر لیا۔ درحقیقت یہ ایک بہت بڑے ملک کا قیام تھا جس نے ایشیا کے نقشے میں ابھر کر اپنی نئی اہمیت پیدا کی۔ برِصغیر کی آزادی کا فیصلہ ہوا تو پاکستان کا قیام دو مختلف خطوں میں واقع ہوا۔ دونوں خطوں کے درمیانی فاصلہ سات سو میل سے زیادہ تھا۔تاہم برِصغیر کی آزادی کا بل پاس ہونے اور دو نئی حکومتیں بننے کے بارے میں کنتھ سکاٹ کی رائے ہے کہ:

In July 1947 the Indian Independence Bill was passed through Parliament. It set up two new dominions, Pakistan

and India. Pakistan, a Moslem state, was comprised two areas seven hundred miles apart, the larger in the Northwest and the smaller in the eastern part of Bengal with an adjacent of Assam. Karachi was a capital and Mohammed Ali Jinnah, President of the Moslem league, was appointed Governor General.(۷۴)

پاکستان اور بھارت دونوں ممالک بالترتیب ۱۴، ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو قائم ہوئے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ بھارت کے آزاد ہونے پر متوقع تھا کہ جواہر لال نہرو گورنر جنرل بنیں گے۔ مگر بھارت کی انتظامیہ نے اپنے آپ کو عبوری طور پر خود کو برطانیا کے ماتحت ہی رکھا جس کی مثال ذیل کے اقتباس میں اس طرح پیش کی گئی ہے، کہ:

The Dominion of India comprised the rest in British India. It had its capital at New Delhi and Lord Mountbatten became Governor General. The new governments were inaugurated on August 15, 1947. India independence was now a reality, for dominion status carried with it the right of choice either, remain in the British Commonwealth or fully to withdraw from it.(۷۵)

مشرقی اور مغربی بنگال کی تقسیم کی نسبت پنجاب کی تقسیم کی وجہ سے مسلمانوں اور خاص طور پر سکھوں میں بے چینی پھیل گئی۔ امرتسر اور گورو داس پوران کی خواہش کے مطابق بھارت میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لاہور بھی بھارت کے حصے میں آئے گا۔ لاہور کے پاکستان میں شامل ہونے نے سکھوں کو غم و غصے میں مبتلا کر دیا۔ سکھوں کا خیال تھا کہ لاہور کی ایک صنعتی، اقتصادی اور ثقافتی اہمیت ہے جس ملک کے پاس یہ شہر چلا گیا وہ ہر لحاظ سے مضبوط ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سکھو نے مسلمانوں کو لاہور سے نکالنے کی تحریک چلائی۔ اس کے ردِعمل میں مسلمانوں نے سکھوں کی جائیدادوں اور دوسری املاک کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف سکھوں کے ردِعمل میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ صورتِ حال اُس وقت پیدا ہوئی جب: ''پنجاب کی سرحدوں میں رود بدل یا پھر یوں کہیے کہ پنجاب کو تقسیم کر دینے کے عمل اور مغربی پنجاب میں سکھوں پر ہونے والے اکا دکا تشدد کے واقعات نے سکھوں کو قتل و غارت گری پر مائل کیا۔''(۷۶) جہاں تک بنگال کی تقسیم کی بات ہے تو برصغیر کی تقسیم کے وقت بنگال کی صورتِ حال زیادہ تر پُرامن ہی رہی تھی: ''نواکھلی کے دیہات میں تشدد کی

وارداتیں ہوئیں اور بنگال کی تقسیم سے وہاں کافی پُرسکون رہا۔......مغربی اور مشرقی بنگال میں کافی بڑی اقلیتیں رہتی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں موجود ہندوؤں کی کافی بڑی تعداد نے وہاں کی سیاست کو مغربی پاکستان کی سیاست سے مختلف رنگ دے دیا تھا۔"(۷۷)

تقسیم برِصغیر کے وقت ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال غیر متوقع تھی۔ تقسیم کی صورت میں پنجاب کے عوام نے دونوں طرف ہجرت کی۔ بھارت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں نے پاکستان کی طرف اور پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ اس تقسیم اور ہجرت میں دونوں ملکوں اور ان کی عوام کا جو نقصان ہوا وہ ناقابلِ تلافی تھا۔ تقسیم کے اثرات اور ہجرت کے نشانات اردو سفرنامے میں انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطحوں پر حصہ بنتے رہے ہیں۔ جیسا کہ ثریا حفیظ الرحمان کا کہنا ہے کہ: "تینتیس برس پہلے میلوں پر محیط انسانوں کا ایک سیل چلا جا رہا تھا۔ ۴۷ء میں یہ قافلہ اگست کے مہینے میں عید کے روز تحصیل اجنالہ سے چلا تھا۔"(۷۸) تقسیم ہندوستان کے وقت جو ہجرت درپیش رہی اور اس میں بہت سے اہلِ قلم بھی شریک سفر تھے جنھوں نے اپنی ہجرت کے حالات کو کسی صورت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتظار حسین نے ہجرت کے وقت کی صورتِ حال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ: "۱۸۵۷ء میں بس اتنا ہوا کہ دلی ایک سال اُجڑی، دوسرے برس کے جاتے جاتے بس گئی۔ ۱۹۴۷ء میں اس نے دوبارہ بسنے میں اتنا وقت بھی نہیں لیا۔ یار سب کوچ کر گئے۔ مگر بس مکان وسرا وجا پھر بھی خالی دکھائی نہیں دیئے۔ ایک خلقت اجڑ کر باحال تباہ رخصت ہوئی۔ دوسری خلقت اُجڑی پچھڑی آئی اور آ کر بس گئی۔"(۷۹)

یوں تو انتظار حسین کے تمام تحریروں پر ہجرت کے حالات اثر انداز ہیں۔ مگر ان کے سفرناموں میں بھی سیاسی اور سماجی صورتِ حال اور ہجرت کے واقعات کا ذکر ہے۔ جہاں ہندوستان کی تقسیم کے وقت دونوں طرف کی عوام کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا وہاں پر سیاست دانوں کے لیے ایک مشکل امتحان تھا۔ کیوں کہ تقسیم کے وقت نہ تو ہندوؤں نے مسلمانوں کو گلے مل کر رخصت کیا تھا اور نہ مغربی ہندوستان کے مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کو پیار سے سرحدوں تک چھوڑنے آئے تھے۔ تقسیم کے نتیجے میں ہجرت کے وقت: "۱۹۴۷ء کی مارکاٹ میں مسلمانوں نے پرانے قلعہ میں پناہ لی تھی اور یہیں سے نیشنل ٹرینوں کے لیے بدقسمت مسلمان روانہ ہوئے تھے۔ جو کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود پاکستان نہ پہنچ سکے۔"(۸۰) حقیقت میں آزادی کے ثمر کو ہندوستانی سیاست سے جدا کر کے دیکھا جائے تو عوام کی اپنی ترجیحات تھیں۔ تقسیم کے وقت سیاسی قیادت نے اپنے انداز سے صورتِ حال کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی مگر عوام کی سیاست کہیں اور جہتوں میں بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ آئین ٹالبوٹ نے ہندوستان کی تقسیم کے وقت پنجاب میں واقع ہونے والی ہجرت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ:

> مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے کو آبادی کے تبادلے کے تناظر میں دیکھا ہی نہ گیا تھا۔ سرحدوں کا تعین کرتے ہوئے بھی غیر یقینی کی وجہ سے انتقالِ آبادی کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی۔ مزید برآں نام نہاد

یرغمالی، تھیوری کے باعث ہر دوملکوں میں بڑی اقلیتوں کے فوائد کو بھی اجاگر کیا گیا اور قومی استحکام کے لیے گارنٹی قرار دیا گیا۔ البتہ محدود پیمانے کی ہجرت کہ جس کی بابائے قوم کی طرف سے حوصلہ افزائی کی گئی ایسے افراد کی ہجرت تھی جو قومی تعمیر و ترقی میں پاکستان کی معاونت کر سکتے تھے۔ البتہ اس بات کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۴۷ء کے موسم بہار کے بعد سے پنجاب اور پنجاب ہی میں قائم راجباڑوں میں جو اسلحہ جمع ہو رہا تھا اس کی پیشین گوئی کر دی گئی ہو۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں شمال مغربی پنجاب میں سکھوں پر اکا دکا حملوں کے بعد سکھوں کی نجی فوجیں اور جتھے قائم ہو گئے تھے جن کی سربراہی انڈین نیشنل آرمی کے سابقہ سپاہی کر رہے تھے۔ ریڈکلف ایوارڈ کے شائع سے کچھ عرصہ قبل سکھو کے جتھوں نے پنجاب کے متنازعہ سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کے دیہاتوں پر زوردار حملے کرنے شروع کر دیئے آزادی سے کچھ ہی عرصہ قبل ۵،۰۰۰ مسلمان مہاجر ضلع امرتسر سے لاہور پہنچے۔ (۸۱)

تقسیم کے وقت ہندوستان میں موجود ہندوؤں کی شدھی، سنگھٹن اور آر ایس ایس جیسی تنظیموں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے سکھوں کو آلہ کار بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے سکھوں نے قتل و غارت گری ،لوٹ مار اور آبروریزی کی وارداتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا کہنا ہے کہ:

مشرقی پنجاب میں سرداروں کی کرپانوں سے جنم لینے والا مسلمان خون بہتے بہتے دریائے چناب کے کنارے..جو کالیاں تک بھی آ پہنچا تھا..جن کے پیارے کرپانوں کا شکار ہوئے تھے یا جن کی مائیں بہنیں برہنہ کی گئی تھیں وہ اپنے پاگل پن اور آنکھوں میں نچڑتے خون کے ساتھ جو کالیاں آئے تھے اور گوردوارے کو آگ لگا دی۔ مقامی کسانوں نے مزحمت تو کی لیکن انھیں بھی اُس آگ میں دھکیل دیا گیا۔ (۸۲)

دراصل تقسیم ہندوستان ایک برہنہ تلوار تھی جس نے نہ تو کسی کے گلے کو بخشا اور نہ ہی کسی کی عزت کا احساس کیا۔ ہندو بنئے کو شروع سے اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ آزادی کی صورت میں تقسیم لازمی عمل میں آئے گی۔ اس لیے اُس نے سکھوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا تھا۔ سکھوں نے ظلم و ستم کا وہ بازار گرم کیا کہ جس کی تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔ جبر اور ظلم کی ایک مثال یہ ہے کہ سکھوں نے: ''۴۷ء میں مسلمانوں کی ہزاروں لاکھوں عورتیں سپتر یاں چھین کر گھروں میں ڈال لی تھیں۔'' (۸۳) تقسیم کے وقت جہاں پر سکھ ثقافت میں تبدیلی رونما ہوئی وہاں پر انھیں مسلح کرنے کی پالیسی جیسی سوچ نے بھی جنم لیا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سکھ جبلی طور پر ظالم ہوتے ہیں، مگر یہ ضرور کہا ہے کہ تقسیم کے وقت جو انھوں نے ظلم و ستم روا رکھا وہ ابھی تک بھولا نہیں ہے۔ بقول ان کے: ''ہر سردار ایک پروٹو ٹائپ ہوتا ہے..وہ پگڑی باندھتا ہے......ننکانا صاحب میں سکھوں کے مکے مدینے......وہ گرنتھ کے آگے سر جھکا تا ہے..اُسے کوئی پریشانی نہیں......'' اگرچہ ان خوبیوں کے باوجود مشرقی پنجاب میں اُس کی خونریزی اور مسلمانوں کے خون کی پسندیدگی اور لاکھوں لاشوں کا جواز پیدا

نہیں ہوتا۔" (۸۴) ہجرت کے واقعات کی روداد میں سکھوں کا کردار اہم۔ تاہم پنجاب کے مسلمانوں نے بھی اپنے جان و مال کے تحفظ کے لیے: "مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف جوابی کاروائیاں کیں اور ان لوگوں پر حملے کیے جو ہندوستان جارہے تھے سب سے اندوہ ناک تشدد کی کاروائیاں شیخو پورہ میں دیکھنے میں ملیں جہاں لوٹ مار قتل و غارت اور آتش زدگی مسلسل ۲۴ گھنٹے جاری ۲۵ سے ۲۶ اگست تک شیخو پورہ میں موت کا بازار گرم رہا۔" (۸۵) تقسیم کے وقت ہونے والی ہجرت کے پیشِ نظر جو فسادات برپا ہوئے ان کا سلسلے پورے پنجاب میں پھیل گیا۔ شہر شہر سے قتل غارت گری کے واقعات کی خبریں مل رہی تھیں۔ اسی قسم کی صورتِ حال کو تاریخ پاکستان میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

> لائل پوری کی زرخیز زرعی اراضی جو کہ زیادہ تر سکھوں کی زیرِ ملکیت تھی اور ننکانہ صاحب میں سکھوں کے مذہبی مقامات پاکستان کے حصے میں آ گئے ہیں تو اس سے سکھوں کا اضطراب تشدد کی شکل اختیار کر گیا۔ انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے سے کچھ عرصہ پہلے سکھ لیڈر "ماسٹر تارا سنگھ" نے آئندہ کی جدوجہد کے لیے چندے کی اپیل کی۔ اس نے خاص طور پر پاکستان کے حصہ میں نہیں جانا چاہیے۔ تارا سنگھ نے سکھوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شہیدی جتھوں میں شامل ہونے کو کہا۔ سکھوں نے نہ صرف جالندھر اور امرتسر کے اضلاع میں مسلمانوں کے دیہات پر حملے کیے بلکہ ان ٹرینوں کو بھی نشانہ بنایا جو مہاجروں کو لیے پاکستان جارہی تھیں۔ بہت سے سکھ جتھے تو ہمسایا سکھ ریاستوں کی محفوظ پناہ گاہوں سے نکل کر پاکستان پر حملہ آور ہوتے۔ مشرقی پنجاب میں سول انتظامیہ کے مکمل طور پر تہس نہس ہونے کے بعد ماسٹر تارا سنگھ نے خود ہی ہندوستان کے پہلے چیف آف جنرل سٹاف کے سامنے یہ تسلیم کیا کہ وہ امرتسر میں مسلمان ماجروں کو حفاظت سے گزر جانے کے لیے راستہ فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ (۸۶)

ہندوستان کے دونوں خطوں میں سیاسی فضا کی عجیب صورتِ حال تھی۔ مسلمان بھارت میں اقلیت کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ہندو اور سکھ پاکستان کے علاقے میں اسی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ تقسیم کے عمل میں ہجرت ایک اضافی مشق آپڑی تھی جس کے لیے دونوں طرف کے رہنما اس قدر زیادہ ہجرت کے لیے متوقع نہیں تھے۔ اس صورت حال کو روبن جعفرے نے بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ:

> This hectic rush among leader and constitution makers left little time for consideration of the future of the minorities. Sikhs and Hindus in Pakistan and Muslim in India-who left in the new domination. Yet the transmission from the villages of the communal concerns of the elites had made partition, or a settlement of some kind, so urgent. Religion

> had mobilized the countryside as no constitutional or economic issue ever could, but by the summer of 1947, the countryside was mobilized not for politic, but for bloody violation. This was particularly true in Punjab, where Sikhs did not form a majority in any single district and could expect to find their community bisected by the boundary between India and Pakistan.as early as March 1947, a Sikhs leader suggested that provision should be made to transfer populations in Punjab: Hindus and Sikhs to India, Muslims to Pakistan.(۸۷)

دونوں خطوں میں بڑے پیمانے پر آبادی کی منتقلی کی صورت میں جہاں عوام کا قتل عام ہوا۔ ایک طرف ہندو اور سکھ اس کام کے لیے پیش پیش تھے تو دوسری طرف مسلمان اسی طرح کا فرض ادا کر رہے تھے۔ لیکن ثریا حفیظ الرحمانؔ لکھتی ہیں کہ: ''۴۷ء میں سکھو اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا حساب چکایا...... ایسا چکایا کہ قصہ ہی پاک کر دیا اور اب ہندو سکھوں کا حساب چکا رہے ہیں۔''(۸۸) سکھوں نے مسلمانوں کا تقسیم کے وقت قتلِ عام کیا مگر بعد کی دہائیوں میں ہندوؤں نے سکھوں کا قتل عام بھی اسی طرح کیا جس طرح انھوں نے مسلمانوں کا کیا تھا۔ تقسیم کے وقت عوام کی آبادکاری کے مسائل نے جنم لیا۔ انتظامی سطح پر اثاثہ جات، جنگی ساز و سامان اور کارخانہ جات کی تقسیم جیسے مسائل درپیش تھے۔ پاکستان آنے والے مہاجرین، لاہور، فیصل آباد سیالکوٹ، کراچی اور دیگر شہروں میں آباد ہو رہے تھے۔ لیکن بھارت میں مشرقی پنجاب کے شہروں امرتسر، انبالہ کے ساتھ ساتھ: ''نئی دہلی میں خاص طور پر ہندو سکھ شرنارتھی ۱۹۴۷ء میں کثرت سے جا بسے۔''(۸۹) عوام کی آبادکاری کے مسائل کے حوالے مہاجرین کا پاکستان پر بھی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ جسے ہر صورت قابو میں لانے کے لیے حکومتِ وقت اقدامات بروئے کار لا رہی تھی۔ پاکستان آ کر آباد ہونے والے مہاجرین کے بارے میں تاریخِ پاکستان میں یوں تفصیل بیان کی گئی ہے کہ:

> پاکستان میں ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی کل آبادی میں ہر دس افراد میں سے ایک مہاجر تھا یا مہاجر نسبت رکھتا۔ اگرچہ مہاجرین کی بڑی اکثریت نے مغربی پاکستان کا رخ کیا پھر بھی مشرقی پاکستان میں آنے والے ماجرین سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ ۱۹۵۱ء مردم شماری کے مطابق تقریباً ۷۰۰،۰۰۰ مہاجرین مشرقی پاکستان میں آ کر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ ان مہاجروں کی دو تہائی تعداد مغربی بنگال اور آسام سے یہاں منتقل ہوئی جب کہ باقی مہاجر جو کہ اردو بولنے والے تھے۔ بہار اور یو پی سے آ کر وہاں

بس گئے تھے۔ان مہاجروں کی بڑی اکثریت ۱۹۴۷ء میں اگست اور نومبر کی درمیانی مدت میں وہاں آئی۔جس قدر مہاجر ہندوستان سے پاکستان آئے تقریباً اسی قدر مہاجر پاکستانی علاقوں سے ہندوستان گئے۔(۹۰)

تقسیم ہند کی صورتِ حال اور مہاجرین مسئلے کو کنتھ سکاٹ نے بھی قریب قریب مذکور بلا بیان کے مطابق بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> Independence had as an immediate aftermath intensified fighting between the various religious communities, chiefly between Moslems and Hindus. Forced by Moslems, Hindus and Sikhs migrated eastward into, India from Pakistan. Moslems, constrained by Hindus and Sikhs, moved westward from India into Pakistan. It is said that ten million people were on the march. The unrest spread to other section of the land. The fighting and massacres aggravated the suffering and tens of thousands perished. By the end of 1947 the disorder had largely subsided and the shifts of population had mostly been completed. However, thirty -five or forty million Moslem were still in India and presumably would stay, as against sixty or sixty-five millions of their faith in Pakistan. Moreover, many Hindus continued in Pakistan. Neither state was either purely Moslems or purely Hindus. Each, especially Pakistan, had millions of displaced persons to absorb.(۹۱)

مندرجہ بالا اقتباس کی رو سے تقسیم ہند کی صورت میں ہونے والی ہجرت میں ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد نے پاکستان سے بھارت ہجرت کی تھی۔ایک رائے کے مطابق ایک وقت میں ایک کروڑ انسان سفر میں تھے۔قتل و غارت گری اور مصائب سے دوچار ہونے والے لاکھوں لوگ تھے۔۱۹۴۷ء کے آخر تک ہجرت کا عمل تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اب بھی پینتیس سے چالیس ملین مسلمان بھارت میں باقی ہیں۔اس طرح بہت سے ہندو ابھی تک پاکستان میں بھی آباد ہیں۔دونوں میں سے کوئی ریاست بھی خالصتاً ہندو یا مسلمان آبادی کی نہیں ہے۔خاص طور پر پاکستان

لاکھوں بے گھر لوگوں کو اپنے اندر جزب کر چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق مہاجرین کی آمد کا سلسلہ پاکستان کے قیام کے بعد کئی مہینوں تک جاری رہا۔ ہندوستان کے ہر علاقے سے کچھ نہ کچھ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آتے رہے لیکن مہاجرین کی زیادہ تعداد پنجاب، یوپی کے علاقوں سے آئی تھی۔ اس کے علاوہ پاکستان آنے والے کی اُن مہاجرین کی تعداد زیادہ تھی جو حیدرآباد سے آئے تھے۔ اس کی یہ وجہ تھی کہ: ''حیدرآباد ریاست میں جنوری ۱۹۴۸ء کے دوران بھارتی ''پولیس ایکشن'' ہوا جس کے نتیجے میں مہاجروں کا ایک اور ریلا پاکستان کی طرف آنا شروع ہو گیا۔ ۱۹۵۷ کی مردشماری میں ۹۵،۰۰۰ مہاجر ایسے تھے جن کا تعلق ریاست حیدرآباد سے تھا۔'' (۹۲)

برِصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان اور افغانستان کی سرحد ڈیورنڈ لائن کے قریب افغانستان کی طرف سے مداخلت شروع ہو گئی تھی۔ کیوں کہ افغانستان نے پاکستان کی سرحدوں کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ افغانستان پیش قدمی کر کے دُرہ خیبر اور پشاور تک کے علاقے کو افغانستان میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ یاد رہے کہ افغانستان کے ساتھ حکومتِ برطانیا کا معاہد ۱۸۸۳ء میں ہوا تھا جس کی دوبارہ توسیع ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ اور حکومت برطانیا کے درمیان میں سرحدی معاہد کی صورت میں ہوئی تھی۔ ڈیورنڈ لائن اُس وقت سے قائم تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے وقت افغانستان کے سرحدی قبائل نے دراندازی شروع کر دی تھی۔ پاکستان کی سرحدوں کی خلاف ورزی کرنے کے لیے افغانستان نے باقاعدہ ایک تحریک چلائی تھی۔ اس معاملے کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ:

> کابل حکومت نے بھی افغان پاکستان سرحد کو تسلیم نہ کیا اور صاف ظاہر ہے کہ ان معاہدوں کو بھی جو کہ ۱۹ ویں صدی میں انگریز انتظامیہ اور افغان ارباب اقتدار کے درمیان طے پائے تھے۔ مزید براں افغانستان کی حکومت نے خدائی خدمتگار تحریک کی بھی کھلم کھلا حمایت کر دی اور نہ صرف پختونستان کے قیام کے لیے کی جانے والی تمام سرگرمیوں کو جائز قرار دے دیا بلکہ اقوامِ متحدہ کی رکنیت کے مسئلے پر بھی اس نے مخالفت میں ووٹ دیا۔ جوں ہی ۱۹۴۷ء میں انتقال اقتدار ہوا اس کے فوراً بعد ہی افغانستان کی جانب سے مسلح قبائلی سرحد پار کر کے پاکستان چلے آئے اور مسلسل پریشانی کا باعث بنے۔ (۹۳)

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ تقسیم کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بہت کم فوج ملی اس کی بنسبت بھارت کو زیادہ فوج ملی تھی۔ اسی وجہ سے پاکستان کو سرحدوں کا دفاع کرنے میں شروع شروع میں بڑی دقت کا سامنا رہا۔ لیکن جتنی فوج موجود تھی وہ محبِ وطن تھی جس وجہ سے ہر محاذ پر کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مقالہ نگار کارن آف کچھ اور کشمیر کے محاذ کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم افغانستان کی جانب کی سرحدوں کی بیک وقت حفاظت ایک طرح کی بڑی للکار تھی۔ آئین ٹالبوٹ نے تاریخِ پاکستان میں اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ:

> اس وقت پاکستانی فوج کافی ترقی کر چکی تھی اور اس کے پاس افرادی قوت بھی کافی زیادہ تھی لیکن تقسیم کے

وقت پاکستان کی فوج بیک وقت ہندوستان اور افغانستان کی جانب سے درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔ پاکستانی فوج کو اس کمزوری کا احساس ابتدا ہی سے تھا، لہٰذا ۵۰۰ انگریز افسروں کو ملازم رکھ لیا گیا تا کہ تکنیکی شعبوں میں اور سینئر فوجی عہدوں کے لیے اہل افراد کی خدمات حاصل کی جا سکیں۔ جب ہندوستانی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تو پاکستان کے حصے میں محض چھ آرمڈ رجمنٹ آئے جب کہ ہندوستان کے پاس ۴۰ آرمڈ رجمنٹ تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے پاس آرٹلری اور انفنٹری رجمنٹ بالترتیب ۴۰ اور ۲۱ تھے جب کہ پاکستان کو صرف آٹھ آرٹلری اور آٹھ ہی انفنٹری رجمنٹ ملے۔ بعد ازاں پاکستانی فوج کو غیر معمولی ترقی دی گئی لیکن غیر ملکی امداد پر انحصار کرتے ہوئے اور ترقیاتی سرگرمیوں پر اخراجات کم کر کے دفاع پر زیادہ سے زیادہ وسائل خرچ کر کے فوجی قوت کو بڑھانے کی سعی کی گئی۔ (۹۴)

تقسیم ہند کے نتیجے اور قیام پاکستان کی بنا پر پاکستان کو چاروں طرف سے دفاعی لحاظ سے خطرات لاحق تھے۔ ۱۹۴۸ء میں رن آف کچھ میں جنگ ہو چکی تھی۔ اسی دوران کشمیر کے محاذ پر بھارت پسپا ہو چکا تھا۔ جواہر لال نہرو کی سیاسی مکاری کشمیر میں ریفرنڈم کے نام سے سامنے آ چکی تھی۔ مشرقی سرحدوں پر پاکستان کو خطرات کا سامنا تو تھا ہی مگر مغربی سرحد یں جس کے ساتھ ایران اور افغانستان واقع تھے۔ ایران نے بظاہر پاکستان کی سرحدوں کے حوالے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ ایران اس معاملے میں خاموش رہا۔ ایران کے ساتھ ثقافتی اور تجارتی امور کے معاملات میں اختلافات تھے۔ مگر افغانستان نے سرے سے ہی پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ افغانستان نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ پاکستان کے افغانستان نے اندرونی معاملات اور سالمیت ہمیشہ خیال رکھا تھا۔ مگر افغانستان دوسروں کے مفاد کے لیے ہمیشہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان کے ساتھ حالات: ''۱۹۵۵ء میں انتہائی خراب ہو گئے جب کابل میں پاکستانی سفارت خانے پر حملہ ہوا اور ایسا ہی ایک موقع ۱۹۶۱ء میں بھی آیا۔ جب باجوڑ کے مقام پر پاکستان فوج کو افغان حملہ آوروں کے خلاف کاروائی کر کے انھیں پسپا کرنا پڑا۔'' (۹۵) درحقیقت پاکستان نے اپنا ہمسایہ ہونے کے ناطے سے کبھی بھی افغانستان کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اور نہ ہی کسی پلیٹ فارم پر افغانستان کے خلاف بیان بازی کی۔ مگر افغانستان نے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قیام کے بعد پاکستان کو اپنے دفاع کے معاملے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی۔ دفاع کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے: ''امریکا کے ساتھ سینٹو (۱۹۵۵ء) اور سیٹو (۱۹۵۴ء) کی صورت میں سمجھوتے اور چین دوستی بھی پاکستان کے ہندوستان کی بابت انہی خدشات کا نتیجہ تھے۔'' (۹۶) پاکستان اور بھارت کے مابین مسئلہ کشمیر کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ پانی کی تقسیم کا مسئلہ تھا۔ جس کو حل کرنے میں بہت زیادہ وقت لگا۔ تاہم:

انڈس واٹر تنازعہ بالآخر ستمبر ۱۹۶۰ء میں حل ہوا اور اس کامیابی میں جزوی طور پر ورلڈ بنک کا اثر و رسوخ

بھی شامل تھا۔انڈس واٹر ٹریٹی یا سندھ طاس اور چناب کے پانیوں پر پاکستان کا حق تھا۔ بین الاقوامی مالی امداد سے ۴۰۰ میل لمبی نہریں تعمیر کی گئیں جوان دریاؤں کا پانی ایسے علاقوں کو مہیا کرتی جنھیں ماضی میں دریائے راوی، ستلج، جہلم اور بیاس سے پانی مہیا کیا جاتا تھا۔اسی سکیم میں منگلا اور تربیلا ڈیموں کی تعمیر اضافی طور پر شامل کی گئی تھی۔(۹۷)

پانی کی تقسیم کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد بھی بھارت نے پاکستان کے ساتھ تعلقات کشید ہی رکھے۔ بھارت، آزاد کشمیر کی عوام پر گولہ باری کرتا رہتا تھا جس پر پاکستانی فوج منہ توڑ جواب دیتی تھی۔لیکن اس سے بھی بھارت کی تسلی نہ ہوئی تو اُس نے پاکستان کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں جنگ کے حالات پیدا کر کے ۶ ستمبر کو پاکستان پر حملہ مسلط کر دیا۔اس حملے سے بھی بھارت کو ایسا جواب ملا کہ اس کے بعد بھارت نے براہِ راست جنگ سے گریز کیا۔ تاہم جس وقت جنگ کی فضا گرم تھی اُس وقت ممتاز مفتی حج کے لیے حجاز میں موجود تھے اُن کا کہنا ہے کہ:''لاہور کی وہ خاتون جو ۱۸ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہے اور روضہ پاک کی جالی کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔اس نے بتایا کہ ۲ ستمبر کو میں نے حضورﷺ کو اس قدر پریشان حال دیکھا جیسا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔''(۹۸) ۱۸ کے ہندسے کو قیام پاکستان یعنی آزادِ پاکستان سے ۱۹۶۵ء تک حساب لگایا جائے تو اتنا ہی عرصہ بنتا ہے۔ پاک بھارت ۱۹۶۵ء کی جنگ پاکستان کے سفارتی حالات کوئی زیادہ اچھے نہیں تھے۔امریکا نے امداد کا جو وعدہ کیا تھا وہ کبھی بھی وفا نہیں ہو سکا۔ملائیشیا نے اس جنگ میں ہندوستان کی حمایت کی تھی جس کا:''پاکستان میں شدید ردِعمل ہوا تھا۔اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک برس کانفرس میں مقرارانہ کی عظمتوں، دل کے ولولوں اور آنکھوں کے شراروں کے ساتھ پاکستان کے ملائشیا سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کیا تھا۔''(۹۹) اصل میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کشمیر کو آزاد کرانے کا بڑا سنہری موقعہ تھا۔مگر پاکستان کی قیادت اسلحہ کی کمی کے باعث جنگ کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔مگر قدرت اللہ شہاب بھارت کے ساتھ جنگ کو طول دینے کے حق میں تھے انھوں نے صدر ایوب خان کو مشورہ دیا تھا کہ:''جنگ بندی سے متعلق مذاکرات کو غیر معمولی طول دے دیا جائے۔گفت وشنید میں جنگ بندی کے مقررہ وقت کو ٹال دیا جائے۔اگر جنگ بندی ضروری ہو تو عارضی تعطیل کے فوری بعد لڑائی از سرِ نو چھیڑ دی جائے۔''(۱۰۰) قدرت اللہ شہاب کے مراسلات اور مشورت سے ممتاز مفتی واقف تھے۔وہ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ:''۱۹۶۵ء کے سیز فائز سے بہت پہلے انھیں خبر دار کیا کہ سیز فائر نہ کیا جائے اور اگر امر مجبوری ہو تو چند گھنٹوں کے لیے۔پھر تاشقند سے پہلے انھیں لکھا گیا کہ وہاں نہ جائیں امرِ مجبوری ہو تو نمائندہ بھیج دیں،نہیں تو باعث تذلیل ہو گا۔لیکن صدر ایوب نے اس کے برعکس کیا۔''(۱۰۱) صدر ایوب نے وقت کی مصلحت کے مطابق ملک کی سالمیت کے لیے جو مناسب سمجھا فیصلہ کیا۔جنگ کو طول دینا ملک کی معیشت، سیاست، عوام اور فوج کو آگ میں جھونکنے کے برابر تھا۔ورنہ چین کی یہی خواہش تھی کہ پاکستان، بھارت کے ساتھ جنگ کو مزید طول دے۔اس کے لیے چین نے طریقہ کار بھی بتا دیا تھا جس کی وضاحت یوں ہے کہ:

ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو جو اس خفیہ دورے میں ان کے ساتھ تھے۔ چو این لائی کی پیش کش قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے کہ چین پاکستان کی غیر مشروط حمایت کرے گا۔ اگر پاکستان ایک طویل گوریلا جنگ لڑنے پر تیار ہو جائے جس میں ممکن ہے کہ لاہور جیسے شہر سے ہاتھ سے نکل جائیں لیکن بھارتی فوجیں عوامی مزاحمت کی دلدل میں ڈوب جائیں گی۔(۱۰۲)

جنگ کو طول نہ دینے کی ایک اور وجہ آئین ٹالبوٹ نے یہ بتائی ہے کہ: ''ایوب خان نے مغربی حلیفوں کی ناراضگی کے خوف سے چین سے خاطر خواہ استفادہ نہ کیا۔'' (۱۰۳) ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حالات واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ثریا حفیظ الرحمان لکھتی ہیں کہ:

ماڈرن پنڈت جی جب لنکا پر چڑھائی کا ذکر کرتے ہیں تو بھارت اور پاکستان کی جنگ کا ذکر ضرور کرتے اور اپنے آپ پر رقت طاری کرتے ہوئے بڑی گلوگیر آواز میں ہمیں سنانے کے لیے کہتے کہ پاکستان والے جنگ کے دوران بم گراتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ بم کسی مندر یا کسی گرجے پر گریں گے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی بمباری سے انبالے کے ایک گرجا گھر کی چھت اُڑ گئی تھی۔ (۱۰۴)''

پاکستان، بھارت کی جنگ کے دوران میں اہل بھارت خوف کا شکار ہو گئے تھے۔ جہاں تک مندروں کو بموں کا نشانہ بنانے کا تعلق ہے تو پاکستان نے سوائے سومنات کے مندر کے کسی اور مندر کو دانستہ طور پر نشانہ نہیں بنایا تھا۔ تاہم پاک بھارت جنگ کی وجہ آئین ٹالبوٹ نے یہ بیان کی ہے کہ:

اگست آرمی کی جھڑپیں جموں کے علاقے میں پیش قدمی کا ذریعہ بن گئیں اور پھر پاکستان آرمی کے ریگولر یونٹس اور ''مجاہدین'' بھی اس پیکار میں شامل ہو گئے۔ چھمب اور اکھنور میں پاکستانی دباؤ کا جواب دینے کے لیے بھارتی فوجوں نے (Grand Slam) کے نام سے ایک اضافی اپریشن کے تحت چھ ستمبر کی صبح پنجاب کے بارڈر پر لاہور اور سیالکوٹ کی طرف حملہ کر دیا۔(۱۰۵)

جہاں تک جنگ میں مفاہمتی پالیسی اختیار کرنے کی بات ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پاک بھارت جنگ میں پاکستان پر مغربی دنیا کو دباؤ بڑھتا جا رہا۔ دوسری طرف پاکستان نے قریب کے ہمسائے چین کو چھوڑ کر امریکا سے اسلحہ کی فراہمی کی امیدیں لگا دی تھی۔ پاک بھارت جنگ کے بعد دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات خراب رہے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی معاہدے بھی نہ ہو سکے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاک بھارت حالات معمول پر آئے تو پاکستان نے اپنی پہلی سفارت بھارت میں بھیجی جس کا ذکر ثریا حفیظ الرحمان نے یوں کیا ہے کہ: ''ہندوستان اور پاکستان کے مابین پریس کے تعلقات پندرہ سال سے بالکل ختم تھے۔ ۶۵ء کی جنگ کے بعد میرے شوہر حفیظ الرحمان کی اے پی پی کے نمائندے کی حیثیت سے دہلی میں پہلی تعیناتی تھی۔'' (۱۰۶) ثریا حفیظ الرحمان بھی اپنے شوہر کے ساتھ بھارت گئیں اور ایک عرصے

تک مقیم رہیں۔ ان کا ''جس دیس میں گنگا بہتی ہے'' سفرنامہ اسی دور کے سیاسی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

جیسا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد کے حالات پاکستان اور بھارت کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ پھر لائن آف کنٹرول اور ورکنگ بونڈری پر گاہے گاہے جھڑپیں ہوتی رہیں۔ لیکن بھارت نے سامنے آ کر حملہ کرنے کی دوبارہ کبھی جرأت نہیں کی۔ دوسری طرف بھارت کی سیاسی مکارانہ پالیسی ہمیشہ پاکستان کے لیے نقصان کا باعث بنتی رہی: ''۱۹۶۵ء کی جنگ نے اپنے اثرات واضح طور پر مرتب کیے سب سے بڑا اور اہم پہلو جغرافیائی دوری اور مشرقی بازو کے غیر محفوظ ہونے کا احساس شدت سے ابھرا، تصادم کے سترہ دنوں میں مشرقی بازو کو معیشت اور دفاع کے معاملات میں اس حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔'' (۱۰۷) بھارت نے مغربی پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے مشرقی پاکستان میں اپنی پالیسی تبدیلی کر دی۔ اس نے مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا شروع کیا۔ جہاں کہیں سیاسی اندازِ فکر ناکام ہو جاتی وہاں پر مکتی باہنی کے غنڈوں سے مدد لی گئی۔ پاک بھارت ۱۹۶۵ء کی جنگ کے کوئی چھ سال کی مدت کے بعد ۱۹۷۱ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر پیش قدمی کر کے پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش کو الگ ملک بنا دیا۔ صدیق سالک مشرقی پاکستان کے المیے کے چشم دید گواہ ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ۱۴ر دسمبر حکومتِ مشرقی پاکستان کا آخری دن تھا۔ اس روز گورنمنٹ ہاؤس کا ملبہ کیا بکھرا خود حکومت کا شیرازہ بکھر گیا بنگلہ دیش کی پیدائش ایک ایسے بچے کی ولادت تھی جسے ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا ہو۔ بھارت یہ آپریشن کر رہا تھا۔ اب اس میں صرف یہ مرحلہ تھا کہ کب مرجھائے ہوئے جنرل نیازی اور کملائے ہوئے پاکستانی دستوں سے ہتھیار ڈلوائے جائیں۔ (۱۰۸)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے حوالے سے ۱۹۶۲ء سے ہی سیاسی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ بنگلہ دیش کے سیاست دانوں کی کئی ایک خفیہ ملاقاتیں پاکستان مخالف ملک کی سیاسی قیادت سے ہو چکی تھیں۔ جیسا کہ: ''جولائی ۱۹۶۲ء میں مجیب الرحمٰن نے وہاں مقامی بھارتی لیڈروں سے خفیہ مذاکرات کیے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد عوامی لیگ کے لیڈروں اور بھارتی حکومت کے نمائندوں کے درمیان خفیہ مقامات پر متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔'' (۱۰۹) مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بہت سے اسباب ہیں۔ ان اسباب کی روک تھام کے سلسلے میں بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ: ''مکتی باہنی کی گوریلا کاروائیاں تھیں جن میں مون سون کے بعد تیزی آ گئی۔ ڈھاکہ میں اہم تنصیبات اور چٹاگانگ کی بندرگاہ کو نشانہ بنایا گیا۔ ریلوے نظام معطل ہو گیا کیوں کہ صوبہ بھر میں اہم پل مکتی باہنی نے تباہ کر دیئے تھے۔'' (۱۱۰) حقیقت میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی سیاسی سطح کی بہت بڑی خود غرضی اور ناقابلِ تلافی غلطی تھی۔ بنگلہ دیش میں مجیب رحمٰن کی خودسری اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی بے رخی اور بے توجہی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر حکیم محمد سعید کہتے ہیں کہ: ''اگر ہم مشرقی پاکستان میں سیاسی غلطیاں نہ کرتے اور اس علاقے سے جنوب مشرقی ایشیا کو اپنا دوست بناتے تو ہندوستان کو اپنے اثر و نفوذ کی وجہ

سے پاکستان کے خلاف حالات پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔''(۱۱۱) حکیم محمد سعید کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کمزور تھی جس کا خمیازہ سیاسی اور عسکری اور اقتصادی طور پر پاکستان کو بھگتنا پڑا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، برما، ویت نام، فلپائن اور جاپان وغیرہ سے سفارتی تعلقات مضبوط ہوتے تو یہ ممالک مشکل وقت میں پاکستان کی عسکری نہ سہی سفارتی معاونت ضرور کر سکتے تھے۔ بہر کیف مشرقی پاکستان کے حوالے سے مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کی ایک سیاسی غلطی یہ تھی کہ بھٹو نہیں چاہتے تھے کہ مجیب الرحمٰن انتخابات میں سادہ اکثریت حاصل کر کے پورے مشرقی اور مغربی پاکستان کے وزیرِ اعظم بن جائیں۔ بھٹو نے مجیب الرحمٰن سے سیاسی طور پر بھی مفاہمت کی پالیسی کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ جس کا اظہار دبے لفظوں میں مستنصر حسین تارڑ نے اس طرح کیا ہے کہ:

> ہم پاکستانی جغرافیے کو اِدھر اُدھر کرنے کے ماہر ہیں جناب عالی.... آپ نے دیکھا کہ کانفرنس میں بنگلہ دیش کا وفد جو ہمارے جغرافیے کا حصہ تھا وہ بھی ذرا اِدھر اُدھر ہو گیا ہے اور ہم نے اِن کو ادھر کر کے اِدھر ہم اور اُدھر تم ایک نیا پاکستان بنالیا تھا اور پچھلے دنوں اُس پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کیسی ڈھٹائی اور نابینائی مناتے تھے... اگر چہ یہ اس پاکستان کی چھبیسویں سالگرہ تھی۔(۱۱۲)

درحقیقت ذوالفقار علی بھٹو کا بنیادی نعرہ یہی تھا کہ تم مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں حکومت کرو ہم مغربی پاکستان میں حکومت کریں گے۔ اس سیاسی دیدہ دلیری کے پیچھے جنرل یحیٰی کا ہاتھ تھا۔ جس کی وجہ سے مجیب الرحمٰن نے: ''۱۷ اور ۱۸ جنوری کو لاڑکانہ میں یحیٰی اور بھٹو کے درمیان ملاقات کو فوج اور پیپلز پارٹی کے درمیان گٹھ جوڑ کا نام دے دیا۔''(۱۱۳) جنرل یحیٰی کی ڈھاکہ سے روانگی اور کراچی، پاکستان آمد کے بعد لاڑکانہ میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کا ذکر صدیق سالک نے اس طرح کیا ہے کہ: ''جنرل یحیٰی خان ایک دن کراچی میں ستانے کے بعد سیدھے لاڑکانہ پہنچے جہاں ذوالفقار علی کے مہمان بنے۔ بھٹو یحیٰی خاں کے دورہ ڈھاکہ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ کسی ایسی مصالحت کے حامی نہ تھے جس میں انھیں اور ان کی پارٹی کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ بھٹو نے یحیٰی اور ان کے ساتھیوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔''(۱۱۴) یحیٰی اور بھٹو کی ملاقات اس خواہش سے خالی نہیں تھی کی مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان کا وزیر اعظم نہ بنے۔ اس لیے: ''جنرل یحیٰی مغربی پاکستان میں اپنی حکومت قائم رکھنے کی غرض سے ایسٹ پاکستان کو دشمنوں کے حوالے کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔''(۱۱۵)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایسی تذلیل ہے جو تا حیات بھلائی نہیں جا سکتی۔ یہ ہر انداز اور ہر زاویے سے یاد آ جاتی ہے۔ کبھی ۹۳ ہزار قیدیوں کی قید میں ذلت کی صورت میں۔ کبھی مکتی باہنی کی دہشت گردی کی صورت میں جو دوسرے کے گھر میں گھس کر بم دھماکے اور دوسری کاروائیاں کرتے تھے۔ لوگوں کا ناحق قتل کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ سفر نامہ نگار ابن انشا پاکستان کے حالات وواقعات کے بارے میں جاپان کی مثال دے کر ایک اہم موضوع کی طرف اشاری کرتے ہیں کہ:

''جو کمال جاپان والوں نے انفرادی خودکشی میں پیدا کیا ہے۔ وہ ہم نے اجتماعی خودکشی میں حاصل کی ہے۔ اور اس میں چھوٹے بڑے سبھی شریک ہیں۔ وہ بھی جو ۹۳ ہزار فوجوں کو دشمن کی قید میں جا کر پھنساتے ہیں وہ بھی جو بسوں کو جلاتے ہیں۔ وہ بھی جو کارخانے بند کر کے اور ہڑتالیں کرا کے ملک کو اقتصادی طور پر مفلوج کرتے ہیں...... معلوم ہوا سب اپنے ہیں۔'' (۱۱۶) درحقیقت مشرقی پاکستان کا تحفظ ناممکن تھا۔ مشرقی پاکستان کا دفاع کئی ایک مہرینوں اور سیکڑوں جزیروں اور بیسیوں بندرگاہوں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ دانشور کا قتل عام کا مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں واقعہ رونما ہوا، یوں تو اس طرح کے بہت سے واقعات تھے جن کے پیچھے بے شمار دردناک کہانی تھیں۔ اس طرح کے واقعہ کی عکاسی کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ کرتے ہیں کہ: ''ہتھیار ڈالنے سے ایک روز پیشتر فوج نے جب بنگالی دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کو شب کی تاریکی میں گھروں سے نکال کر ہلاک کر دیا تھا اور ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی وہ اُنھیں کیسے بھول جائیں۔'' (۱۱۷) ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کے قتل کی داستانیں بڑی طویل ہیں جو کہیں نہ کہیں سفر نامہ نگاروں کے احاطہ تحریر میں آتی رہتی ہیں۔ اسی طرح ایک واقعہ انتظار حسین پنا قیصر کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ: ''ڈھاکہ کے فال سے صرف دو دن پہلے یہ واقعہ ہوا۔ رات کو دستک ہوئی میرے شوہر باہر گئے۔ دیر تک واپس نہ آئے تو میں پریشان ہوئی۔ پھر واپس ہی نہیں آئے۔'' (۱۱۸) جس خاتون کا انتظار حسین نے سقوطِ ڈھاکہ کے مضمرات میں ذکر کیا ہے، اس خاتون کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام ''شومی'' تھا۔ اس کا باپ ایک صحافی تھا جسے قتل کیا گیا تو وہ بہت کم سن تھی۔ لہٰذا اُسے اپنے والد کی شکل وصورت بھی یاد نہیں تھی۔ انتظار حسین نے جس کا ذکر یہاں ان درد بھرے الفاظ میں کیا ہے کہ: ''اے ء کے نامبارک سال میں پیدا ہونے والی ایک بچی جس کے دنیا میں آنے کے ساتھ اس کا باپ چلا گیا۔ اب وہ پاکستان سے آنے والے ایک اجنبی سے پوچھ رہی تھی۔ ''انکل'' آپ میرے ابو کو جانتے تھے۔'' (۱۱۹) یاد رہے کہ دورہ بھارت کے دوران انتظار حسین کی ملاقات پنا قیصر سے ہوئی تھی جن کے شوہر شہید اللہ قیصر تھے جنھیں بنگلہ دیش میں دانشور صحافی ہونے کے جرم میں شہید کر دیا گیا تھا۔ انتظار حسین کو آکسفورڈ کے ایشین کلچرل فورم آن ڈیویلپ منٹ اور ایشیا کے نیٹ ورک کلچر کی طرف سے بلائے جانے پر بھارت کے سفر پر گئے تھے۔ انتظار حسین کی ملاقات جب بنگلہ دیشی وفد سے ہوئی تو پنا قیصر نے اپنے شوہر کے بارے میں دریافت کیا جس کا نام سن کر انتظار حسین نے لکھا کہ: ''اچھا آپ شہید اللہ قیصر کی بیگم ہیں۔ دیکھئے ان سے میری ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کے ایک مشہور صحافی اور مشہور لکھنے والے کی حیثیت سے میرے لیے اور ادھر ہم سب کے لیے وہ بہت ہی جانی بوجھی شخصیت تھے۔'' (۱۲۰)

بنگلہ دیش کے ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور اپنے خیالات کا اظہار کھلے عام کرتے تھے جس کی وجہ سے تقسیم مشرقی پاکستان کے مسئلے کو اور زیادہ تقویت ملتی تھی۔ حقیقت میں سقوطِ ڈھاکہ دانشوروں کے تصورات کی تکمیل کا دوسرا نام تھا، کیوں

کہ: ''مشرقی بازو میں زندگی کی یکسانیت سے تنگ بنگالی دانشور اپنے مسائل کا خارجی اظہار چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اسے خیر وشر کی جنگ کا نام دے کر اپنے جذبات کو تسکین دی جب کہ مذہبی عنصر نے اسے اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ بنا کر کسانوں کو پُر جوش کر دیا۔'' (۱۲۱) مشرقی پاکستان کے ادیبوں، دنشوروں اور صحافیوں کے قتل عام کا دکھ پاکستان کے اہل قلم کو بھی اُسی طرح ہوا تھا جس طرح اہل بنگلہ دیش کو ہوا تھا۔ ایسے ہی ایک تاریخی راز کا ذکر مستنصر حسین تارڑ نے یوں کیا ہے کہ: ''سبھی ''ٹائیگر'' تو نہیں تھے۔ اُن میں ٹیگور کے گیت گانے والے بھی تھے نذرل کے شیدائی بھی تھے.. بلوچ ایسے سپاہی بھی تھے جنھوں نے ہتھیار اُٹھا کر آپ کو ہلاک کرنے سے انکار کیا تھا اور کورٹ مارشل کے سزاوار ہوئے تھے.. ہم سب تو ایسے نہ تھے۔'' (۱۲۲) قاضی نذرل السلام ادیب، شاعر ہونے کے علاوہ صحافی بھی تھے۔ لیکن ان کی شہرت، ڈرامہ اور افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ عمدہ شاعری کی وجہ سے بھی ہے۔ جس کی وضاحت انٹرنیٹ میں اس طرح ہے:

> When critics evaluate the contributions of a versatile genius like Kazi Nazrul Islam, most of them focus on his poems, short stories, novels, dramas, essays and songs. But apart from literary creations and music, there are a few features of his life which are significant, yet remain less talked about. His short career as a journalist is one of such aspects.(۱۲۳)

اگر قاضی نذر السلام جن کا ذکر مستنصر حسین تارڑ نے کیا ہے کو ایک صحافی کے طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک اخبار میں لکھتے تھے۔ اگر چہ انھوں نے زیادہ دیر تک اخبار میں کام نہیں کیا تھا۔ وہ ایک طویل عرصہ کوئی ۳۴ سال تک بیمار رہے۔ ان کی شعر گوئی ختم ہو گئی اور بول چال بھی نہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی مشکل کا شکار رہی۔ انھوں نے بہادوں کی ۱۲/ تاریخ بنگالی تقویم کے حساب سے سال ۱۳۸۳ اور سنہ عیسوی کے حساب سے ۲۹/ اگست ۱۹۷۶ء میں ڈھاکہ میں وفات پائی۔ قاضی نذر السلام کے بارے میں یہ تفصیل انٹرنیٹ سے حاصل شدہ ہیں:

> Nazrul began working for the newspaper but couldn't continue for a long period of time as he became ill and lost his voice and memory. For 34 long years, from July 1942 to August 1976, the poet underwent an unbearable life of silence. He died on 12 Bhadra of Bangla calendar year 1383 (August 29, 1976) in Dhaka.(۱۲۴)

مشرقی پاکستان کے اہل قلم کے قتل کی منصوبہ بندی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا، تاریخ میں اس بارے میں خاموش چھائی ہوئی ہے۔ امکان ہے بنگلہ دیش کے ادیبوں کی فہرستیں مغربی پاکستان کے کسی ادیب یا صحافی نے تیار کی ہوں لیکن

جہاں تک ان کے قتل کی منصوبہ بندی کا تعلق ہے تو اس میں میجر جنرل جمشید کا کردار پیش پیش تھا۔صدیق سالک نے اس اہم راز کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ:

> یہ غلیظ کمبل اوڑھے، گھٹے کپڑوں کو پوٹلی بغل میں دبائے غسل خانے سے سیل کو جانے لگا تو ساتھ والے سیل کے باہر تام چینی کی بجائے اصلی چینی کی سفید مستعملہ پلیٹ، چمچ اور گلاس نظر آئے۔ برتنوں کی اعلیٰ نسل سے اندازہ ہوا کہ میرے دائیں ہاتھ یعنی سیل نمبر ۱۱ میں کوئی وی آئی پی ہے۔ یہ میجر جنرل جمشید تھے۔جن کی کمی فورٹ ولیم میں محسوس کی گئی تھی۔ ڈھاکہ کے حاکم اعلیٰ ہونے کی وجہ سے ان پر ایک تہمت یہ بھی ہے کہ ۱۶ دسمبر کو دانشوروں کا قتل ان کی منصوبہ بندی اور احکام کا نتیجہ تھا۔(۱۲۵)

مشرقی پاکستان کے جدا ہونے کا جو غم و رنج مغربی پاکستان کی عوام کو تھا اُس کے ردِعمل کا اظہار اُس وقت کہ مظاہروں میں نظر آتا ہے۔انھیں ہی مظاہروں کی وجہ سے جنرل یحیٰی نے صدارت کی کرسی کی خواہش ترک کر دی تھی۔ جہاں تک ادبا، شعرا اور صحافی برداری کے ردِعمل کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے ردِعمل کا اظہار زندہ صورت میں اپنی تحریروں میں کیا ہے۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجہ سے مغربی پاکستان کا قلم کار جس دکھ اور کرب سے گزر رہا تھا۔اس کی کئی ایک منفرد مثالیں ہیں جن میں سے ایک محمد اجمل ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:''سقوطِ ڈھاکہ ہماری ذلتوں کی کہانی ہے۔مگر ہم نے جنگ ہاری نہیں۔کوئی یہ بتائے کہ جنگ بندی یا ہتھیار ڈالنے کی عالمی سازش سے پہلے بھارتی فوجوں نے ہماری ایک انچ زمین پر قبضہ کیا تھا۔وہ سرحدوں پر گیدڑ بھلیاں دیتے رہے،''ٹائیگر'' کی موت کے بعد وہ شہر میں داخل ہوئے۔''(۱۲۶) انتظار حسین نے مشرقی پاکستانی کی جدائی کا اظہار اپنے انوکھے انداز میں اس طرح کیا ہے کہ:''پاکستان ٹوٹنے کا سانحہ۔شکست۔مگر فتح و شکست کا کھیل تو چلتا ہی رہتا ہے۔یہاں پاکستان نے خالی اپنا آدھا حصہ گم نہیں کیا، اپنی روح کو بھی گم کر دیا۔''(۱۲۷) پاکستان کے سفرنامہ کے مصنف نے خاص طور پر مشرقی پاکستان کے المیے کا براہ راست اثر قبول کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ تاریخ پاکستان میں اس زمرے میں لکھا ہے کہ:''ہارون الرشید کے تجزیہ کے بالکل برعکس مغربی پاکستان کے مصنفین قیام بنگلہ دیس کو ایک سازش قرار دیتے ہیں۔مثلاً قطب الدین عزیز بھارت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ باغی مکتی باہنی اور بھارتی مداخلت نے علیحدگی کو ممکن بنایا۔''(۱۲۸) بنگلہ دیش کے قیام پر ایک چینی دانشور کا چواین لائی کا کہنا ہے کہ:''اس میں بھارت کے ٹکڑے ہونے کی ابتداء ہے۔''(۱۲۹) پاکستانی سفرنامہ نگار ادیب کی تحریروں میں مشرقی پاکستان کی بازیافت کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔جس کا ایک مقام پر مستنصر حسین تارڑ نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ:''دسمبر جدائی کا اور رسوائی کا مہینہ تھا اور اُسے نہ بھولتا تھا..اور جب ڈائننگ روم میں بنگلہ دیشی وفد کی خواتین داخل ہوئیں تو مجھے وہ جدائی وہ دہائی پھر سے یاد آئی۔..وہ میرے وطن کی تھیں جس کی علیحدگی میں میرا کوئی دوش نہ تھا۔''(۱۳۰) مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سلسلے میں محمد اجمل نیازی نے قیام پاکستان کی اساس کے نازک مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر:''اندرا

نے خلیج بنگال میں نظریہ پاکستان کے ڈبونے کا اعلان کر دیا تھا تو پھر دشمن کی کشتیوں میں اپنے آپ کو بچا کر لانا زندگی تو نہیں۔''(۱۳۱) درحقیقت مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے نظریہ پاکستان کو ٹھیس ضرور لگی ہے۔ مگر یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ نظریہ پاکستان سرے سے ہی ناکام ہو گیا ہے۔ نظریہ پاکستان اور مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے الگ ہونے سے نہیں ختم ہوا۔ آج بھی سابقہ مشرقی پاکستان میں مسلمان ہی آباد ہیں جن کا مذہب، زبان، رہن سہن، ہندوؤں سے جدا ہے۔ تہذیب اور ثقافت الگ ہے۔ البتہ بنگلہ دیش کے قیام سے جغرافیائی طور ضرور تبدیلی رونما ہوئی ہے مگر نظریہ آج بھی بنگلہ دیش کا بھارت سے جدا ہے اور موجودہ پاکستان کا نظریہ ابھی تک وہی ہے جو قیام پاکستان کے وقت تھا۔ یہ بھارت کی خام خیالی ہے کہ: ''بنگلہ دیش بننے سے نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بھارت سے محاذ آرائی تو درکنار پاکستان کے لیے وجود قائم رکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ تم تو قیدِ تنہائی میں ہو، ذرا باہر کی خبریں سنو تو حیران رہ جاؤ کہ دو قومی نظریہ دم توڑ چکا ہے اور پاکستان کے باقی صوبوں میں علیحدگی کی تحریکیں زور پکڑ گئی ہیں۔''(۱۳۲) مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش نے نام سے علیحدہ اور خود مختاری کو ہوا دے کر الگ ہو چکا تو بھارت کی ناپاک نظریں ملک کے دوسرے صوبوں کی طرف مرکوز ہوئیں۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کی وجہ سے مغربی پاکستان کے صوبوں میں تھوڑی سے بے چینی ضرور پھیلی جس کا تعلق وفاق کی سیاست سے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ پاکستان کے باقی صوبے بھی علیحدگی چاہتے ہوں۔ آئین ٹالبوٹ کی تاریخ پاکستان کی رو سے دیکھیں تو یہ صورتِ حال کچھ اس طرح تھی:

> جنرل گل حسین نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ..... ''بھٹو منقسم مزاج، دروغ گو اور نمائش پسند تھے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جے یو آئی کی مخلوط حکومتیں گرانے میں ان کے جوڑ توڑ نے وہی کردار ادا کیا جو کسی مارشل لا دور میں استبدادیت کرتی ہے۔ بلوچستان میں قبائلی بغاوت بھڑک اُٹھی جسے کچلنے کے لیے فوج کو استعمال کرنا پڑا جب کہ سرحد میں حالات اتنے خراب ہو گئے۔ کہ ولی خان اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری اور نیپ پر پابندی جیسے اقدامات کرنے پڑے۔(۱۳۳)

جنگ کے دوران قید میں صدیق سالک کے تفتیش کرنے والے یہ خیالات بالکل خام ہیں۔ دراصل تقسیم بنگلہ دیش سے نہ تو دو قومی نظریہ ختم ہوا ہے اور نہ ہی نظریہ پاکستان کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ بلکہ بھارت کے اس کے مکارانہ رویے: ''نے اُنھیں دو قومی نظریے اور پاکستان کے مزید قریب کر دیا ہے۔ وہ بھارت میں عدم تحفظ محسوس کرتے ہیں۔ پاکستانی فلمیں بنگلہ دیش میں نہیں دکھائی جاتیں مگر ہمارے اداکار آج بھی وہاں روز اول کی طرح مقبول ہیں۔''(۱۳۴) جہاں تک مغربی پاکستان میں صوبوں میں علیحدگی کی تحریکوں کی افواہ کا تعلق ہے تو بھارتی انٹیلی جنس محض بدظن اور گمراہ کن سوچ رکھے ہوئے ہیں، جیسے رویے سے آگے نہیں نکل سکی۔ ون یونٹ منصوبہ ختم کرنے کا مقصد جہاں صوبائی خود مختاری کے لیے ضروری تھا وہاں پر صوبوں میں انتظامی امور کو بہتر طور پر چلانے کے لیے بھی ضروری تھا۔ اسی لیے جنرل یحییٰ نے ون یونٹ کو ختم کرنے

کا اعلان کیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی دو بڑی وجوہات تھی۔ ایک سیاسی وجہ جس کا ذکر ذوالفقار علی بھٹو کے زمرے میں ذکر آچکا ہے۔ دوسری عسکری وجہ، مراد یہ کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی شعور ترقی یافتہ تھا۔ اسی وجہ سے فوجی حکومتوں کے خلاف ردِعمل ابھرا، علی سفیان آفاقی لکھتے ہیں کہ:

> صدر ایوب خان کا مارشل لاء طول کھینچتا جا رہا تھا اور اس کے خلاف مشرقی پاکستان میں جذبات خاصے مشتعل تھے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے بارے میں عام تاثر ہیں تھا کہ وہ فوجی حکومت برداشت نہیں کرتے چنانچہ بعد میں بنگلہ دیش کے قیام کا سبب بھی یہی قرار دیا گیا کہ ملک میں بہت عرصے تک مارشل لاء قائم رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی وہاں صحیح معنوں میں جمہوریت بہت کم عرصے رہے۔(۱۳۵)

موجودہ بنگلہ دیش کے کی علیحدگی کا کرب پاکستانی ادیب کو جس قدر ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کے سانحہ کی بازیافت مستنصر حسین تارڑ اس طرح کرتے ہیں کہ:

> بنگلہ دیشی وفد کی خواتین فوارے کے روپہلی کرنوں والے چمکتے منظر والی شیشے کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھی تھی اور اُن میں دو ایسی تھیں جنھوں نے نہایت اہتمام سے اپنے سر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے باوجود ہم انھیں مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے...... یہ تب کی بات ہے جب پاکستان، پاکستان تھا اور منبر و مسجد سے سیاست کی سٹیج سے یہی اعلان کیا جاتا تھا کہ یہ پاکستان تو بعد قیامت تک قائم رہے گا۔ بس یہ الگ بات ہے کہ وہ قیامت صرف چوبیس برس بعد ہی آ گئی تو تب کی بات ہے کہ انھیں ہم مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہارمونیم پر اپنے دریاؤں کے گیت گاتے تھے اور اللہ بارش دے کے بجائے اللہ میگھ دے پکارتے تھے۔ جو سراسر نظریۂ پاکستان کے خلاف تھا۔(۱۳۶)

موجودہ بنگلہ دیش کو پاکستان سے الگ ہوئے کوئی اب تک پچاس سال ہو چکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی تحریر نیپال نگری کوئی ۲۰۱۴ء کا سفرنامہ ہے۔ لہٰذا اس عرصے کے دوران کی جانے والی بنگلہ کی ترقی رونما ہونے والی تبدیلی کا نقشہ مستنصر حسین تارڑ نے ان الفاظ میں کھنچا ہے کہ:

> آج سیاست کا ہر طالب علم کہ وہ اپنے ملکی معاملات ہم سے بہتر طور پر چلا رہے ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی کنٹرول کر لیا ہے اور ہم کہتے کہ بنگالی بچے پیدا کرنے سے باز نہیں آ سکتا۔ اُن کی معیشت بہتر ہے اور اُن کا بینکنگ سسٹم تیسری دنیا میں ایک مثال کے طور اپنایا جا رہا ہے....اُن کے خزانے میں پاکستان سے دوگنے ذخائر ہیں، اور وہ اپنے ایئرپورٹس، کارپوریشنیں، بجلی گھر، موٹروے اور کارخانے غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی ناکام کوشش نہیں کر رہے.....البتہ وہ ایک میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اُن کا ممبر پارلیمنٹ اتنا بے چارہ ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شمولیت کے لیے

سائیکل، رکشے یا کسی کھٹارہ کار میں آتا ہے بلکہ پیدل بھی آتا ہے....(۱۳۷)

بنگلہ دیش تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے مشرقی پاکستان سے بہت آگے تھا اسی لیے پاکستان سے الگ ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر بنگلہ دیش کے پاس آمدن کے وسائل بے شمار ہیں۔ اگر چہ معاشی لحاظ سے بنگلہ دیش نے اُس سطح کی ترقی نہیں کی لیکن بنگلہ دیش کی معیشت پاکستان کی نسبت مستحکم ہے۔ وہاں غربت اور افلاس کے مسائل پاکستان کی طرح کے ہیں۔ جب تک کسی ملک سے بدعنوانی کی لعنت ختم نہیں ہوتی کسی ملک میں معاشی ترقی کا خواب دیکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ بنگلہ دیش کی ایک منظر کشی علی سفیان آفاقی نے اپنے اندازِ بیان میں کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: ''بنگلہ دیش میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ڈھاکہ زیادہ بڑا خوبصورت اور ماڈرن ہوگیا ہے۔ ایک محدود طبقے کے لوگوں کے پاس دولت کی ریل پیل ہے مگر عام لوگوں کی بدحالی بڑھ چکی ہے۔ غربت اور افلاس انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اردو بولنے والے لوگ بہت کم ہیں ملے۔ ان میں بیشتر کا تعلق پرانی نسل سے ہے۔(۱۳۸) بنگلہ دیش کے مذہبی اور تمدنی پہلو پر مستنصر حسین تارڑ روشنی ڈالتے ہی کہ: ''اگر چہ ہم انھیں مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے لیکن بنگلہ دیش کے وفد کی خواتین میں سے دو ایسی تھیں'' جو اپنے سر کو ڈھانپے ہوئے تھیں اور پاکستانی وفد کی خواتین ننگے سر تھیں کیوں کہ ہم اُن سے بہتر مسلمان تھے۔''(۱۳۹) بنگلہ دیش کے سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور کو مجموعی طور پر مستنصر حسین تارڑ اس سے بیان کرتے ہیں کہ:

> اقبال اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ایک مرتبہ پھر نظریہ پاکستان کے منافی عمل تھا... یہاں تک کہ ہندو ٹیگور کی شاعری کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور ان کی خواتین ساڑھیاں باندھتی تھیں جو ایک باپردہ لباس نہ تھا اور اُن کی اردو نہایت ہی کمزور تھی اور انگریزی کا لہجہ بہت خراب تھا اور اُن کی رنگت نیم سیاہ تھی اور قد چھوٹے تھے۔ اور ہماری مسلمانی کا معیار جدا تھا۔ ایک اچھا مسلمان صرف شلوار قمیض پہنتا ہے، موسیقی کو حرام سمجھتا ہے، اُس کی اردو کا شین اور قاف درست ہوتا ہے۔ انگریزی اکسونین لہجے میں بولنے کی سعی کرتا ہے، دراز قد اور کھلی رنگت کا ہوتا ہے چنانچہ وہ ہمارے معیار پر نہیں اُترتے تھے۔(۱۴۰)

سقوطِ ڈھاکہ کے معاملے کو جب بزدلانہ اور غیر سنجیدگی سے حل کیا گیا تو واقعہ پاکستانی کی توقعات کے بالکل خلاف تھا۔ جنرل نیازی کو اپنی عسکری کمزور کا اندازہ تھا۔ تحت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کے اصول کے تحت جنگ میں بغیر اسلحہ کے جنگ لڑتے ساری فوج جنگ کی بھٹی میں جھونک دیتے تو پھر بھی عوام انھیں بُرا کہتی۔ جنرل نیازی نے اگر کسی مصلحت کے تحت ہتھیار ڈالے اور افواجِ پاکستان کو قید کے بعد رہائی ملی تو اس صورت میں بھی جنرل نیاز پر کڑھی تنقید کی گئی۔ درحقیقت جنرل نیاز جنرل یحییٰ کے تابع اور اُنھیں جواب دہ تھے۔ ہتھیار ڈلنے کی صورت حال کی رپورٹ بھی جنرل نیازی نے جنرل یحییٰ کو لکھ بھیجی تھی: ''ادھر جنرل نیازی بھی اب غیر ملکی امداد سے نا اُمید ہو چکے تھے۔ انھوں نے اب حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے صدرِ مملکت کو...... جو کمانڈر انچیف بھی تھے...... سچی سچی رپورٹ بھیج

کر ہدایات کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔''(۱۴۱) جنرل نیازی کو دورانِ جنگ ہتھیار ڈالنے کے بارے میں کیوں کر سوچنا پڑا۔ اس کے ذیل میں بہت سارے سوالات جنم لیتے ہیں۔ ممکن ہے اسلحہ کی کمی؛ فوجی برتری کا فقدان؛ سرحدوں، دریاؤں اور شاہراہوں کے دفاع کا مسئلہ درپیش ہو۔ تاہم جو بھی صورتِ حال ہو ہتھیار ڈالنے کا معاملہ کسی فردِ واحد کے بس کا کام نہیں تھا، بلکہ: ''جنرل حمید نے جنرل نیاز کو جنگ بندی کا جو مشورہ دیا تھا موصوف نے اسے منظوری سمجھ لیا اور اپنے چیف آف سٹاف بریگیڈیر باقر صدیقی کو حکم دے دیا۔ کہ وہ تمام ماتحت جرنیلوں اور بریگیڈیروں کو جنگ بندی کی ہدایات دے دیں...... اس ہدایت نامے میں سرنڈر (SURRENDER) کا لفظ کہیں نہیں تھا، صرف آخر میں ایک جملہ یہ تھا: ''بدقسمتی سے اس اہتمام میں ہتھیار ڈال دینا بھی شامل ہے۔''(۱۴۲) جنگ بندی کی خواہش کرتے ہوئے جنرل نیازی نے جو رپورٹ مغربی پاکستان جنرل یحیٰی کو بھیجی تھی۔ جنرل یحیٰی نے اس کا جواب جس استدلال سے دیا وہ یوں ہے:

> اگلے دن جنرل یحیٰی نے گورنر جنرل نیازی کو جنگ بندی اور لوگوں کے جانی تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کا حکم دے دیا۔ جنرل نیازی کے نام جنرل یحیٰی نے لکھا: ''گورنر جنرل مجھے مل گیا ہے۔ آپ نے نہایت کٹھن حالات میں دلیرانہ جنگ لڑی ہے۔ قوم کو آپ پر فخر ہے۔ دنیا آپ کی تعریف کر رہی ہے۔ جہاں تک انسان کے بس میں ہے میں نے مسئلے کا قابلِ قبول حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب آپ ایسے مرحلے میں ہیں جہاں نہ مزید مزاحمت ممکن ہے اور نہ اس مزاحمت سے کوئی سودمند مقصد حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے مزید جان و مال کا نقصان ہوگا۔ آپ کو ان حالات میں مسلح افواج مغربی پاکستان کے رہنے والوں اور دوسرے وفادار لوگوں کی سلامتی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اس اثنا میں اقوامِ متحدہ سے درخواست کی ہے۔ وہ ہندوستان سے مشرقی پاکستان میں جنگ بند کرنے کو کہے اور اس سے ہماری مسلح افواج کے علاوہ تمام لوگوں کے تحفظ کی ضمانت مانگے جو شر پسندوں کی معاندانہ سرگرمیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔(۱۴۳)

پاکستان سے جنرل یحیٰی خاں سے جنگ بندی کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد جنرل نیازی نے جنرل فرمان کو بلایا تاکہ وہ بھارت چیف آف سٹاف کے نام جنگ بندی کا پیغام لکھ کر ارسال کریں۔ تاہم جنرل فرمان نے حکم کی بجا آوری کے لیے: ''ایک لیڈی سیکرٹری کا بلوا کر جنرل فرمان نے ایک صفحے کا نوٹ لکھوا دیا۔ جس میں بعض تحفظات کی شرط کے ساتھ جنگ بندی کی پیش کش کی گئی تھی۔ شرئط یہ تھی۔ (الف) مسلح افواج کا تحفظ (ب) مکتی باہنی کی انتقامی سرگرمیوں سے وفادار شہریوں کا تحفظ اور (ج) بیماروں اور زخمیوں کا تحفظ۔''(۱۴۴) جنگ بندی معاہدے کی جو تحریر جنرل فرمان نے لکھی تو وہ ایک تحریر امریکا کے جنگی ثالث نمائندے مسٹر سپیوک کو دی گئی۔ امریکی نمائندے نے:

> پیغام جنرل مانک شا کو بھیجنے کے بجائے اپنی حکومت کو واشنگٹن روانہ کر دیا تھا۔ جہاں پر امریکی حکومت کسی قسم کی کاروائی کرنے سے پہلے یحیٰی خاں سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ یحیٰی خاں اس رات اتنے مصروف تھے

کہ امریکیوں کے ہاتھ نہ آ سکے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ۳ دسمبر ہی سے مشرقی پاکستان میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ انھوں نے دفتر میں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ عموماً ان کا ملٹری سیکرٹری نقشے پر جنگ کی تازی ترین صورتِ حال لگا کر ان کے پاس لے جاتا جس پر وہ کبھی کبھی نگاہِ غلط انداز ڈال لیتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مشکل جنگی حال دیکھ کر اتنا کہا تھا: '' میں مشرقی پاکستان کے لیے کر بھی کیا سکتا ہوں۔ (۱۴۵)

جنگ بندی اور ہتھیار حوالگی کے حوالے سے صدیق سالک نے زیرِ نظر اقتباس میں یوں تفصیل بیان کی ہے:

'' میجر جنرل جیکب اپنے ساتھ ایک دستاویز لائے جسے سقوط کی دستاویز (INDTRUMENT OF SURRENDER) کہا جاتا ہے۔ جنرل نیازی اس جنگ بندی کا مسودہ کہنا پسند کرتے تھے...... جیکب نے کاغذات باقر صدیقی کو دیے جنھوں نے جنرل فرمان کے سامنے رکھ دیے۔ جنرل فرمان نے کہا: '' یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان '' کیا چیز ہے۔ ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر میجر جنرل جیکب نے کہا: '' یہ دستاویز ایسے ہی تیار شدہ دہلی سے آئی ہے۔ (یعنی مجھے اس میں ردوبدل کا اختیار نہیں) انڈین ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل کھیرا پاس ہی کھڑے تھے انھوں نے لقمہ دیا: یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے۔ آپ صرف انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ جنرل فرمان نے یہ کاغذات جنرل نیازی کے سامنے سرکا دیے اور کہا: کمانڈر پر منحصر ہے کہ وہ اسے منظور یا نامنظور کرے۔'' جنرل نیازی خاموش رہے۔ اس خاموشی کو مکمل رضا سمجھا گیا۔ (۱۴۶)

سقوطِ ڈھاکہ ایسا مسئلہ تھا کہ عوام وخواص اسے بھلائے نہ بھول سکے۔ اس واقعہ کے اثرات ایسے دوررس ثابت ہوئے کہ افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر اور سفرنامہ نگاروں نے موقع محل کے مطابق اس مسئلے کو موضوعِ بحث بنا۔ ادیب اور صحافی نے صرف سادہ انداز میں بحث نہیں کی بلکہ کڑھی نکتہ چینی اور تیکھے طنز کا حربہ اختیار کر کے عسکری اور سیاسی قیادت کو نشانہ بنایا ہے۔ محمد اجمل نیازی نے پاکستان کی سیاسی اور فوجی قیادت کو سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے طنز یہ حدف بناتے ہوئے لکھا ہے:

ذوالفقار علی بھٹو نے اس سے بہت کچھ منوالیا تھا۔ سنا ہے کہ شملہ معاہدے میں کچھ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اندر سے بھٹو کی اکیلے ملاقات ہوئی اور معاہدہ ہو گیا، بھٹو پاکستان آ کر اسے جیت کہتا رہا۔ اندرا گاندھی بھارت والوں کو بتاتی رہی کہ اس نے پاکستان کے کرنیلوں کو میدان میں اور پاکستانی سیاستدانوں کو میز پر شکست دی ہے۔ (۱۴۷)

سفرنامہ نگار اجمل نیازی کی اس رائے کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے کرنیلوں کو میدانِ جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ بات مزید وضاحت طلب ہے کہ پاکستان کے سیاست دانوں کو مذاکرات کی میز پر شکست کا سامنا

رہا۔ اگر ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے ۹۳ ہزار قیدی چھڑانے اور بھارت کے زیرِ قبضہ مغربی پاکستان کے علاقے واگزار کرانے کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو آج تاریخ کا دھارا کسی اور سمت ہوتا، جیسا کہ: ''۱۹۷۲ء کے موسم بہار میں مری کے مقام پر بھارت اور پاکستان کے حکام کے درمیان ابتدائی مذاکرات ہوئے۔ ان مذکرات نے متحدہ ہندوستان کے وائسرائے کے گرمائی دارالحکومت شملہ میں دونوں ملکوں کے سربراہوں صدر بھٹو اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کی ملاقات کا راستہ ہموار کر دیا۔'' (۱۴۸) بنگلہ دیش کی علیحدگی بھارت کی فتح نہ سہی پاکستان کی شکست اور ناکامی ضرور تھی اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ جن کا یہاں ذکر نا ضروری نہیں ہے۔ بس یہ بتانا ضروری ہے کہ پاکستان نے بنگلہ دیش کو منظور کیے بغیر مذاکرات میں کامیابی حاصل کر لی۔ قیدیوں کی رہائی کی نسبت بھارت سب سے زیادہ بنگلہ دیش کو منظور کرانے کے سیاسی پہلو پر زور دیتا رہا۔ پاکستان نے جب مجیب الرحمٰن کو منظور نہیں کیا تھا تو بنگلہ دیش کو منظور کیسے کر لیتا۔ غداروں کی غداری کے بل بولتے پر بنگلہ دیش الگ کیا گیا تھا، دراصل:

> بھٹو بھارت کی طرف سے ایک واضح قسم کی جنگ نہ کرنے کے معاہدے یا بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے مطالبے کو تسلیم کرنے کی بجائے کسی سمجھوتے کیے بغیر وطن واپس آنے پر تیار ہو گئے تھے۔ مذاکرات کئی دن تک کسی کامیابی کے امکان کے بغیر چلتے رہے۔ لیکن آخری لمحوں میں سمجھوتا اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس وقت پاکستانی وفد کے پاس کوئی ٹائپ رائٹر یا سرکاری مہر بھی نہیں تھی۔ بھٹو نے اس معاہدے پر دستخط بھی کسی سے عاریتاً لیے گئے قلم سے کیے مسز اندرا گاندھی بظاہر اس لیے رضامند ہو گئی تھیں کہ مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانے سے بہتر ہے کہ کوئی نہ کوئی سمجھوتا کر لیا جائے۔ (۱۴۹)

محمد اجمل نیازی کی رائے ممکن ہے کہ اپنی جگہ درست ہو، اندرا نے بھارت جا کر مذاکرات میں کامیابی کو اپنی فتح قرار دیا لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے ایئر پورٹ پر اُترتے ہی لوگوں کو بتایا: ''یہ میری فتح نہیں ہے۔ نہ مسز گاندھی کی فتح ہے۔ یہ پاکستان اور بھارت کے عوام کی فتح ہے جنھوں نے تین جنگوں کے بعد امن جیت لیا ہے۔'' (۱۵۰)

درحقیقت بنگلہ دیش کے پاکستان سے الگ کی ہونے سیاسی اور سماجی صورت حال ایسی تھی جس کی وجہ سے دونوں خطوں کے لوگوں کے رہن سہن، زبان، کھانا پینا مغربی پاکستان کے لوگوں سے جدا تھا۔ اس وجہ سے ذہنی طور پر پہلے اُنھیں اپنا تصور ہی نہیں کیا گیا۔ انھیں بنگالی سمجھا، بلایا اور پکارا جاتا تھا۔ اس سیاسی اور سماجی صورت حال پر انتظار حسین نے اپنے مخصوص انداز میں رائے دیتے ہیں کہ: ''مشرقی پاکستان میں تھے تو بنگالیوں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ لوگ بولتے کس طرح ہیں۔'' (۱۵۱) اسی طرح کا طنزیہ انداز مستنصر حسین تارڑ کے یہاں بھی ملتا ہے وہ لکھتے ہیں: ''اس کے باوجود کہ مسلم لیگ صرف بنگالہ دیش میں جیتی تھی پنجاب میں یا سرحد میں نہیں اور تحریک پاکستان کا آغاز بھی وہیں سے ہوا تھا... لیکن وہ ہمارے مسلمانی اور حب الوطنی کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔'' (۱۵۲) سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب بھی کوئی بات بنگلہ دیش

کی مناسبت سے ہوئی تو ادبانے بات سے بات نکالتے ہوئے اُسے طنز کا نشانہ بنایا۔ صحافی محمد اجمل نیاز جو بھارت کے سفر پر تھے وہ سقوطِ ڈھاکہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''پھولن دیوی نے ہتھیار ڈال دیے مجھے اتنا ہی دکھ ہوا جتنا مشرقی پاکستان میں جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کا ہوا تھا پھولن ایک خاص پورا علاقہ بھارت کا تلاش کر لینا چاہتی تھی۔''(۱۵۳) یہاں یہ مقصد نہیں کی پھولن دیوی کے ہتھیار ڈالنے کے واقعہ کو تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے اصل بات کا رخ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا المیہ ہے۔ جب جنرل نیازی کا انتقال ہوا تو یہ موقعہ بھی محمد اجمل نیازی نے ہاتھ سے نہ جانے دیا اور بے دریغ لکھا کہ: ''جنرل نیازی کی موت پر بنگلہ دیش کا پرچم سرنگوں ہونا چاہیے اور بھارت کا ترنگا بھی۔''(۱۵۴) یاد رہے کہ محمد اجمل نیازی نے یہ بات اُس وقت کہی تھی جب جنرل نیازی زندہ تھے۔ سقوطِ دھاکہ کے المیہ کے بعد جنرل نیازی نے باقی فوج کے ساتھ بھارتی کیمپوں میں قید کاٹی اور جنگی قیدیوں کی رہائی اور قیدیوں کے تبادلے کے بعد واہگہ کے رستے سے پاکستان آئے۔ تاہم ان کی وفات کے بارے میں جس کی طرف محمد اجمل نیازی نے اشارہ کیا تھا ۲۰۰۴ء میں لاہور میں ہوئی۔ وکی پیڈیا میں اس کے متعلق تفصیلات میں درج ہے:

> After giving an interview to ARY News, Niazi died on 1 February 2004 in Lahore, Punjab, Pakistan. He was buried in a Military Graveyard in Lahore.(۱۵۵)

علی سفیان آفاقی نے قیام بنگلہ دیش سے دو سال پہلے اور دو سال بعد میں دو سفر کیے تھے۔ دونوں اسفار کے دوران صورت حال میں یوں تو فرق دیکھنے میں آیا۔ مگر پاکستانی فوج کے انتظامی انداز کو اہل بنگلہ دیش نے بھی اپنائے رکھا۔ علی سفیان آفاقی کا بیان ہے: ''فوجی حکومت کی نشانیاں بنگلہ دیش میں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ دفاتر میں ریٹائرڈ فوجی احکام براجمان ہیں اور روزمرہ کے کاروبار کو رکاوٹ کے بغیر چلا رہے ہیں۔''(۱۵۶) قیامِ بنگلہ دیش کے بعد سیاسی حالات میں بہت زیادہ تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ بنگلہ دیشی سیاسی قیادت نے مارشل لاء حکومت سے نفرت کا اظہار جاری رکھا مگر خاندانی سیاست میں کسی کو عمل دخل نہیں دینے دیا۔ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد علی سفیان آفاقی نے بنگلہ دیش میں جس سیاسی شعور کا مشاہدہ کیا وہ یہ ہے کہ: ''بنگلہ دیش کی سیاست حقیقت میں دو خواتین کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایک شیخ مجیب الرحمان کی صاحب زادی اور عوامی لیگ کی رہنما بیگم حسینہ واجد اور دوسری مقتول صدر ضیاء الرحمٰن کی بیوہ خالدہ ضیاء۔ حسینہ واجد نے اپوزیشن جماعتوں کا ایک متحدہ اتحاد بنا رکھا ہے جس میں ملک کی ۱۴ پارٹیاں شامل ہیں۔''(۱۵۷) بقول علی سفیان آفاقی کے بنگلہ دیش کی سیاست میں دو خواتین شیخ حسینہ واجد اور خالدہ ضیا مقبول ترین سیاسی رہنما ہیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب علی سفیان آفاقی ۔ قیام بنگلہ دیش کے تین چار سال بعد بنگلہ دیش گئے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ شیخ حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیا بنگلہ دیش کی سیاست میں نا قابلِ شکست ہیں سوائے ایک دوسرے کو شکست دینے کے انھیں کوئی دوسرا شکست نہیں دے سکتا۔ باری باری

یہی دونوں پارٹیاں حکومت میں بدل بدل کر آ رہی ہیں۔ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی بڑی حریف رہی ہیں۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان برابر کا مقابلہ رہتا ہے۔ بنگلہ دیش کی دونوں پارٹیوں کی اجارہ داری ذکر محمد علی نے یوں کیا ہے:

> The two Rahman dynasties---Sheikh Mujibur Rahman's Daughters and General Zia Ur Rahman's widow and sons---retained control over the two largest political parties and the devotion of the masses, their members, and supporters during fifteen years of cyclical election to office, first by Khalada Zia's BNP in 1991-96, then Sheikh Hasina's Awami Leagues in 1996-2001 and then by BNP again in 2001-06, the leaders remained popular, and their parties, unchallenged, except by each other.(۱۵۸)

بنگلہ دیش کی سیاست کا منظر نامہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد عوام کے سامنے آیا ہے۔ وہ عوام جو مغربی پاکستان کی اجارہ داری سے جان چھڑانے کے لیے، بھارت کی معاونت سے مکتی باہنی کا حصہ بنتی ہے۔ ۲۴ سال کے قلیل عرصے میں دولخت ہو کر اپنا الگ وطن حاصل کر لیتے ہیں۔ بعد از پچاس سالوں تک گنتی کی دو پارٹیوں کی غلامی میں چلے جاتے ہیں۔ اب بنگلہ دیش میں کوئی مکتی باہنی نہیں۔ پاکستان کی حکومت بھی نہیں ہے۔ بھارت کی مداخلت بھی کسی قدر ختم ہو چکی ہے۔ پھر بھی بنگلہ دیش کے عوام کے معاشی حالات نہیں بدل سکے۔ اگرچہ افراطِ زر پاکستان سے کم ہے لیکن ابھی بھی لاکھوں لوگ غربت کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہے۔ اس کی وجہ بڑی سیاسی پارٹیوں کی اجارہ دار، کرپشن، اقربا پروری، منی لانڈرنگ، سرمایہ دار اور جاگیردار پروری ہے۔ لیکن یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں جمہوریت ہے۔ آمریت سے انھیں نفرت ہے۔

بنگلہ دیش نے بھارت کی مداخلت مغربی پاکستان سے الگ ہو کر نئی آزادی کی بنیاد رکھی۔ پاکستان بھارت جنگ میں روس نے بھارت کی مدد کی تھی۔ روس بڑی دیر سے اس انتظار میں تھا کہ بھارت کی پاکستان کے خلاف کب جنگ ہوتی ہے۔ پاکستان کو امریکہ پر امید تھی کہ اگر روس بھارت کی مدد کر رہا ہے تو امریکا پاکستان کی عسکری مدد کرے گا۔ لیکن امریکا کا وعدہ محض فریب ثابت ہوا۔ نہ کوئی امریکی بیڑا امریکا سے روانہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی بحرِ ہند میں اس کی آمد واقع ہوئی تھی۔ پاک بھارت اے کی جنگ میں چین پاکستان کی عسکری مدد کر سکتا تھا بلکہ چین تو: ''۱۹۷۰ء کے عشرے میں پاکستان کے لیے اسلحہ کا ناگزیر سپلائر بن چکا تھا۔'' (۱۵۹) لیکن وہ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف تھا۔ ویسے بھی خود چین کی بھارت کے ساتھ مسلسل دو جنگیں ہو چکی تھیں: ''نیفا پر چینی حملہ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو شروع ہوا۔ ایک ماہ کی جھڑپوں کے بعد جس میں بھارت کو مکمل شکست ہوئی چین نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔'' (۱۶۰) چین کا نیفا بارڈر تبت کے ساتھ ساتھ پاکستان اور

بھارت دونوں کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔اور ۱۹۶۶ء میں ستر کی دہائی میں دو جنگیں ہو چکی تھیں۔۱۹۷۱ء کے بعد بھارت اور پاکستان میں سیاسی اور عسکری حالات نے تیزی سے جگہ بدلی۔ذولفقار علی بھٹو کو پاکستان کی سالمیت کی فکر لاحق ہوئی تو انھوں نے اس سلسلے میں خود کہا:''پاکستان کے مفاد کے لیے ان کی ایٹمی پالیسی اور پھر پلاٹینم پروسسینگ پالانٹ کے لیے ان کے منصوبوں نے انجام کار''بیرونی ہاتھ''کو ان کے زوال کے لیے متحرک کر دیا۔''(۱۶۱)اس کے بعد اسلامی ممالک کی قوت کو بڑھانے کے لیے ذولفقار علی بھٹو نے اسلامی ممالک کی سربراہی کانفرنس کا لاہور میں انعقاد ممکن بنایا جس کی بدولت :''فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس نے اسلامی یک جہتی اور اسلامی اخوت کے جذبات پیدا کر کے بنگال دیش کو تسلیم کرنے کی راہ میں موجود رکاوٹیں دور کر دیں۔''(۱۶۲)اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ بھارت نے ۱۹۷۴ء میں رجستھان کے صحرا میں ایٹمی دھماکے کیے تھے۔لیکن سپر پاور ہونے کا اعلان اس وقت نہیں کیا تھا۔دوسری طرف پاکستان میں بھی ۱۹۷۵ء میں ایٹمی افزودگی کا کام شروع ہو چکا تھا۔پاکستان کے ایٹمی پروگرام:''ماسٹر مائنڈ ڈاکٹر عبدالقدیر خان تھے۔جو ۱۹۷۵ء میں پاکستان آ چکے تھے۔تاہم بھٹو کے اقتدار سے نکال دئے جانے کے دنوں میں پاکستان ایٹمی ہتھیار بنانے کی بنیادی صلاحیت حاصل کر چکا تھا۔''(۱۶۳)ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم بنے تو جنرل ضیا کو انھوں نے فوج کا سربراہ بنا دیا۔مگر ایٹمی پروگرام کے فروغ کو نقصان پہنچانے کے لیے امریکا کے اشاروں پر ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء میں:''آپریشن فیئر پلے کیا جس نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا،لیفٹیننٹ جنرل فیض علی بخش کی نگرانی میں عمل میں آیا۔''(۱۶۴)اس طرح اس اپریشن کی کارفرمائی کے تحت:''بھٹو کی جان بخشی کے لیے بین الاقوامی اپیلوں کے باوجود ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو راول پنڈی جیل میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔''(۱۶۵)

مسز م اندرا گاندھی، کانگریس پارٹی طرف سے مسلسل کئی بار وزیرِ اعظم بنتی رہی۔جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد لال بہادر شاستری ۴ر جنوری ۱۹۶۶ء تک وزیر اعظم رہے:''تاشقند معاہدے پر دستخطوں کی تقریب کے چند گھنٹے بعد شاستری کو جان لیوا دل کا دورہ پڑا۔''(۱۶۶)شاستری کے مرنے کے بعد مسز اندرا وزیرِ اعظم منتخب کیا گیا۔اس طرح اندرا گاندھی کوئی تین بار وزیرِ اعظم بنی۔سیاسی لحاظ سے مسز اندرا بہت شاطر تھیں۔انھوں نے ایک ساتھ دنیا کی دو بڑی طاقتوں امریکا اور روس کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھا رکھے تھے۔اور آڑھے وقت میں ان دنوں طاقتوں نے بھارت کا ساتھ ۱۹۶۵ء میں پس پردہ تو ۱۹۷۱ء میں سرِ عام دیا۔پاک بھارت بڑی جنگوں کے بعد بھی بھارت پاکستان پر مہم جوئی کی خواہشات کو پالتا رہا۔اب اُس کی یہ کوشش تھی کی شمالی ایشیا سے روس کے قریب تر ہو جائے۔کشمیر اور گلگت پر نظرِ بد سے دیکھ رہا تھا۔پاکستان کو پسماندہ رکھنے کے لیے مسز اندرا گاندھی نے روس اور مریکا کے ساتھ کس طرح تعلقات استوار کیے اس کا ذکر محمد اجمل نیازی اس طرح کرتے ہیں:''پاکستان کو پریشان کرنے کا ایک نہ ایک بہانہ اندرا کے بائیں ہاتھ میں رہا، اس کا دایاں ہاتھ روس

کے بائیں ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ہمیشہ بڑی کافر سیاستدان تھی بلکہ سیاستدانہ تھی، دانہ تھی۔ کیا ہاتھ دکھایا روس کو اور امریکا سے ہاتھ کر گئی۔ نہرو اور گاندھی اکٹھے ہو گئے اس کے سیاسی تن من میں۔"(۱۶۷) پاکستان کو ہر موڑ پر زک پہنچانے کے لیے بھارت کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا: "۱۹۷۷ء میں مسز گاندھی نے شیخ مجیب الرحمٰن کا استقبال بھی اسی لال قلعہ میں کیا تھا۔"(۱۶۸) یہاں یہ بات اہم نہیں ہے کہ لال قلعہ میں شیخ مجیب کا استقبال کیا گیا۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے بھارت کے ساتھ سفارتی تعلقات مضبوط تر ہو رہے تھے۔

پاکستان سے جنگ کرنے کے لیے بھارت کئی بار محاذ آرائی پر اُترا۔ مگر عالمی منظرنامے پر پاک بھارت کی جنگ کے نتائج عیاں تھے۔ اہل عالم بھارت کے ایٹمی دھاکوں سے باخبر تھے۔ مگر پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے بارے میں ابھی امکان کی حد تک متوقع تھے۔ تاہم پاکستان بھی بھٹو کی شہادت کے وقت تک ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکا تھا۔ بھارت میں مسز اندرا وزیراعظم تھی تو اس کے دو بیٹے سنجے گاندھی اور راجو گاندھی تھے۔ راجو گاندھی اس عرص میں برطانیا میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ان کا دوسرا بیٹا سنجے اگرچہ حکومت میں نہیں تھا۔ مگر اپنی ماں اندرا کے اقتدار میں ہونے کی وجہ سے غنڈا گردی اور بدمعاشی کے سارے کام اس کے ذمے تھے۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ۷۷-۱۹۷۶ء میں بھارت سفر پر: "قریب قریب تیس برس کے غوطے کے بعد مجھے (انتظار حسین) اس وقت دلی جانے کا موقعہ میسر آیا تھا جب سنجے گاندھی کی صفائی مہم پروان چڑھ کے نئی پرانی ہو چکی تھی اور مسز اندرا گاندھی اس کی قیمت ادا کر چکی تھیں آخر ان کی ہار میں مسلمان ووٹوں سے محرومی کا بھی کچھ دخل تھا۔"(۱۶۹)

۷۷-۱۹۷۶ء کے انتخابات میں اندرا کا بیٹا سنجے اس کی ناکامی کا واحد سبب تھا۔ بھارت کے عوام کا ردِعمل اُس کے رویے کے خلاف تھا۔ اندرا گاندھی سنجے کا صفائی مہم کی وجہ سے ایک مرتبہ الیکشن بھی ہار چکی تھی۔ سنجے کی شہروں کی صفائی مہم دو طرح سے عمل پیرا ہو رہی تھی۔ ایک تو مسلمانوں کو دلی شہر سے نکال کر گنگا کے پار کے علاقے میں بسایا جا رہا تھا۔ دوسرا مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا تھا۔ اس طرح کی ایک مثال بھارت میں: "مسلمانوں کو خون میں نہلا کر ۸۱-۱۹۸۰ء میں مسلمانوں کے منصوبہ بندی سے مُرادآباد شہر کو پوتر کرنے کے لیے چنا گیا۔ اور مسلمانوں کے ہولناک قتلِ عام کے لیے عید کا دن مقرر کیا گیا۔ عین عید کی نماز کے وقت عیدگاہوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، ہندو سور ماؤں نے مسلمان ماؤں، بہنوں اور سہاگنوں کو ان کے بیٹو، بھائیوں اور شوہروں کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گویا عید کے تحائف پیش کیے۔"(۱۷۰) سنجے اندرا گاندھی کا غنڈا صفت، منہ زور بیٹا تھا۔ دنیا کا کوئی عیب ایسا نہیں تھا جو اُس میں نہیں تھا۔ گھر کے کام کرنے والی نوکرانی کملیشو کے الفاظ کوثریا حفیظ الرحمٰن نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

> تم نہیں جانو میم صاحب! اس پاپی نے تو مسلمانوں کے ساتھ، سائیوں (عیسائیوں) اور ہری جنوں کی بھی نس بندی کروادی تھی۔ ہمارے گبھر جوانوں کو پھنڈر (بانجھ) کر کے رکھ دیا۔ راکھشش تھا

راکھشش پٹھان اور براہمنی کے ملن سے راکھشش ہی کو تو جنم لینا تھا۔ یہ پھرونج (فیروز گاندھی) مسلمان تھا اور اندرا رانی براہمنی، پر اس کے ساتھ اندرا کا ووا (بیاہ) ہوا تھا۔ یہ سنجے تو بالکل راکھشش تھا۔ سچ میم صاحب۔ یہ تمہارا پھروج مسلمان نہیں پارسی تھا۔ پارسی آگ کی پوجا کرتے ہیں۔(۱۷۱)

مندرجہ اقتباس کا آخری جملہ ثریا حفیظ الرحمان کا ہے۔ اس جملے میں انھوں نے فیروز کی اصلیت بیان کی ہے۔ سنجے کا جہاز کے حادثہ میں مرنے کے بعد دلی کو مسلمانوں سے نجات دینے کی مہم میں تیزی آ گئی تھی۔ اگرچہ صفائی مہم سنجے نے شروع کی تھی۔ لیکن وہ اس مہم کو اپنی زندگی میں جاری نہ رکھ سکا کیوں کہ: ''۲۳، جون ۱۹۸۰ء کا دن دلی میں نہیں، سارے بھارت ورش میں بڑا ''منحوس'' واقع ہوا تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی تھی کہ مہارانی کا لاڈلا سپوت سنجے گاندھی طیارے کے حادثے میں پرلوک سدھار گیا ہے۔'' (۱۷۲)

بھارت میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی داستان ایک تسلسل سے چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مراد آباد میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد آسام میں مسلمانوں کے قتل عام کی مہم کا آغاز ہوا۔ مسلمانوں کا قتل عام کرنا صرف اندرا گاندھی پر ہی منحصر نہیں بلکہ کانگریس کے قیام سے لے کر آج تک بھارت میں کوئی بھی سیاسی قیادت ہو وہ مسلمانوں کے خلاف اس لیے کاروائیاں کرتی ہے کہ ان کی طاقت کو توڑا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ: ''۱۹۸۳ء ہی میں آسام میں دس لاکھ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا...... دس لاکھ مسلمان، یہ انڈیا پریس کی اپنی خبر تھی۔ موتی لعل نہرو تھا یا ولبھ بھائی پٹیل یا ہندو قوم کا باپو ننگا فقیر موہن داس کرم چند گاندھی یا اب مرلی منوہر جوشی، باجپائی یا بال ٹھاکرے یہ بھیروں کے روپ ہندوؤں کے مہان پُرش ہیں۔'' (۱۷۳) ۱۹۸۰ء میں مسز اندرا گاندھی کا بیٹا جہاز کے حادثہ میں فوت ہو گیا تو اس کے قریب چار سال بعد بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی پر اُس کے ایک سکھ سکیورٹی گارڈ نے گولیاں چلا دی۔ اندرا گاندھی پر ۳ر نومبر ۱۹۸۴ء کو قاتلانہ حملہ کیا گیا جس کی وضاحت یوں ملتی ہے کہ: ''تین دن پہلے ۳۱ر اکتوبر کو آٹھ بج کر پچیس منٹ پر، پرائم منسٹر اندرا گاندھی کو اس کے اپنے محافظوں نے اس کے اپنے گھر کے کمپاؤنڈ میں گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی کر دیا تھا۔'' (۱۷۴) اندرا گاندھی کو گولیاں مارنے کے اوقات کار کے بارے میں ایک وضاحت یوں بھی ہے کہ:

بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو صبح ۹ر بجے دہلی میں ان کی سرکاری رہائش گاہ پر ان کے اپنے ہی دو سکھ محافظوں نے بالکل قریب سے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے ہلاک کر دیا۔ مسز اندرا گاندھی کو سولہ گولیاں لگیں...... مسز اندرا گاندھی پر محافظوں کی گارڈ کے ایک رکن نے صبح سوا نو بجے کے تھوڑی دیر بعد اس وقت گولی چلا دی جب وہ اپنی کوٹھی سے قریب کی عمارت نمبر ایک اکبر روڈ جا رہی تھیں۔ وہاں موجود ایک محافظ نے ان پر سٹین گن سے گولی چلا دی۔ ترجمان نے بتایا کہ اس وقت مسز اندرا گاندھی برطانوی ٹیلی ویژن کی ایک جماعت کو انٹرویو دینے کے لیے ساتھ کی عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ گولیاں لگتے ہی مسز گاندھی چیخ مار کر گر پڑیں۔ اور یہ آواز سن کر ان کی بہو سونیا روتی ہوئی ان کیطرف بڑھیں۔ ہسپتال میں

موت کے وقت اندرا گاندھی کے کنبہ کے کم و بیش تمام افراد۔موجود تھے ان کی چھوٹی اور ناراض بہو مانیکا گاندھی بھی ہسپتال پہنچ گئی تھی۔(۱۷۵)

مسز اندرا کی چھوٹی بہو، سنجے کی بیوی اور بیٹا راجیو گاندھی بھی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔مگر جب اندرا گاندھی کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا تو:''بہو سونیا روتی ہوئی ان کی طرف بڑھیں۔ہسپتال میں موت کے وقت اندرا گاندھی کے کنبہ کے کم و بیش تمام افراد موجود تھے ان کی چھوٹی اور ناراض بہو مانیکا بھی ہسپتال پہنچ گئی تھی۔''(۱۷۶)اسی قسم کی وضاحت ثریا حفیظ الرحمٰن نے کی ہے کہ:''اس وقت گھر پر موجود تھی،خون میں لت پت میڈم کو بغیر جھنڈے کی کار میں ڈالا اور ایک مقامی:''رام منوہر لوہیا ہوسپٹل''میں لے گئی۔''(۱۷۷)اندرا گاندھی کے قتل پر پورے بھارت میں افراتفری کی صورت حال پھیل گئی تھی۔اسی طرح کئی ایک مسائل جنم لے چکے تھے۔قاتلوں کا انجام کیا کیا جائے۔قتل کا الزام کس کے سر(جو پاکستان پر لگایا گیا)جائے اور نیا وزیر اعظم کسے بنایا جائے۔یعنی مسز اندرا کے قتل کے بعد جان نشینی کسے بنایا جائے۔اس موقع پر:''راشٹر پتی، گیانی ذیل سنگھ،......ہوم منسٹر نرسیمہا راؤ(موجودہ پرائم منسٹر)اور وزیرِ خزانہ پرنام مکرجی کے ساتھ باہم مشورہ سے راجیو گاندھی کو نیا پرائم منسٹر نامزد کر دیا گیا۔''(۱۷۸)

جیسا کہ اندرا گاندھی کے قتل کا الزام پاکستان پر لگایا گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کی مسز اندرا گاندھی نے قتل سے چار روز قبل پاکستان سے جنگ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ادھر اندرا نے پاکستان کو جنگ کی دھمکی دی اُدھر سکھ باڈی گارڈ نے اندرا کی جان کی حفاظت نہ کرتے ہوئے اپنی گن کی ساری گولیاں ان پر برسا دیں۔یہ وہی سکھ تھے جنھیں تقسیم کے وقت مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے مسلح کیا گیا تھا۔اندرا کے قتل تک دلی ہی میں آباد تھے۔اب وہ شرنارتی نہیں کہلاتے تھے۔ایک سکھ باڈی کے بدلے:''آپریشن بلیوسٹار نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا تھا۔امرتسر خون میں نہا گیا۔ہندوؤں نے سکھوں کو گولڈن ٹیمپل میں ان کے اپنے ہی خون میں ہولی ڈپ دے دیا تھا۔''(۱۷۹)بلیوسٹار اپریشن کے سلسلے میں ثواب حاصل کرنے کے لیے جو خونی کی ہولی کھیلی گئی:''اس موقع پر کم از کم ۱۵۰۰ ارسکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔تقریباً ۴۰۰ ارسکھوں کو ذبح اور اتنے ہی سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا۔''(۱۸۰)پورا بھارت سیاسی اور عسکری مشنری پنجاب کے سکھوں کے خلاف ہو گئی۔چن چن کر سکھوں کو مارا گیا۔اور ساتھ یہ تاثر بھی دیا کہ:''حرامی،''خالصتان مانگتے ہیں اس سور قوم کو پنجاب میں دھکیل کر اُوپر سے ایٹم بم گرا دیا جائے۔''(۱۸۱)اگر بھارت کو عالمی برادری کا ڈر نہ ہوتا تو ان پر ایٹم بم استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔صرف بدقسمتی یہ تھی کہ سکھ زیادہ سے زیادہ پنجاب اور دلی کے مضافات میں آباد تھے۔اگر اُس وقت سکھ پاکستان میں ہوتے تو بھارت کے لیے ان پر ایٹم بم استعمال کرنا آسان ہو جاتا۔

بھارت میں کبھی مسلمانوں کے خلاف اپریشن کیا جاتا تھا۔کبھی سکھوں کے خلاف تو کبھی عیسائیوں کی نس بندی کی کے منصوبے وضع کیے جاتے تھے۔کبھی آسام بھی تو کبھی مراد آباد میں،کبھی امرتسر میں تو کبھی اجودھیا میں ہندو انتہا پسند کی

دہشت گرد تنظیمیں اپنے منصوبوں کی تکمیل کرتی تھیں۔ انتظار حسین حیدر آباد کے سفر پر گئے تو انھیں معلوم ہوا کہ: ''اس علاقے میں ایل ایل ٹی بہت سرگرم ہے۔ پھر بابری مسجد کے واقعہ کے بعد جو کشیدگی کی فضا پیدا ہوئی اس کی وجہ سے۔ ان دو وجوہ سے عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور کرناٹک کے باہر سے یہاں آنے والوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔'' (۱۸۲) اجودھیا میں بابری مسجد کا معاملہ جو عرصہ دراز سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تنازع کی وجہ بنا ہوا تھا۔ یاد رہے کہ گزشتہ اوراق میں اجودھیا میں موجود بابری مسجد کا ذکر ہو چکا ہے۔ تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ:

> بابری مسجد کی تعمیر سولہویں صدی عیسوی میں ہوئی اور اس مسجد کے داہنی دروازے پر کندہ فارسی عبارت کے مطابق میر بقی نے اس مسجد کو تعمیر کروایا۔ تب ہندو مہا سبھائی کو اس قسم کے کسی مندر کا خیال نہ آیا جس کی ''لاش'' پر مسجد تعمیر کی جا رہی ہو۔ اس سے بھی پہلے۔ ۱۵۲۸ء میں بابر نے اپنی یادداشتیں مرتب کیں تو ان میں اپنے دورہ ایودھیا کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا لیکن اس نے ایسے کسی مندر کے آثار کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جس کا مقامی ہندو آبادی نے اس کے سامنے ذکر کیا ہو یا کسی بڑے پنڈت نے اس کے آثار دریافت کرنے پر زور دیا ہو۔ (۱۸۳)

بابری مسجد اور رام مندر کے مسئلہ پر سلطنتِ اودھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ آخر کار اس معاملے کو انگریزی عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت نے مقدمے کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کر دیا تھا۔ لیکن ہندو نہیں مانتے تھے۔ تاہم بادشاہِ اودھ نے فوجی مداخلت سے یہ معاملہ حل کیا تھا۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ رام مندر توڑ کر ظہیر الدین بابر نے مسجد تعمیر کرائی ہے۔ مسلمانوں کا کہنا تھا۔ رام جی کا مندر کہیں اور تھا۔ اس جگہ پر نہیں جہاں پر مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ تاہم: ''رام جنم بھومی۔ تاریخ اس کی گواہی نہیں دیتی۔ میں نے تحقیق کی ہے۔ اٹھارویں صدی کے ایک انگریز مصنف کا چھوڑا ہوا شگوفہ ہے۔ اپنے دعوے کے لیے مستند تاریخی حوالہ پیش نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ میں نے لوگوں سے سنا تھا۔ جھوٹ۔'' (۱۸۴) رام مندر ایک فرضی کہانی ہے، نہ رام جی تھے اور نہ ہی رام جی کی کہانی تھی اسی لیے اسے ''رام کہانی'' کی مثال دے کر یاد کیا جاتا ہے۔ کیوں ہندو نہ تو رام جی اور رام مندر کی مدلل وضاحت کرنے سے گریزاں ہیں۔ اکبر کے نورتن میں ابوالفضل کا مرتبہ بڑا اہم تھا۔ رام مندر کے حوالے سے: ''ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں بھی اس قسم کے کسی مندر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔'' (۱۸۵) اُتر پردیش میں رام مندر کی ایک عمارت نہیں ہے بلکہ رام مندر کئی ایک ہیں: ''ایودھیا میں کم و بیش بارہ مندرہ ہیں، جن میں سے ہر ایک کے پنڈت اپنے والے مندر کو رام جی کی ''اصل جنم بھومی'' قرار دیتے ہیں۔'' (۱۸۶) اسی طرح ایک اور جگہ رام جنم بھومی کا ذکر چل نکلا تو وجیندر جی کا بیان انتظار حسین نے یوں لکھا ہے کہ: ''کہنے لگے اب رام جنم بھومی کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی پھر آہستہ سے ٹکڑا لگایا'' پتہ نہیں رام جی پیدا بھی ہوئے تھے کہ نہیں۔'' (۱۸۷) رام جی کے بارے میں گوسوامی تلسی داس کی تحریر ہے۔ جس میں رام کے کی پیدائش کا سرے سے ذکر ہی نہیں

ہے۔جیسا کہ: ''رام جی کی دوسری کتھا جسے مستند ترین سمجھا جاتا ہے رام چرتا ماس ہے جسے گوسوامی تلسی داس نے تحریر کیا۔ وہ خود ایودھیا کے رہنے والے تھے اور انھوں نے......اپنی کتھا میں ایسا کوئی تذکرہ تو درکنار اس طرح کا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا۔'' (۱۸۸) والمیک کی رامائن میں رام جی کی پیدائش کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے: ''راجا رام ۳۱۰۲ء قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ یہ دور بھارتی جنتری کے مطابق رام جی ایودھیا (یا اجودھن) میں پیدا ہوئے۔'' (۱۸۹) مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں دیکھا جائے تو رام جی خود ہندوؤں کے لیے ایک معما ہیں۔ بس ہندو براہمنوں نے مذہب کی جھوٹی بنیاد کو سچائی سے مماثلت کرنے کے لیے رام جنم بھومی پر اس شدت سے زور دیا ہے کہ لوگ رام جی کی بنیادوں کو تلاش کرتے کرتے بابری مسجد کی بنیادوں تک پہنچ گئے۔ فرض کریں آثارِ قدیم کے ماہرین کل کسی اور جگہ پر یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ رام مندر وہاں نہیں تھا جہاں بابری مسجد تعمیر کی گئی تھی تو اس وقت ہندوؤں کا ردِعمل کیا ہوگا۔ جیسے ایک آثار قدیمہ کے ماہر کی رپورٹ کا مرتضی انجم نے حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

> تلسی داس اور پنڈت والمیک کی کتھاؤں کا تجزیہ کیا تو تقریباً سبھی نے یہ بات کھل کر لکھی ہے کہ رام جی کی جنم بھومی کے حوالے سے جس قصبہ ایودھیا کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ موجودہ ایودھیا نہیں جو دریائے سریو کے کنارے واقع ہے بلکہ وہ قصبہ موجودہ دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا اور گنگا کو عقیدت واحترام سے ''گنگا ماتا'' بھی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ اس کے پانیوں میں رام جی اشنان کیا کرتے تھے۔ بھارتی آثارِ قدیمہ کے سابق ڈائریکٹر جنرل پروفیسر بی پی لال نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ایودھیا میں آٹھویں صدی عیسوی سے قبل آبادی کے کوئی نشانات نہیں ملتے بلکہ مسلسل کھدائیوں اور تلاش کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح سے قبل اس مقام پر کوئی انسانی آبادی نہیں تھی۔ جب کہ تمام ثابت شدہ اور غیر متنازعہ حقائق کے مطابق رام جی ۳۱۰۲ قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ (۱۹۰)

اجودھیا میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی بھارت کا اندرونی معاملہ ہے۔ مگر یہ یک طرفہ حمایت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے پیچھے بہت بڑے بڑے سیاسی مفادات ہیں۔ دوسری طرف مسلمان ہیں۔ جن کے پیچھے نہ صرف پاکستان کے مسلمان ہیں بلکہ بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ملائیشیا، عرب ممالک اور کئی دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی دل آزاری کا معاملہ بن چکا ہے۔ سفرنامے میں صرف انتظار حسین نے اس تاریخی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی فوج جارحیت کا ہے۔ بھارت نے ایک مساوی نو کے تناسب سے بھارت میں فوج تعینات کر رکھی ہے جو عالمی تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ یعنی نو کشمیریوں پر ایک بھارتی فوجی نگرانی کر رہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی خطے میں یہ اہمیت ہے کہ اگر پاکستان اور بھارت کے مابین مسئلہ کشمیر کی وجہ سے جنگ ہوتی ہے تو پورا خطہ ایٹمی جنگ کی زد میں آجائے گا۔ اس مرحلے پر پاکستان بنگلہ دیش کا حساب بھی برابر کرے گا۔

جیسا کہ قیام پاکستان کے وقت پاکستان کی فوج نے کشمیر میں پیش قدمی کر دی تھی۔ اس محاذ پر پاکستان کی عوام نے بھی مجاہدانہ حوصلے اور سپاہانہ جوانمردی سے پاک فوج کا ساتھ دیا۔ پاکستان نے کشمیر کا جو علاقہ فتح کیا تھا اُسے آزاد کشمیر کہتے ہیں اور:
''پاکستان سرحد پار علاقے کو ہندوستانی مقبوضہ کشمیر جب کہ بھارت آزاد کشمیر کو POK یعنی پاکستانی مقبوضہ کشمیر کہتا ہے۔''(۱۹۱) مقبوضہ کشمیر کو فتح کرنے کے لیے پاکستان کی کشمیر میں پیش قدمی جاری تھی۔ کشمیر کے مہاراجا کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان پورے کشمیر کو فتح کر لے گا۔ کیوں کہ پاک بھارت کشمیر جنگ کو جہاد کا درجہ مل چکا تھا۔ اس لیے قبائلی علاقوں سے جوق در جوق پٹھان کشمیر کے جہاد میں حصہ لینے کے لیے آ رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے مہاراجا کشمیر نے کشمیر کا عارضی الحاق، عوام کی ذاتی خواہش پوچھے بغیر بھارت کے ساتھ کر دیا۔ جس کے نتائج آج تک دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ کشمیر کی جغرافیائی اہمیت اور مہاراجا کشمیر کے اقدام کے بارے میں Kenneth Scott LaTourette لکھتے ہیں:

> Kashmir presented an even more delicate situation. It lay on the northern frontiers of both Pakistan and India; its ruler the Maharaja, was a Hindu; and its population was predominantly Moslem. Pakistani tribesmen entered the country and the Maharaja Provisionally threw in his lot with India.(۱۹۲)

بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی سازش کے بارے میں ثریا حفیظ الرحمان نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے:

> جسبیر سنگھ، سری رام سنگھ کا بیٹا، پاکستانی پنجاب سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا اور دہلی میں آباد تھا۔ اُسے بھی لوٹ لیا گیا۔'' جموں سے وہ اہم خط لائے تھے۔ جس میں راجا ہر سنگھ نے کشمیر کے بارے میں کوئی خفیہ سندیسہ بھیجا تھا اور میں نے آزادی کے ایک دن بعد وہ اہم خط وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو کی رہائش پر بذاتِ خود فراہم کیا تھا۔(۱۹۳)

کشمیر میں پھیلی بے چینی کی صورت حال ابتدائی روز سے ہیں خراب تھی۔ کشمیر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے بھارت کئی طرح کے اقدامات بروئے کار لا چکا ہے۔ ثریا حفیظ الرحمٰن کا کہنا ہے:

> بھارت کے مختلف علاقوں سے ہندوؤں کو لا کر جموں میں بسانے کا سلسلہ ۱۹۴۷ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ کشمیر کو ہندوستان میں ضم کرنے کی کوشش کے بعد جموں میں مسلمانوں کا تناسب پچیس تیس فیصد رہ گیا ہے اور وہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ لاکھوں شرنارتھی جنھیں بظاہر اس وقت تک ریاست میں رہنے کے حقوق نہیں ملے تھے۔ جب وہ مکمل طور پر حقوق حاصل کر لیں گے تو مسلمانوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر رہ جائے گی۔(۱۹۴)

پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر ایک سیاسی سطح کا سنجیدہ مسئلہ ہے، بلکہ بہت سنجیدہ قسم کا مسئلہ ہے۔ عالمی برادر اس مسئلے کو غیر سنجیدہ لے رہی ہے۔ جس دن سے پاکستان اور بھارت آزاد ہوئے ہیں اسی مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ کشمیر کی سیاسی اور عسکری پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلے کی وجہ سے سیاسی جماعتیں اور کئی سیاسی شخصیات بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ انھوں نے جس طنزیہ انداز میں اس معاملے کو بیان کیا ہے وہ یوں ہے:

> عبدالرب نشتر کو ہرا دیا گیا۔ کہ اسے قائداعظم بہت پسند کرتے تھے۔ لیاقت علی خان کو اپنی وزارتِ عظمیٰ کی فکر پڑ گئی۔ اس نے پہلے اقتدار کے لیے مسلم لیگ کو داؤ پر لگا دیا۔ اب مسلم لیگ اسی کام کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ عبدالرب نشتر نہ ہوتا قائداعظم کے ساتھ مسلم میں تو ......تو اب نشتر ہی نشتر ہیں ہمارے سینے میں۔ قائداعظم کی شیخ عبداللہ کو کشمیر کا وزیر اعلیٰ نہ بنا دیتے۔ کشمیر ہی گنوا دیا سیاست دانوں نے۔ کشمیر کئی بار پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں آ پڑا۔ ہر بار جھولی میں سوراخ کر دیا کسی نے۔ شیخ عبداللہ کو بھارت کی لیڈر شپ تو کیا ملی کشمیر کی قیادت بھی ٹھیکے پر ملی۔(۱۹۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی مرتبہ کشمیر آزاد کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر پھر جب معاملہ کسی نہ کسی تاخیر کی وجہ سے الجھ گیا۔ ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء کی جنگوں میں، پھر بھارت چین جنگوں میں چین نے کئی مرتبہ کشمیر پر قبضہ کرنے کا اشارہ دیا۔ مگر پاکستان عالمی برادری سے کیے ہوئے وعدے نباہ رہا ہے۔ اور بھارت کو کشمیر پر کے سلسلے میں کوئی بھی وعدہ وفا کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ کشمیر کا مسئلہ بھارتی رہنماؤ اور مقبوضہ کشمیر کے رہنماؤں کے لیے ایک کڑا امتحان ہے۔ محمد اجمل نیازی نے کشمیر کے مسئلے پر بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

> اس سیاسی معمے کا حل کیا ہوگا، کب ہوگا۔ یہ جنت نظیر وادی پورے برِصغیر کو جہنم کی مثال بنا سکتی ہے بنا رہی ہے۔ ہندو لیڈروں کے لیے یہ مسئلہ دردِ سر بلکہ دردِ جگر ہے۔ اندرا کشمیرن ہو کر پورے بھارت کی مالک بن گئی۔ بھارت پر کشمیری حکومت کر رہے ہیں۔ کشمیر ہندو، اکثریت مسلمانوں کی ہے کشمیر میں۔ شیخ عبداللہ کشمیر کی آزادی کی تحریک کو تاریخ نہ بنا سکا۔ اور یہ سر کی سرداری کی وراثت اس کے بیٹے فاروق عبداللہ کے گلے میں پڑ گئی۔ میں پاکستان میں ہر سچے پاکستانی کی طرح بار بار مارشل لاء کے خلاف ہوں۔ مگر ہندو لیڈروں کو اس کی مخالفت کا حق نہیں پہنچتا کہ پورے پاکستان جتنی ان کی فوج صرف کشمیر کی وادی میں...... پاکستان کی......طرف نشانہ باندھے کھڑی ہے۔(۱۹۶)

۱۹۴۸ء میں کشمیر کے معاملے پر جواہر لال نہرو نے جب یہ دیکھا کہ کشمیر تو ہاتھ سے گیا۔ تحریک آزادی کی ساری اہمیت ختم ہو جائے گی۔ کیوں کہ نہرو خود جو کشمیری پنڈت تھے۔ گاندھی جی کی بکری کے لیے سیب کشمیر سے آتے تھے مگر: ''مہاراجا کشمیر کے لیے اور پہلے بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے چشمہ شاہی سے روزانہ پانی دہلی لے جایا جاتا تھا اور یہ سپلائی پنڈت نہرو کے مرتے دم تک جاری رہی۔''(۱۹۷) کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جاتا تو آج نہرو کی سیاست اور اس کی اولاد کا

مستقبل کچھ اور ہوتا۔ کشمیر کا مسئلہ اقوامِ متحدہ میں بھیجا گیا کہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت کشمیری عوام کے ریفرنڈم سے حل کیا جائے گا۔ آج تک نہ کوئی ریفریڈم ہوا ہے اور نہ ہی عالمی برادری نے اسے حل کرنے کا کوئی قدم اُٹھایا ہے۔ بس اقوام متحدہ نے اتنا کیا ہے کہ ایک عالمی کمیشن مقرر کر کے پاکستان اور بھارت کے مابین کشمیر کے مسئلہ پر فائر بندی کرادی ہے:

> The two dominions prepared for war, for the prestige of each was involved. But the United Nation intervened and in January 1949 a commission which it had appointed succeeded in bringing about a cease fire agreement. Yet tension continued. Charges and countercharges of encroachments on Kashmir were hurled at each other by India and Pakistan.(۱۹۸)

مسئلہ کشمیر پر اقوامِ متحدہ کے ردِ عمل کے بارے میں آئین ٹالبوٹ لکھتا ہے کہ:

> ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی پر عمل درآمد کرا دیا۔ تب تک آزاد کشمیر کی سرحدیں جموں کے مغربی علاقے میں پھیل چکی تھیں لیکن اس کے قبضہ میں ۳۰ ہزار مربع کلومیٹر کا بنجر اور کوہستانی علاقہ ہی تھا۔ البتہ میر پور کے کچھ علاقے زراعت کے قابل ضرور تھے۔ اس کے علاوہ آزاد کشمیر میں آسودہ حال علاقہ صرف مظفر آباد تھا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے وادی کشمیر میں داخل ہونے کا موزوں ترین راستہ تھا۔ دوسری طرف جنوب اور مشرق میں وادی کشمیر اور جموں کا زیادہ تر علاقہ انڈین یونین کے قبضہ میں تھا۔ دونوں ملک ایک دوسرے کے زیرِ انتظام علاقے پر اپنا حق جتاتے چلے آ رہے ہیں۔(۱۹۹)

مذکورہ بالا تمام تر سیاسی صورت حال کے پیش نظر کہ کشمیر کو فتح کرنا پاکستان کے لیے کوئی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن عالمی برداری کی پاس داری ہے۔ اقوامِ متحدہ کی کئی بار پاکستان نے کشمیر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مگر بھارت کے تجارتی منڈی ہونے کے سبب کسی امریکا، برطانیا، فرانس اور روس میں یہ جرات نہیں کہ وہ اس کا مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لیے کہہ سکیں۔ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی برِ صغیر میں دوسو چالیس سال حکومت رہی۔ تاج برطانیا کی نوے سال حکومت رہی۔ لیکن آزادی کی امید کم نہ ہوئی۔ بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت کو تاج برطانیہ سے آزادی حاصل کیے ہوئے پچھتر سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر دیر صرف ریفرنڈم کرانے والوں کی ہے۔ آزادی کی جستجو کرنے والے عسکریت پسند ہوتے تو کب کا بھارت کو سبق سکھا چکے ہوتے۔ ۱۹۴۸ء میں جب پاکستان نے کشمیر کی آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی تو تب نواب لیاقت علی خان اس وقت نرمی کا مظاہرہ نہ کرتے تو آج کشمیر بھی اپنی آزادی کی کئی ایک سالگرہ منا چکا ہوتا۔ مرتضیٰ انجم نے اس بارے میں لکھا ہے اگر نواب لیاقت علی خان:

اپنے فوجی مشیروں کا مشورہ مان لیتے تو بھارت کو سری نگر میں فوجیں اتارنے کا موقع نہ ملتا۔ کرنل مسعود کو آمرڈ کار سری نگر کے مورچوں تک لیجانے کی اجازت دے دی جاتی تو قبائلی مجاہدین آسانی سے سری نگری پر قابض ہو سکتے تھے۔ بھارت کے سری نگر کشمیر میں فوجیں داخل کرنے کے بعد جموں کٹھوعہ روڈ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ قبول نہ کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انگریز کمانڈر انچیف کو محاذ دفاع کی ضرورت محسوس ہوئی تو مسلح دستے کشمیر بھیج دیئے گئے۔ حالاں کہ شروع میں کم فوج بھیج دی جاتی تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ اس طرح ہر قدم پر فیصلہ وقت گزرنے کے بعد کیا گیا۔ لیاقت علی خان نے مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے اقوام متحدہ سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اقوام متحدہ کشمیر میں ریفرنڈم کرانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس ناکامی کی وجہ سے فوج اور افسران جنھوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے سر توڑ کوشش کی تھی لیاقت علی خان اور ان کی حکومت سے ناراض تھے۔(۲۰۰)

پاکستان اور بھارت کی مسئلہ کشمیر پر کشیدگی تو ایک طرف، لداخ اور نیفا کے علاقے میں چین کے ساتھ بھی بھارت کے حالات کشیدہ رہتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء کی ایک ماہ کی جھڑپوں کے دوران دونوں ممالک کی کشیدہ صورتِ حال سنگین ہو گئی تھی۔ تاہم بھارت اور چین کے درمیان امریکی مداخلت سے تصفیہ کرایا گیا۔ اس کے بعد دونوں ممالک نے ۱۹۶۲ء والی سرحدوں پر قائم رہنا منظور کر لیا۔ اس حوالے سے Kenneth Scott LaTourette لکھتا ہے کہ:

In1963 the issue had not been decided, in the strain of Chinese invasion in1962 efforts were made, especially by the United State, to bring the rivals to an agreement and thus to release Indian forces to face the foe on the northern borders, but each side was adamant.(۲۰۱)

پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ایک ہے کہ جس کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آ رہا ہے۔ مگر ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ ڈر یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہر وقت جنگ کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ عالمی برادری کشیدہ حالات میں تھوڑی بہت مداخلت کر کے حالات کو معمول پر لے آتے ہیں۔ مگر بھارت کو کشمیر میں ریفرڈم کرنے کے لیے نہیں کہتے۔ مذکورہ مسئلے کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان ماضی کی جنگیں ہوتی ہیں آئندہ بھی بہت سے امکانات موجود ہیں۔ آئے روز حالات کشیدہ رہتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر کی سنگین حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے آئین ٹالبوٹ نے لکھتا ہے کہ کشمیر کے تنازعہ کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان:

دو جنگیں ہوئیں (۱۹۴۸ء، اور ۱۹۶۵ء) ۱۹۷۱ء میں جنگ کا خطرہ پیدا ہوا اور شمالی کشمیر میں ۱۹۴۸ء کے بعد سیاچن گلیشیر میں مسلسل جھڑپوں کا آغاز ہوا جو وقفے وقفے سے جاری ہے۔ کشمیر ہی کی وجہ سے ۱۹۹۰ء کے عشرے میں دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی جنگ کا خطرہ مسلسل برقرار رہا۔ اس تنازعہ کے برِصغیر کے

مستقبل اور عوام کی بہبود کو خطرہ میں ڈال رکھا ہے۔(۲۰۲)

پاکستان کے جنوب مشرق میں اور بھارت کے عین جنوب میں سری لنکا ایک جزیرہ نما ملک ہے جس کی سمندر کے درمیان ہونے کی وجہ سے اپنی ایک اہمیت ہے۔ انگریزوں نے جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں لایا تو سرلنکا کو اس یلغار سے مستثنٰی نہ چھوڑا۔ انگریزوں نے بندرگاہوں کی اہمیت کی وجہ سے سری لنکا پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس ملک کی اپنی ہی سیاسی اور تاریخی اہمیت ہے۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا اور غریب ملک ہے۔ تامل آبادی کی علیحدگی کا مسئلہ اسے بھی درپیش رہا ہے۔ تاہم: ''سری لنکا میں آبادی کی اکثریت بدھ مذہب کو ماننے والوں کی ہے لیکن یہاں قریب عرصہ دراز تک ہندوستان کا حصہ رہا ہے اور ہندو تہذیب وتمدن یہاں پورے پورے عروج پر ہے۔''(۲۰۳) ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح سری لنکا نے بھی آزادی کی جدوجہد کی اور تحریکیں چلائیں پاکستان اور بھارت کی بہ نسبت اسے بڑی دیر بعد آزادی ملی۔ دیر سے آزادی ملنے کی ایک کی وجہ یہ تھی کہ برطانیا اس جزیرے کو جنگی ہوائی اڈوں کے طور پر ایشیا میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب سے برطانیا میں لیبر پارٹی کی حکومت آئی تھی۔ حکومتِ برطانیا نے آئینی تبدیلیوں کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا تھا۔ جس نے مئی ۱۹۴۶ء میں، آئین کے مسودہ تیار کر کے حکومت کے سامنے پیش کیا۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں برطانوی پارلیمنٹ نے سری لنکا کی آزادی کا بل منظور کرلیا۔ اور ۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سری لنکا کی آخری خودمختاری حقیقت بن گئی۔ سری لنکا اب دولت مشترکہ کی ایک خودمختار حکومت ہے۔ آئین کو جزیرے سے دستبردار ہونے کے تحت، ریاست کی سربراہی کا مرحلہ ایک گورنر کے ذریعہ طے کیا گیا، جو حکومتِ برطانیا کے ذریعہ مقرر کیا گیا تھا۔ جس کے پاس مکمل اختیارات تھے۔ اس حوالے سے Kenneth Scott LaTourette کا کہنا ہے:

> In 1944, before Labor had come to power, a commission had been had been appointed by the British crown to visit Ceylon and to propose measures for constitutional changes. In May 1946, a draft constitution was presented to the crown; late in 1947 the British Parliament passed the Ceylon Independence Bill; and on February 4, 1948, the autonomy of Ceylon became a reality. Ceylon was now a self-governing dominion with the commonwealth. Under the Constitution granted the island, the state was headed by a governor-General, appointed by the crown, who had much more than nominal power.(۲۰۴)

سری لنکا جب سے آزادی ہوا ہے اُس وقت سے مشکل حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ سب سے اہم بات کہ بھارت کشمیر کی طرح سری لنکا کو بھی اپنا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے۔ اس لیے سری لنکا میں اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے۔ بھارت کے قریب ترین ہونے کے باوجود سری لنکا کا دفاعی اور تجارتی حوالے سے پاکستان کی طرف جھکاؤ بہت زیادہ اور خوش آئند ہے۔ پاکستان کی حواصلہ افزائی کی وجہ سے سری لنکا کو خطے میں اپنی اہمیت کا احساس ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ: ''سری لنکا کی حکومت اور سیاستدان بڑی جرات اور سکون کے ساتھ بھارتی دباؤ اور سیاسی حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔'' (۲۰۵) شروع میں سری لنکا نے بھارت کے سرمایہ داروں کے ساتھ معاشی سمجھوتے کیے تھے مگر یہ سری لنکا کو کمزور کرنے کے لیے کبھی سرمایہ کاری کرتے تھے کبھی روک دیتے تھے۔ جس وجہ سے سری لنکا کو معاشی لحاظ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ علی سفیان آفاقی لکھتے ہیں کہ: ''کولمبو اور سری لنکا کی معیشت کا بڑا انحصار سیاحوں کی صنعت پر ہے۔ سیاحوں کی کمی نے ملک کی مجموعی معیشت اور خوشحالی کو بھی متاثر کیا ہے۔ دوسری اہم چیز بھارتی سرمایہ دار اور سرمایہ کار ہیں۔'' (۲۰۶) اس قسم کے معاشی اور سیاسی حالات دیکھتے ہوئے سری لنکا نے چین کے ساتھ اپنے تجارتی معاہدے بڑھاتے ہوئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جس کی مثال Kenneth Scott LaTourette نے اس طرح پیش کی ہے:

> In 1956 an election brought to power as premier S.W. R. D. Bandaranaike, a socialist, who in spite of his English defense bases, to have Sinhalese adopted as the national language, to attitude in the "cold war" in 1957 the British bases were handed over to Ceylon with the provision that the United Kingdom could make use then until 1962. The year saw the singing of a five-year trade agreement by Colombo and Peking whereby the former exchanged rubber much needed by the latter in return for rice and financial aid.(۲۰۷)

سری لنکا ایک پُر امن اور چھوٹا ملک ہے، بھارت کی اکثر اس سے رنجش رہتی ہی۔ چوں کہ بھارت سری لنکا کی معاشی حق تلفی کرنے پر تلا رہتا ہے۔ وہ سری لنکا میں اپنے: ''ہر قسم کے اناڑی ماہرین کو کھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (۲۰۸) بھارت کے برعکس دوسری جانب عرب ممالک اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک: ''سری لنکا کو معاشی اور مالی فوائد فراہم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' (۲۰۹) جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ سری لنکا کے پاکستان کے تعلقات برادرانہ حد تک استوار ہو چکے ہیں جس کی مثال یہ ہے کہ: ''سری لنکا اور پاکستان کے تعلقات بھی نہایت خوشگوار اور انتہائی دوستانہ رہے

ہیں۔ حال ہی میں صدر نے سری لنکا کا تفصیلی دورہ کیا اور مقامی مسلمانوں آبادی سے گھل مل گئے۔"(۲۱۰) آج سری لنکا بھی دوسری ممالک کی طرح اکیسویں صدی میں سانس لے رہا ہے۔ کئی طرح کے بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ اسے اندرونی خطرات اور خدشات لاحق ہیں۔ اس کی موجودہ سیاسی اور سماجی صورتِ حال یہ ہے کہ:

> سری لنکا میں بھارتی لابی کافی مضبوط اور فعال ہے، پاکستان کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کرنے اور غلط فہمیاں پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی بعض بااثر اخبارات کی حمایت بھی انھیں حاصل ہے اس کے باوجود مقامی بدھ آبادی اور عیسائیوں میں مسلمانوں کے بارے میں مجموعی طور پر اچھے جذبات موجود ہیں۔(۲۱۱)

د: مذکورہ دور کے منتخب ایشیائی سفرناموں میں تاریخی عناصر کا تفصیلی جائزہ

جنوبی ایشیا مغربی ایشیا میں ایران ایک ایسا ملک ہے جو تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ پاکستان کا ہمسایہ اور دوست ملک ہے۔ ایران کی حکومت اور عوام پاکستان کے ساتھ دلی ہمدردی اور خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں۔ تیل فروانی کی وجہ سے غیر ملکی مداخلت بڑھتی جا رہی تھی۔ جس کے خلاف عوام اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایران کے عوام کا سیاسی اور سماجی شعور جہاں عروج پر ہے وہاں پر مذہبی اقدار پر بھی کاربند ہیں۔ نوآبادیاتی عہد کے دوران ایران کا زیادہ تر حصہ خودمختار ہی رہا تھا۔ لیکن جنگ عظیم دوم کے دوران روس نے حملہ کر کے ایران پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنگ کے بعد ایران پر سے روس کا تسلط ختم ہوا تو ایران ایک بار پھر آزاد اور خودمختار ملک بن گیا۔ جب ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہوا: "شہنشاہ نے ایران سے راہ فرار اختیار کی تو امام خمینی پیرس میں تھے انھیں انقلاب کی خبر ملی تو انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور نرم آواز میں اللہ اکبر۔"(۲۱۲) شاہ ایران احمد شاہ رضا پہلوی ایران کے شہنشاہ تھے۔ شہنشاہ کی تاج پوشی کے لیے: "۲۵ر اپریل ۱۹۲۹ء کا دن آیا تو پورا ملک خوشی کے شادیانے بجا رہا تھا۔ تہران خاص طور پر خوشی کا گہوارہ بنا ہوا تھا گلستان محل اور آرک میدان کی دوسری سرکاری عمارتیں رنگا رنگ طریقے پر سجائی گئی تھیں۔"(۲۱۳) دوسری جنگِ عظیم میں روس نے ایران پر حملہ کر کے خاص خاص شاہراہوں، بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں پر قبضہ کر لیا تھا تاکہ جنگ کے مقاصد کے لیے ایران کی سرزمین استعمال کی جا سکے۔ جنگ کے دوران جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو برطانیا نے روس کو امداد دینے کا وعدہ کیا جس کی وضاحت یوں ہے کہ: "چرچل نے روسیوں کو ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔ اسی امداد کے لیے ایران پر قبضہ کیا گیا تھا۔ اس لیے ایران سے سامانِ جنگ بھیجنے کا راستہ ہوائی، بحری یا دوسرے حملوں کے خطرے سے محفوظ تھا۔"(۲۱۴) لیکن ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہوا تو ایران کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال خطرات کا شکار ہو گئی: "طویل خون خرابے کے بعد ۱۶ر جنوری ۱۹۷۹ء کو شہنشاہ ملک چھوڑ گئے۔ ایران اپنی ملکہ فرخ دو بچوں اور دیگر کے ہمراہ اچانک ایران چھوڑ کر چکے گئے۔ شاہ ایران کی روانگی کو خفیہ رکھا

گیا۔''(۲۱۵)ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہونے کے پیچھے چند ایک وجوہات تھیں۔ ملک میں غیر اسلامی طور طریقے رائج ہو چکے تھے۔ اسلامی انقلاب برپا ہوا تو ایک ہی مرحلے میں ساری صورت حال بدل گئی: ''عمارتیں اور رونق اپنی جگہ مگر وہ عریانی اور بے حیائی دیکھنے کو نہیں مل رہی تھی۔ جس پر شہنشاہ آریہ مہر یہ فخر کیا کرتے تھے۔''(۲۱۶)

ایران کی سیاسی صورتِ حال رضا شاہ کے دور میں یہ تھی کہ ایران کے کاروبارے زندگی زیادہ تر امریکا کی خواہش کے مطابق چلتے تھے۔ لیکن اسلامی انقلاب آنے کے بعد امام خمینی نے امریکا کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیے۔ اس طرح امریکا ایران کا دشمن بن گیا، لیکن: ''چین کو چھوڑ کر صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جو امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ امریکہ کی طاقت، دہشت اور عالمی دباؤ سے قطعاً مرغوب نہیں ہوتا۔''(۲۱۷) عالمی سطح پر امریکا خود بھی ایران کی کھل کر مخالفت کر رہا تھا اور جہاں تک ہو سکا، عراق کو ایران پر حملہ کرنے کے لیے فوجی ساز و سامان کی امداد بھی دی۔ علی سفیان آفاقی کہتے ہیں کہ: ''امریکہ کو جب ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی اور کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو عراق کو ایران پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔''(۲۱۸) درحقیقت مسلمان ممالک میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ مسلمانوں کو کسی غیر نے اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جتنا اپنوں کے ذریعے پہنچا ہے۔ ایران، عراق جنگ (۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۸ء) میں عراق کی ساری معاونت امریکا کر رہا تھا۔ کیوں کہ عراق کو جنگ میں فتح حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ:

> عراق ایران جنگ کے اختتامی ایام ۱۹۸۸ء میں خلائی سیاروں سے لی جانے والی تصاویر کے ذریعے امریکا کو معلوم ہوا کہ ایران، عراق کے دفاعی حصار میں ایک خامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی تزویری کامیابی حاصل کرنے والا ہے۔ امریکی انٹیلی جنس نے ایرانی فوج کی پیش رفت کے بارے میں عراق کو اطلاع دے دی۔ حالاں کہ اسے علم تھا کہ صدام حسین کی فوج کیمیاوی ہتھیاروں سے حملہ کرے گی۔ جن میں مہلک اعصابی گیس سارین شامل ہے۔ عراقی فوج کو مہیا کی جانے والی خفیہ اطلاعات میں ایرانی فوج کے دستوں کی نقل و حرکت کی تصاویر اور نقشوں کے علاوہ ایران کے فوجی ذرائع نقل و حمل اور ایرانی فضائیہ کے دفاعی اقدامات کی تفصیلات بھی شامل تھیں۔ عراق نے امریکا کی فراہم کردہ سیٹلائیٹ تصاویر، نقشوں اور دیگر خفیہ معلومات کی مدد سے ۱۹۸۸ء کی ابتدا میں ایران پر چار بڑے حملے کرنے سے پہلے مسٹرڈ گیس اور سارین گیس ایرانی فوج پر پھینکی۔ ان حملوں کی وجہ سے جنگ کا پلڑا عراق کے حق میں جھک گیا اور ایران مذاکرات کی میز پر آنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح عراق کو فتح دلوانے کی ریگن حکومت کی پالیسی کامیاب ہو گئی۔ واضح رہے کہ یہ کیمیائی حملے نئے نہیں تھے۔ عراق کئی سال پہلے سے ایرانی فوج پر کیمیائی حملے کر رہا تھا اور ریگن حکومت نے جاننے کے باوجود انھیں افشا نہیں کیا۔(۲۱۹)

مذکورہ بالا بیان تصویر کا ایک پہلو ہے۔ ایران کے تاریخی حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایران میں: ''امام خمینی کی تصاویر اور ارشادات کے علاوہ دو چیزیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں ایک عزم جنگ اور عراق کو سبق

سکھانے کا مصمم ارادہ اور دوسرے امریکا سے اظہار نفرت۔ امریکا کو ایرانیوں نے صحیح معنوں میں ''نکو'' بنا کر رکھ دیا۔ ایرانی امریکا کو شیطان بزرگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔''(۲۲۰) مطالعہ میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ایران کا پاکستان کے بارے میں رویہ کوئی زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا جھکاؤ بھارت کی طرف زیادہ ہے۔ کبھی بھارت کو کسی رہنما نے بھارت اور ایران کے آرین ہونے کی بات کی تھی۔ جس کی وجہ سے ایرانی، بھارت کو اپنا ہم نسل سمجھنے لگ گئے تھے۔ دوسری طرف ایران میں بھارت، پاکستان کے خلاف سوچ پھیلاتا رہتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی ایران کے بھارت کے ساتھ سیاسی، سفارتی، تجارتی تعلقات بہت مضبوط ہیں۔ علی سفیان آفاقی کہتے ہیں کہ: ''شہنشاہ کے زمانے میں بھی بھارتیوں کو اور بھی مواقع حاصل ہوئے تھے وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ کو آریہ مہر یہ یعنی آریاؤں کا سورج کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور بھارت والوں نے ایرانیوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ بھی آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ گو اس طرح ایرانیوں کی نسل اور قریبی رشتے دار ہیں۔''(۲۲۱)

پاکستان کے مغرب میں اور ایران کے ہمسائے میں عرب ممالک کا وسیع سلسلے ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں عرب ممالک خاص طور پر عراق، شام، مصر، سعودی عرب، انگریزوں کی حمایت میں تھے۔ ان ممالک پر برطانیا کی حکومت تھی۔ جنگ کے بعد جب برطانیا کو فتح حاصل ہوئی تو اس کی مداخلت ان ممالک میں زیادہ ہوگئی۔ اسی وجہ سے: ''عرب خدا اور سول کی تعلیمات سے آزاد ہو کر برطانیا کی سیاست، فرانس کی ثقافت، امریکہ کی دولت اور روس کی رفاقت کے باعث تباہ ہوئے ''(۲۲۲) عربوں کی تیاری کی ان چار وجوہات کے علاوہ امریکا کی نیو ورلڈ آرڈر کی پالیسی کے ردِ عمل میں روس نے عرب ممالک میں اپنے سیاسی اثرات مرتب کرنے کی کوشش کی۔ عربوں میں سیاسی لحاظ سے بادشاہت کا نظام رائج تھا۔ لیکن عرب کی بادشاہت کو اب خطرات لاحق تھے۔ کیوں کہ: ''عرب ریاستیں جمہوری یا اشترا کی نظام کی زد میں ہیں ان کی تعلیم و سیاست حجاز سے زیادہ عوامی ہے اور آئے دن کی حکومتی تبدیلیاں عوام کے متحرک مزاج سے مواقفت رکھتی۔''(۲۲۳) شورش کاشمیری کا کہنا ہے کہ عربوں میں سوشلزم کی وبا بڑی تیزی سے پھیل رہی۔ مدینہ یونیورسٹی کے طلبا اس فکر میں دکھائی دیتے ہیں کہ: ''عربوں کے حالات اور سوشلزم کے نتائج نے جنھیں وہ شام و عراق اور مصر و سوڈان میں دیکھ آئے تھے اتنا جھنجھلائے دیا تھا کہ انھیں اپنے مدرسہ فکر کے اُن علما کی روش پر حیرت تھی جو عربوں کی اشترا کی ریاستوں اور پاکستان کے اشترا کی ذہنوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔''(۲۲۴)

دراصل عرب ممالک میں سوشلزم براہ راست حجاز میں اثر انداز نہیں ہوا بلکہ مصر میں روس کے سیاسی اور عسکری اثرات بڑھے تو اس کے بعد عرب ممالک کو بھی سوشلزم کے خطرے کا احساس ہوا۔ روس کی مصر میں مداخلت کے بارے میں شورش کاشمیر نے لکھا ہے کہ:

مصر میں روس نے مختلف ڈیمز وغیرہ بنانے کے لیے جو ٹیکنیشن بھیجے ہیں ان میں چالیس ہزار میں سے

سویلین کے روپ میں نصف ملٹری ایکسپرٹ ہیں اوران میں پچیس فیصد یہودی ہیں، یہی وجہ ہے کہ روس فوجی امداد کے نام پر اڈے بناتا ہے اور اسرائیل تباہ کرجاتا ہے روسی فوج کا چیف آف دی سٹاف مارشل زخورف نسلاً یہودی ہے اسرائیل کا پہلا وزیراعظم بنگورین روس کا یہودی تھا۔(۲۲۵)

آغا شورش کاشمیری کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ روس نے مصر کو جو اسلحہ دیا تھا وہ مصر نے اسرائیل کے خلاف نہیں استعمال کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل کے بہت سے یہودی روس سے تعلق رکھتے تھے۔مصر، روس کے اشاروں پر عمل کر رہا تھا اس لیے عرب کے حکمرانوں کی اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ روس کے اسلحہ کی ترسیل یمن کو ہو رہی ہے۔یمن، اُردن اور سعودی عرب کے خلاف اسلحہ استعمال کر رہا ہے۔سعودی عرب کے بادشاہ، شاہ فیصل نے بجا طور پر اس بات کا اظہار کیا تھا کہ:

> اسرائیل کے خلاف عربوں کی جہادی تنظیموں اور مصر کی حکومت کو جنتی امداد حجاز نے دی ہے وہ اکثر و بیشتر حجاز ہی کے خلاف استعمال ہوئی ہے۔یمن کو حجاز کے خلاف بھڑ کانے میں ناصر کا ہاتھ تھا اور جو اسلحہ یمن میں استعمال ہوا وہ روسی ساخت کا تھا، حجاز میں یہ بات حق الیقین کا درجہ رکھتی ہے کہ روس کا اسلحہ اسرائیل کے خلاف نہیں حجاز اور اردن کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔اور روس اسرائیل کے بجائے حجاز و اردن کو سمیٹنا چاہتا ہے یعنی وہاں بھی اشتراکی نظام قائم کرنے کا متمنی ہے۔(۲۲۶)

دراصل محوری طاقتوں نے مسلم ممالک کو اسرائیل کے خلاف جنگی امداد تو دی لیکن امداد ایسی تھی کی اسرائیل کی طاقت سے کہیں زیادہ کم تھی۔جس کی وجہ سے مسلم ممالک جنگ میں تو کود پڑتے تھے لیکن اسلحہ کی قوت کم ہونے کی وجہ سے جنگ میں شکست خوردہ ہو جاتے تھے۔اس طرح اسرائیل کو ان ممالک پر حملہ کرنے کا جواز مل جاتا تھا۔روس نے مسلم ممالک عراق اور مصر کو اسرائیل کے خلاف مصروف کار رکھا تھا۔اس کی جنگی امداد دینے کی وضاحت Hedley V. Cooke نے اس طرح کی ہے:

> The Soviet aid of 1955- 1956 to Egypt was administered in such a manner as to provoke an attack by Israel, instead of preventing one. The western aid to Iraq and other was kept small by the fear that anything greater might imperil Israel' s existence.(۲۲۷)

دراصل پہلے بھی شورش کاشمیری اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کو اصل خطر یورپ اور امریکا سے نہیں ہے بلکہ اصل خطرہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے درپیش ہے۔بیرونی طاقتیں مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔جیسے عراق کی ایران کے خلاف یمن کی سعودی عرب کے خلاف سوچ پیدا کر دی گئی ہے۔شورش اپنے قیام حجاز کے وقت کے مشاہدے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:''حجاز میں فیصل کی حکومت کو خطرہ مصر سے ہے۔شاہ سعود نے ان

مصریوں کوحجاز سے نکلوا دیا جو مدتوں سے یہاں رہ رہے تھے،شاہ سعود سے پہلے وہ حجاز میں کارِمختار تھے، اب ان کی جگہ دوسرے لوگ آگئے ہیں۔''(۲۲۸) امریکا کا سعودی عرب میں خاص طور پر عمل دخل ہے۔وہ عرب مما لک میں قومیت پرستی کی تحریکیں چلانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔جس کی وجہ سے مسلم مما لک ایک نئے خطرے سے دوچار تھے۔خاص طور پر ایسے مما لک جو ایشیا میں ہونے کے باعث روس کے آلہ کار آسانی سے بن سکتے تھے ان میں:''عربوں کے ذہنی بیت الخلا کا نام بیروت ہے ان کے نئے فکری سوتے پہلی جنگ عظیم کے بعد یہیں سے پھوٹے ہیں اور عرب نیشنلزم کی ابتداء یہاں سے ہوئی ہے لبنان میں برابر سربراہ کی مخلوط آبادی علمی طاقتوں کے ڈرامہ کا اسٹیج ہے۔''(۲۲۹) اپنے ہی ملکوں میں انتشار پھیلانے کے لیے بیرونی طاقتوں کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو ان کا ہتھیار بن جاتے ہیں:''ایران میں بہائی، ترکی میں ڈونمہ، شام میں نصیری، مصر میں قبطی (واضح رہے کہ ۱۹۶۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں صحرئے سینائی کا راکٹ اسٹیشن انہی کے فرائض میں تھا)''(۲۳۰) جنگ کے دوران اسرائیل اور مسلم مما لک معاہدے ان مما لک کے درمیان نہیں ہوئے تھے تاہم، اقوام متحدہ نے مداخلت کر کے فلسطین کا دو ہزار مربع کلومیٹر کا علاقہ لبنان کی نگرانی میں دیا اور ایک سو مربع کل میٹر غزہ پٹی کا علاقہ مصر کی نگرانی میں دے دیا۔ لبنان کو دیا جانے والے فلسطین کا علاقہ اُس نے مستقل طور پر اپنے قبضے میں کرلیا۔مگر مصر کو اسرائیل نے جنگ کے ذریعے غزہ پٹی سے نکال باہر کیا بلکہ وادی سینا پر بھی قبضہ کرلیا۔جس کی وضاحت ذیل میں Hedley V. Cooke نے یوں کی ہے:

> No peace treaty has ever been concluded between Israel and the Arab states against which she fought in 1948. However, through United Nations intervention, armistice agreements were concluded with Egypt, Syria, Lebanon and Transjordan (but not Iraq). In each case a provisional frontier was established. Two sectors Palestine were, by these agreements, placed provisionally under Arabs rule. The larger one, of about two thousand square miles was allotted to Transjordan - who subsequently declared it permanently annexed. The other, of about a hundred square miles, called Gaza Strip, was placed provisionally under the Egyptian administration. In the Sinia war of 1956, Israel drove Egypt out of the Gaza Strip, held it herself until

March 1957, and then with draw under international pressure. Egyptian rule was soon restored.(۲۳۱)

ایشیا میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں مسقط ایک ایسا ملک ہے جو خلیجی ممالک میں موجود ہونے کے باوجود بحرِ عرب کے ساتھ ساتھ واقع ہے لیکن یہ ملک پاکستان کے نزدیک ہے۔ بس درمیان میں سمندر حائل ہے۔ اہلِ پاکستان سمندر پار کرنے کے بعد مسقط پہنچ جاتے ہیں۔ یا ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی سے پرواز کر کے مسقط میں جا کر اُترتے ہیں۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ انگریزی دور میں گوادر کا علاقہ مسقط کے قبضے میں بھی تھا: ''۱۹۵۸ء میں حکومت پاکستان نے ایک معاہدے کے تحت سلطنت عمان سے یہ علاقہ قیمتاً خرید لیا اسی کی دہائی میں کراچی کے حالات خراب ہونے سے پہلے اکثر عمانی تعلیم اور کاروبار کے لیے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔''(۲۳۲) مسقط کے سفر کے دوران پاکستانی نائب سفیر کے مصنف کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مصنف کو: ''ایک روسی مصنف سرگئی پلیخا نوف کی لکھی ہوئی کتاب ایک اصلاح پسند بادشاہ A thronerefemer on the تحقیقاً پیش کی جو عمان کے موجودہ بادشاہ سلطان کابوس کی سوانح عمری کہی جا سکتی ہے۔ جس کی عوام پسند سوچ نے گزشتہ ۳۵ برس میں عمان کی کایا پلٹ دی۔''(۲۳۳) امجد اسلام امجد کا سفر نامہ کثیر الاقوامی سفر تھا اس سفر نامے میں انھوں نے اپنے پے در پے اسفار بھارت، جاپان اور دبئی وغیرہ، کا سفر کیا تھا۔ امریکا کے سفر نامے چوں کہ زیرِ مطالعہ نہیں ہیں اس لیے ان کا ذکر یہاں نہیں کیا جا رہا ہے۔ امجد اسلام نے ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا ہے جس کے اثرات براہ راست جنوبی ایشیا کے ممالک پر مرتب ہوئے، وہ یہ ہیں کہ: ''نائن الیون کے بعد سے اس کی آب و تاب پہلی سی نہیں کہ امریکی حکومت سکیورٹی کے معاملے میں بے حد حساس ہے اور اس کا سب سے زیادہ اثر ان کے تہواروں پر بڑا ہے۔'' (۲۳۴) عرب ممالک میں انگریزوں کے اجارہ داری ہر دور میں رہی ہے۔ سعودی عرب میں: ''جب سے سرزمین حجاز پر تیل نے دھاوا بولا ہے، تاریخ کے سوا وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔''(۲۳۵) کیوں کہ یورپ اور امریکا کے تیل کے تاجر سعودی عرب، خاص طور پر: ''مکہ معظّمہ میں انگریز کی بو! لیکن وہ بو اس قدر واضح تھی کہ مجھے شک پڑنے لگا کہ ہم مکہ معظّمہ کی بجائے کسی اور دور میں آوارد ہوئے ہیں۔''(۲۳۶) جس دور کے عرب کی صورتِ حال کا شورش کاشمیری نے ذکر کیا ہے۔ اُس دور میں: ''پاکستانی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل عبدالحمید یہاں آئے۔''(۲۳۷) ہوئے تھے۔

محمد اختر ممونکا، کے ''پیرس ۲۰۵ کلو میٹر'' اور ''سفر تین درویشوں کا'' سفر نامے ہیں۔ موخر الذکر سفر نامے میں محمد اختر ممونکا نے تھائی لینڈ، سنگاپور، کوالمپور، انڈونیشیا آسٹریلیا، جاپان اور فلپائن کے ممالک کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ اس سفر کا مقصد پاکستانی سیاحوں کے لیے ہوٹل کے کرایوں کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھے کرنا تھا۔ تاہم انھوں نے تاریخی واقعات کو بھی کسی قدر اہمیت دی ہے۔ اپنے سفر کے دوران، وہ تھائی لینڈ کی مختصر تاریخ کا ذکر کرتے ہیں کہ:

سیام، تھائی لینڈ کا قدیم نام ہے جو ۱۹۳۹ء کے جوجی انقلاب کے بعد بدلا گیا اس انقلاب نے اس ملک

پر تین گہرے اثرات چھوڑے پہلا تو یہ کہ خاندان چاکری کی دو سو سالہ شہنشاہیت کو آئینی طرز شہنشاہیت میں بدل دیا گیا۔ دوسرے ملک کا قدیم نام بدل دیا گیا اور تیسرے یہ کہ تھائی لینڈ سرکار برطانیا کے اثر سے نکل کر انکل سام یعنی امریکہ کے پہلو میں جا پہنچا۔(۲۳۸)

دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیا نے برِصغیر سے اپنی حکومت ختم کرنے کا اعلان کیا تو دوسری طرف اس کے ہمسایہ ملک سیام کو بھی آزادی دینے کا اعلان بھی کیا۔ سیام کا نام تھائی لینڈ رکھا گیا تھا: ''رستے میں سیام آیا۔ اب لوگ اسے نہیں جانتے، تھالینڈ کہتے ہیں۔''(۲۳۹) لیکن ایک بار پھر اسے سیام کا سرکاری اور علاقائی نام بحال کر دیا گیا۔ لیکن حکومتِ برطانیا نے تھائی لینڈ کو آزادی دینے کا منصوبہ ہندوستان کے بعد کا طے کیا تھا، اس نکتہ کی وضاحت Kenneth Scott LaTourette نے کی ہے کہ:

> On January 1,1946 an Anglo- Siamese agreement was signed. The agreement officially ended the state of war between the United Kingdom and India on the one hand and Siam on the other. (from 1945 to1949 Thailand was again officially called Siam.) Under the agreement among other provision, Siam Undertook or restore to Great Britain all territories seized form her after December 7. 1941.(۲۴۰)

ایشیائی اردو سفرنامے کے پیشِ نظر حکیم محمد سعید، محمد اختر ممونکا، ابنِ انشا اور علی سفیان آفاقی وغیرہ جنوبی مشرقی ایشیائی ممالک کے سفر کیے۔ حکیم محمد سعید جنوب مشرقی ایشیا کے سفر پر گئے تو ان کے سامنے گزشتہ تاریخ کے اوراق کچھ اس طرح تھے کہ: ''۱۹۲۴ء میں بحری اڈا بننا شروع ہوا جو ۱۹۳۸ء میں مکمل ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اسے مزید اہمیت حاصل ہوئی۔ وہ جاپانیوں کے خلاف جنوب مشرقی ایشیا اور انڈونیشیا کا ایک دفاعی مرکز بن گیا۔''(۲۴۱) حکیم صاحب نے سنگاپور پورٹ بننے کے بارے وضاحت کی ہے۔ تجارتی اور دفاعی بندرگاہ ہونے کے ناتے سے سنگاپور کو وہ اہمیت حاصل ہوئی کہ اس کا مدِ مقابل نہ تھا۔ اختر ممونکا نے ۱۹۶۷ء میں مشرقِ بعید کے ملکوں کا سفر اختیار کیا۔ سنگاپور کی تاریخی نکتہ نظر سے صورتِ حال بیان کرتے ہیں کہ: ''ریڈیو سنگاپور سے اس الوداعی پریڈ کا آنکھوں دیکھا حال نشر ہونے لگا تو مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ ۱۵۲ سال کے قبضے کے بعد برطانیا کی فوجیں ہمیشہ کے لیے سنگاپور سے روانہ ہو رہی تھیں۔ برطانیا کا آفتاب اپنی کرنیں سمیٹ کر مغرب کی جانب لوٹ رہا تھا۔ سامراجیت کے جنازے کو بڑی دھوم سے اُٹھایا جا رہا تھا۔''(۱۴۲) اختر ممونکا جب سنگاپور میں تھا تو انگریزی حکومت ختم ہونے کے مناظر اُن کی آنکھوں کے سامنے کے ہیں۔ حکومتِ برطانیا کے ختم ہونے اور ملائیشیا کی آزادی کی طرف پیش رفت ہونے کے آثار حکیم محمد سعید نے بھی محسوس کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ: ''سنگاپور میں بارہا

آیا ہوں۔ سب سے پہلا دورہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ ان دنوں سنگاپور میں انگریز کا چراغ گل کیے جانے کے سامان ہو رہے تھے۔"(۲۴۳) سنگاپور کے سفر کے بار میں حکیم محمد سعید اپنے سفرنامے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: "سنگاپور سب سے پہلے میں نے سنہ ۱۹۵۳ء میں دیکھا تھا اس وقت یہ ملایا کا اہم شہر تھا۔ بعد میں باہمی گفت و شنید سے سنگاپور ایک ملک بن گیا۔"(۲۴۴) حقیقت میں وہ مذکور دونوں سالوں ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں کسی سال سنگاپور میں تھے۔ امکان ہے کہ انھیں حافظے نے دھوکا دیا ہو۔ تاہم انھوں نے سنگاپور میں آزادی کی تحریک چلنے اور الگ ملک قائم ہونے کے بارے میں درست لکھا ہے۔ اس دور میں سنگاپور میں آزادی کے حصول کی کوششیں جاری تھیں۔ جس میں ہند چینی اور ملایا کے نمائندے سنگاپور کو الگ ملک کی حیثیت سے آزادی دلانے میں سرگرم تھے، جس نکتے کی کا ذکر حکیم محمد سعید نے کیا ہے۔ اس کی وضاحت Kenneth Scott LaTourette نے مشرقِ بعید کی تاریخ میں اس طرح کی ہے:

> In 1954 the United Malayan Organization and the Malayan Chinese Association sent representatives to London who requested that legislative council three-fifths of the members be elected. This British declined to grant. In elections in Singapore the victory of the Labor Front was followed by strikes and fomented by the communists in the federation a combination of the Malay National Organization, the Malayan Chinese Association, and the Malayan Indian Congress had as its goal self-government in two years and independence, although perhaps within the Commonwealth, in four years.(۲۴۵)

حکیم محمد سعید یہ کسی اپنے پہلے سفر کا ذکر کر رہے تھے۔ ورنہ وہ اسی ۸۰ کی دہائی میں دوبارہ سنگاپور گئے تھے۔ لیکن جب دوسری بار وہ سنگاپور کے سفر پر جاتے ہیں تو سنگاپور آزادی حاصل کر چکا تھا۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں: "سنگاپور آزاد مملکت بنا اور ملایا ملائیشیا بن گیا۔ اور اس کا دارالحکومت کوالالمپور منتقل ہو گیا۔"(۲۴۶) حکیم محمد سعید نے تو سفرنامے کے اسلوب میں سنگاپور کے تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو سنگاپور ۱۹۴۶ء میں آزادی حاصل کر کے الگ ملک بن گیا تھا۔ Kenneth Scott کے مطابق جاپان کی شکست کے بعد جزیرہ نما ملایا اور سنگاپور نے ملک کی حیثیت اختیار کرتے ہوئے کس طرح دوبارہ نوآبادی کا حصہ بنا:

> The defeat of japan was followed by the return of the

> English to their possessions in the Malay Peninsula and Singapore. The resumption of their rule gave the English an opportunity to make changes in their administration. On April 1st 1946, Singapore was separated from the Straits Settlements and become a distinct colony.(۲۴۷)

تاہم بعد کے دنوں میں بھی حکیم محمد سعید نے ۱۹۷۴ء میں بھی سنگاپور آنے کا ذکر کیا ہے۔اس دور میں سنگاپور میں خاصی ترقی ہوچکی ہوتی ہے۔حکیم صاحب کہتے ہیں کہ:''آزاد مملکت قائم کرنے کے بعد ایک فرد واحد مسٹر لی نے سنگاپور کو دنیا کا بہترین شہر بنا دیا تھا۔نظم ونسق کا یہاں عروج تھا تعمیر وترقی کا بازار گرم تھا۔دنیا کا سب سے بڑا ایورٹ عالم موجود میں آگیا تھا۔''(۲۴۸)

ایشیائی اردو سفرناموں میں فلپائن کا ذکر بھی تاریخی انداز میں ملتا ہے۔دوسری جنگ عظیم دوران میں فلپائنیوں نے امریکا کا ساتھ دیا تھا۔مگر جاپانیوں نے فلپائن میں امریکا کو شکست دیے کر تین سال تک ملک پر قبض رہے:''۱۹۴۵ء میں جنرل میکارتھر نے جب فلپائنیز پر دوبارہ قبضہ کیا تو قلعہ سین تسیا گو پر زبردست بمباری کی گئی۔کیوں کہ اس قلعے کے اندر جاپانیوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔''(۲۴۹) جاپان کی شکست کے بعد دنیا کا منظر نامہ کچھ اور ہی ہوگیا تھا۔بظاہر یہ جاپان کی شکست تھی لیکن حقیقت میں محوری طاقتوں کی شکست تھی۔کیوں کہ جنگ کے بعد سامراج کا خاتمہ ہوگیا تھا اور ایشیائی ممالک کو تیزی سے آزادی مل رہی تھی۔اسی مرحلے میں فلپائن کو بھی آزاد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔لیکن فلپائن سے جاپان کو بےدخل کرنے کے لیے امریکا نے ان کی مدد کی:

> The Defeat of the Japanese in the Philippines in the spring of 1945 and their expulsion from the island were followed by steps toward reconstruction. In them the Filipinos were assisted by the United States.(۲۵۰)

ایشیا میں جاپان کی شکست اور امریکا کی فتح کے ساتھ فلپائن کی عوام کا بھی فیصلہ ہوگیا تھا۔کیوں کہ امریکا نے:'' دوسری جنگ عظیم میں کئے گئے وعدے کے مطابق ۱۹۴۶ء میں فلپائنیز کو آزاد کرکے ری پبلک بنا دیا۔مگر امریکا نے اپنا اثر ورسوخ بھی قائم رکھا۔''(۲۵۱) فلپائن کی آزادی کی جو تاریخ طے کی گئی اُس کا ذکر Kenneth Scott نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> In June1945 the Philippine Congress reassembled. Its member had been elected in November 1941. On July 4, 1946, following the time schedule which had been projected

in 1934 by the Tydings-McDuffie Act the island become independence.(۲۵۲)

ایشیا میں فلپائن چوں کہ امریکا کی نوآبادی تھا اس لیے اس کی آزادی اور طرزِ حکومت بھی امریکا کی طرح کا تھا۔ فلپائن میں صدارتی نظامِ حکومت قائم ہوا جس کی وضاحت علی سفیان آفاقی نے اپنے سفرنامے میں اس طرح کی ہے: ''فلپائن کا ایک جمہوریہ ہے یہاں صدارتی طرزِ حکومت قائم ہے صدر کے عہدے کے لیے برائے راست انتخاب ہوتا ہے تو اپنے وزیرِاعظم اور کابینہ کے دوسرے ارکان کا تقرر کرتا ہے نیشنل اسمبلی کے نمائندوں کا انتخاب برائے راست الیکشن کے ذریعے کیا جاتا ہے۔''(۲۵۳) فلپائن کے صدارتی نظام کے تحت ۱۹۶۵ء میں مسٹر: ''مارکوس کو بڑی امیدوں اور آرزوں کے ساتھ عوام نے صدر منتخب کیا۔ تاکہ وہ فلپائن کی معاشی بدحالی کو سہار سکے۔''(۲۵۴) لیکن جس شخص پر عوام نے اعتبار کر کے ملک حوالے کیا تھا عوام کی امنگوں پر پورا نہ اُترا۔ ملک کے حالات کے پیش نظر صدارتی نظامِ حکومت ختم کر کے ۱۹۷۲ء میں: ''مارکوس نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کو چلتا کیا اور اپنی پسند کا آئین بنالیا۔''(۲۵۵) فلپائن میں مارشل لاء کے نظام کے قائم ہونے کے بعد ملک میں سیاسی عدم استحکام نے شدت اختیار کر لی تھی۔ عوام اور انتظامیہ سڑکوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھی: ''منیلا کی سڑکوں پر ایک جانب ایک آمر کے ٹینک تھے اور دوسری جانب ''پیپلز پاور'' یعنی عوام کی طاقت کہ جو حقیقت میں طاقت کا سرچشمہ ہیں۔''(۲۵۶) لیکن دوسری طرف ابن انشا بھی اسی دور میں فلپائن میں کچھ دن قیام کرتے ہیں۔ انھوں نے فلپائن کے مارشل لا کی کیفیت الگ اپنے انداز میں لکھی ہے کہ: ''آج کل فوج دکانوں پر جالیاں لگا رہی ہے اور سڑکوں پر جاڑو دے رہی ہے۔ یعنی جو بھی کسی نئے نئے مارشل لاء کے بعد ہوتا ہے کر رہی ہے۔''(۲۵۷) فلپائن میں قوانین کی تبدیلی اور قوانین کو رواج دینے کے لیے کوششیں کر رہی تھی۔ جس کا ذکر ابنِ انشا نے اس طرف کیا ہے: ''مارشل لاء کے حکام اور آرڈیننس روز نئے نئے نکلتے ہیں تعداد سینکڑوں میں ہے لفٹ میں سگریٹ پینے کی ممانعت جو درج ہے اس کے ساتھ آرڈیننس تیس نمبر ۱۰۸۸ لکھا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے ڈرے ہوئے ہم اپنے ہوٹل سے کم کم نکلتے تھے۔''(۲۵۸)

ایشیائی اردو سفرنامے کے پیشِ نظر بیسویں صدی کے آغاز میں ایشیائی ممالک آزادی کی تحریکیں شروع ہو چکی تھی۔ مطالعہ میں یہ بات آتی ہے کہ جاپان کی شکست کے بعد ایشیائی ممالک میں مرحلہ وار آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ خود جاپان تو امریکی نگرانی میں چلا گیا لیکن اہل ایشیا کو آزادی سے ہمکنار کر گیا۔ جنوبی ایشیا میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) نیپال، سری لنکا، مالدیپ اور برما کو ۱۹۴۵ء کے بعد آزادی ملنی شروع ہوئی۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، تھائی لینڈ، ویت نام، فلپائن، تائیوان اور کوریا کو اسی دور میں آزادی حاصل ہوئی۔ البتہ چین کو ۱۹۴۹ء میں آزادی ملی اور ہانگ کانگ کو بہت دیر بعد یعنی نوے کی دہائی میں برطانیہ کی اجارہ داری سے آزادی ملی۔ افغانستان کی آزادی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

ایران، عراق، شام، ترکی اور دیگر عرب اور وسط ایشیائی ممالک کو آزادی پچاس کی دہائی میں ملی۔ البتہ وسط ایشیائی ریاستوں کو دہری آزادی یعنی ۱۹۹۱ء کے بعد میں روس کے ٹوٹنے کے بعد ملی۔ اس طرح ایشیائی اردو سفرنامے میں کہیں نہ کہیں ایشیائی ممالک کی آزادی کی تحریکوں، آزادی ملنے کے مراحل اور اس طرح کے دیگر واقعات جو تاریخ سے تعلق رکھتے، مطالعہ میں ایک تسلسل کے ساتھ رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد سعید، حکیم، ایک مسافر چار ملک، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۳۷

۲۔ حمیداللہ، صاحب زادہ، پروفیسر، مختصر تاریخِ افغانستان، غزنوی پبلشرز، جناح روڈ، کوئٹہ، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۱

۳۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۴۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۵۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۶۔ محمد سعید، حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص ۳۳۷

۷۔ حمیداللہ، صاحب زادہ، پروفیسر، مختصر تاریخ افغانستان، ص ۲۳۲

۸۔ محمد سعید، حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص ۳۳۷

۹۔ حمیداللہ، صاحب زادہ، پروفیسر، مختصر تاریخ افغانستان، ص ۲۳۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۳۴۔۲۳۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۴۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۴۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۲۳۔ ایضاً،ص۲۵۵

۲۴۔ ایضاً،ص۲۵٦

۲۵۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور:۲۰۱۴ء،ص۵۹

۲٦۔ حمیداللہ،صاحب زادہ،پروفیسر، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲۵۷

۲۷۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص۱۵۸

۲۸۔ حمیداللہ،صاحب زادہ،پروفیسر، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲٦۸

۲۹۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص۱۷۸

۳۰۔ ایضاً،ص۲۰۴

۳۱۔ حمیداللہ،صاحب زادہ،پروفیسر،مختصر تاریخ افغانستان،ص۲٦۵

۳۲۔ ایضاً،ص۲٦۹

۳۳۔ https://reliefweb.int/report/afghanistan/a(مورخہ۱۳/اکتوبر۲۰۲۱،بوقت۵:۳۵)

۳۴۔ حمیداللہ،صاحب زادہ،پروفیسر، مختصر تاریخ افغانستان،ص۲٦۹

۳۵۔ محمد سعید،حکیم،ماہ وروز ، روزنامچہ سفرروس،ہمدرداکیڈمی،کراچی،۱۹۰۸ء،ص۱

۳٦۔ ایضاً،ص۵

۳۷۔ ایضاً،ص۵۔٦

۳۸۔ محمد سعید،حکیم، ماوراء البحار،ہمدردفاؤنڈیشن،کراچی،۱۹۹۰ء،ص٦۹

۳۹۔ ایضاً،ص۱۵۰

۴۰۔ ایضاً،ص۱۵۱

۴۱۔ ایضاً،ص۱۵۱

۴۲۔ ایضاً،ص۱۵۱

۴۳۔ ایضاً،ص۱۵۲۔۱۵۳

۴۴۔ محمد سعید،حکیم،ماہ وروز ، روزنامچہ سفرروس،ص۵۔٦

۴۵۔ مختار حسین فاروقی،انجینئر، جنوبی ایشیا میں مسلم بیدار ی کے سو سال،۱۹۱۰ءتا۲۰۱۰ء، قرآن اکیڈمی، جھنگ،۲۰۱۲ء،ص٦۹

۴۶۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات یو پبلیشرز، لاہور،۲۰۰۲ء،ص ۳۹۷

۴۷۔ ابن انشا، چلتے ہو تو چین کو چلیے ، اکیڈمی، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۶۷ء،اور پانزدہم،۱۹۸۹ء ص ۲۸

۴۸۔ ایضاً،ص ۲۸

۴۹۔ اشفاق احمد، سفرِ مینا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۸۳ء،ص ۱۱۲

۵۰۔ ایضاً،ص ۱۰۴

۵۱۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, 4th Ad, The Macmillan company Ltd. London, 1969, P.692-693

۵۲۔ امجد اسلام امجد، ریشم ریشم ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۶۶

۵۳۔ محمد سعید،حکیم، کوریا کہانی ، ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۰ء، کراچی،ص ۲۵

۵۴۔ Thames and Hunson, *China Lois Mitchison*, Thames and Hunson ltd, London,1966,Page#88

۵۵۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص ۲۹۶

۵۶۔ ایضاً،ص ۲۹۶

۵۷۔ محمد سعید،حکیم، کوریا کہانی ،ص ۴۵

۵۸۔ ایضاً،۴۶

۵۹۔ ایضاً،ص ۴۶۔۴۷

۶۰۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P. 722

۶۱۔ محمد سعید،حکیم، کوریا کہانی ،ص ۴۷

۶۲۔ ایضاً،ص ۸۴

۶۳۔ ایضاً،ص ۱۰۶

۶۴۔ ایضاً،ص ۱۱۲

۶۵۔ https://www.history.com/this-day-in-history/(مورخہ ۱۳/۱۰ اکتوبر ۲۰۲۱ء، بوقت ۵:۳۵)

۶۶۔ محمد اختر مونکا، سفر تین درویشوں کا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۳ء،ص ۱۸۷

۶۷۔ ایضاً،ص ۱۸۷

۶۸۔ علی سفیان آفاقی، دوران سفر، سارنگ، لاہور،۱۹۹۲ء، ص ۱۶۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۹۶۷

۷۱۔ مرتضی انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات، ص ۱۴۷

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۷۳۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، طاہر منصور فارق، مترجم تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۰

۷۴۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.654

۷۵۔ As Above P.654

۷۶۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۶۹

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۶۷۔۱۶۸

۷۸۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۳۴

۷۹۔ انتظار حسین، نئے شہر پرانی بستیاں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۹۵

۸۰۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، ص ۷۰

۸۱۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۶۸

۸۲۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری، ص ۱۴۱

۸۳۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، ص ۱۲۶

۸۴۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری، ص ۱۴۱

۸۵۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۷۰

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۸۷۔ Robin Jaffrey, *Asia the Winning the independence*, The Macmillan Press, London,1981.P100-101

۸۸۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، ص ۱۱۴

۸۹۔ ایضاً، ص ۵۹

۹۰۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۶۷

۹۱۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.654-655

۹۲۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۷۱

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۹۶۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۹۸۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۷

۹۹۔ محمد سعید، حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص ۱۲۶

۱۰۰۔ ممتاز مفتی، لبیک، ص۔ ۱۸۸

۱۰۱۔ ایضاً، ص۔ ۱۱۲

۱۰۲۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۸۵

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۰۴۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، ص ۹۶

۱۰۵۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۲۶۹

۱۰۶۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، ص ۳۵

۱۰۷۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۲۹۱

۱۰۸۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، دار التحقیق برائے علم و دانش، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۰۶

۱۰۹۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۲۹۲

۱۱۰۔ ایضاً۔ ص ۳۱۵

۱۱۱۔ محمد سعید، حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص ۱۲۶

۱۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری، ص ۲۰۲۔۲۰۳

۱۱۳۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، ص ۱۶۰

۱۱۴۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص ۴۳

۱۱۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، ، ص۔ ۱۳۷

۱۱۶۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں،اکیڈمی،لاہور،۱۹۹۱ء،ص ۶۸

۱۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص ۱۲۸۔۱۲۹

۱۱۸۔ انتظار حسین،نئے شہر پرانی بستیاں،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور:۱۹۹۹ء ص ۱۲۶

۱۱۹۔ ایضاً،ص ۱۲۶

۱۲۰۔ ایضاً،ص ۱۲۵۔۱۲۶

۱۲۱۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص ۲۹۱

۱۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص ۱۲۹

۱۲۳۔ https://www.daily-sunils//Poet-Nazrul(مورخہ ۲/اکتوبر ۲۰۲۱ء،بوقت رات ۲:۰۰ بجے)

۱۲۴۔ As Above,(ایضاً،)

۱۲۵۔ صدیق سالک،ہماں یاراں دوزخ،لاہور،۱۹۷۴ء،Urdu4U.com،ص ۴۶

۱۲۶۔ محمد اجمل نیازی، مندر میں محراب،پاکستان بکس،لاہور،۱۹۸۷ء،ص ۲۷۰

۱۲۷۔ انتظار حسین، نئے شہر پرانی بستیاں،ص ۱۲۶

۱۲۸۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص ۲۸۹

۱۲۹۔ محمد اجمل نیازی، مندر میں محراب،ص ۸۴

۱۳۰۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص ۱۲۸

۱۳۱۔ محمد اجمل نیازی، مندر میں محراب،ص ۲۷۰

۱۳۲۔ صدیق سالک،ہماں یاراں دوزخ،ص ۲۰۶

۱۳۳۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص ۳۲۸

۱۳۴۔ علی سفیان آفاقی،دورانِ سفر،ص ۵۳

۱۳۵۔ ایضاً،ص ۸

۱۳۶۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص ۱۷۷

۱۳۷۔ ایضاً،ص ۱۷۸

۱۳۸۔ علی سفیان آفاقی،دورانِ سفر،ص ۱۰

۱۳۹۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری،ص ۱۷۸

۱۴۰۔ ایضاً،ص ۱۷۷

۱۴۱۔ صدیق سالک،میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،ص ۲۰۶

۱۴۲۔ ایضاً،ص ۲۰۶

۱۴۳۔ ایضاً،ص ۲۰۶

۱۴۴۔ ایضاً،ص ۲۰۷

۱۴۵۔ ایضاً،ص ۲۰۷

۱۴۶۔ ایضاً،ص ۲۱۰

۱۴۷۔ محمد اجمل نیازی،مندر میں محراب،ص ۵۷

۱۴۸۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص ۳۴۹

۱۴۹۔ ایضاً،ص ۳۵۰

۱۵۰۔ ایضاً،ص ۳۵۱

۱۵۱۔ انتظار حسین،زمین اور فلک اور،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور:۲۰۰۹ء،ص ۷۹

۱۵۲۔ مستنصر حسین تارڑ،نیپال نگری،ص ۱۷۷۔۱۷۸

۱۵۳۔ محمد اجمل نیازی،مندر میں محراب،ص ۱۰۵

۱۵۴۔ ایضاً،ص ۲۷۰

۱۵۵۔ https://en.wikipedia.org/wiki/A._A._K._Niazi(مورخہ ۵/اکتوبر ۲۰۲۱ء، بوقت رات ۹:۰۰ بجے)

۱۵۶۔ علی سفیان آفاقی،دورانِ سفر،ص ۵۵

۱۵۷۔ ایضاً،ص ۳۲

۱۵۸۔ S Mahamud Ali, *Understanding Bangladesh*, Hurst & Company, London,2010. P# XV

۱۵۹۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص ۳۴۹

۱۶۰۔ ایضاً،ص ۲۶۵

۱۶۱۔ ایضاً،ص ۳۴۸

۱۶۲۔ ایضاً،ص ۳۵۱

۱۶۳۔ ایضاً،ص ۳۵۴

۱۶۴۔ ایضاً،ص۳۷۹

۱۶۵۔ ایضاً،ص۵٦٧

۱۶۶۔ ایضاً،ص۲۷۰

۱۶۷۔ محمد اجمل نیازی،مندر میں محراب،ص۵۷

۱۶۸۔ ثریا حفیظ الرحمٰن،جس دیس میں گنگا بہتی ہے،ص۷۰

۱۶۹۔ انتظار حسین،نئے شہر پرانی بستیاں،ص۴۱

۱۷۰۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے،ص۲۰۹

۱۷۱۔ ایضاً،ص۲۰۲

۱۷۲۔ ایضاً،ص۲۰۰

۱۷۳۔ ایضاً،ص۲۱۲۔۲۱۳

۱۷۴۔ ایضاً۔ص۱۳۲

۱۷۵۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۳۵۷۔۳۵۸

۱۷۶۔ ایضاً،ص۳۵۸

۱۷۷۔ ثریا حفیظ الرحمٰن،جس دیس میں گنگا بہتی ہے،ص۱۳۶

۱۷۸۔ ایضاً،ص۱۳۷

۱۷۹۔ ایضاً،ص۱۲۸

۱۸۰۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۳۵۸

۱۸۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن،جس دیس میں گنگا بہتی ہے،ص۱۴۳

۱۸۲۔ انتظار حسین،نئے شہر پرانی بستیاں،ص۷۵

۱۸۳۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۴۰۳

۱۸۴۔ انتظار حسین،نئے شہر پرانی بستیاں،ص۵۱

۱۸۵۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۴۰۳

۱۸۶۔ ایضاً،ص۴۰۳

۱۸۷۔ انتظار حسین،نئے شہر پرانی بستیاں،۱۹۹۹ء،ص۸٦

۱۸۸۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۴۰۴

۱۸۹۔ ایضاً،ص۴۰۳

۱۹۰۔ ایضاً،ص۴۰۴

۱۹۱۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص۱۸۵

۱۹۲۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.655

۱۹۳۔ ثریا حفیظ الرحمٰن،جس دیس میں گنگا بہتی ہے،ص۱۴۶

۱۹۴۔ ایضاً،ص۲۲۰

۱۹۵۔ محمد اجمل نیازی، مندر میں محراب،ص۱۵۶

۱۹۶۔ ایضاً،ص۲۵۷

۱۹۷۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے،ص۲۴۲

۱۹۸۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.655

۱۹۹۔ آئین ٹالبوٹ،تاریخِ پاکستان،ص۱۸۵

۲۰۰۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۱۶۲

۲۰۱۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.655

۲۰۲۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان،ص۱۸۲

۲۰۳۔ علی سفیان آفاقی، دورانِ سفر،ص۶۳

۲۰۴۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P. 664

۲۰۵۔ علی سفیان آفاقی،دورانِ سفر،ص۶۱

۲۰۶۔ ایضاً،ص۶۰

۲۰۷۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.665

۲۰۸۔ علی سفیان آفاقی، دورانِ سفر،ص۷۱

۲۰۹۔ ایضاً،ص۷۳

۲۱۰۔ ایضاً،ص۷۳

۲۱۱۔ ایضاً،ص۷۳

۲۱۲۔ ایضاً،ص۲۸

۲۱۳۔ مرتضیٰ انجم،بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۲۲۶

۲۱۴۔ انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم،ولیم ایل لنگر،مولف،مولانا غلام رسول مہر،مترجم،جلد ۴،الوقار پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۰ء،ص۸۲۵

۲۱۵۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات،ص۲۲۶

۲۱۶۔ علی سفیان آفاقی، ایران یاترا،ص۴۹

۲۱۷۔ ایضاً،ص۹۷

۲۱۸۔ ایضاً،ص۱۲۴

۲۱۹۔ https://irak.pk/tag/iran-iraq-war/(مورخہ ۵/اکتوبر ۲۰۲۱ء،بوقت،دن دو بجے)

۲۲۰۔ علی سفیان آفاقی،ایران یاترا،ص۱۲۴

۲۲۱۔ ایضاً،ص۷۹

۲۲۲۔ شورش کاشمیری،شب جائے کہ من بودم،مطبوعاتِ چٹان،لاہور،۲۰۱۰ء،ص۱۹۰

۲۲۳۔ ایضاً،ص۱۹۲

۲۲۴۔ ایضاً،ص۱۸۵

۲۲۵۔ ایضاً،ص۱۹۷

۲۲۶۔ ایضاً،ص۱۹۲۔۱۹۳

۲۲۷۔ Hedley V. Cooke, *Israel A Blessing and Curse*, Stevens and Sons Limited, London 1960, P#19)

۲۲۸۔ شورش کاشمیری،شب جائے کہ من بودم،ص۱۹۱۔۱۹۲

۲۲۹۔ ایضاً،ص۱۹۴

۲۳۰۔ ایضاً،ص۱۹۷

۲۳۱۔ Hedley V. Cooke, *Israel A Blessing and Curse*, P#10

۲۳۲۔ امجد اسلام امجد،چلو جاپان چلتے ہیں،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص۲۰۶

۲۳۳۔ ایضاً،ص۲۰۶

۲۳۴۔ ایضاً،ص۱۸۶

۲۳۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، ص۔۴۵

۲۳۶۔ ایضاً، ص۔۵۹

۲۳۷۔ شورش کاشمیری، شب جائے کہ من بودم، ص۱۷۵

۲۳۸۔ محمد اختر مونکا، سفر تین درویشوں کا، ص۲۱

۲۳۹۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص۹۹

۲۴۰۔ Kenneth Scott LaTourette, A History of the Far East, P.٦٦٨

۲۴۱۔ محمد سعید حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص۱۲۱

۲۴۲۔ محمد اختر مونکا، سفر تین درویشوں کا، ۲۷

۲۴۳۔ محمد سعید حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص۱۲۳

۲۴۴۔ ایضاً، ص۲۲۴

۲۴۵۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.671

۲۴۶۔ محمد سعید حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص۱۲۴

۲۴۷۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.669

۲۴۸۔ محمد سعید حکیم، ایک مسافر چار ملک، ص۱۲۴

۲۴۹۔ محمد اختر مونکا، سفر تین در ویشوں کا، ص۲۳۴

۲۵۰۔ KennethScott LaTourette, *A History of the Far East*, P. 686

۲۵۱۔ محمد اختر مونکا، سفر تین درویشوں کا، ص۲۳۴

۲۵۲۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, P.687

۲۵۳۔ علی سفیان آفاقی، دورانِ سفر، ص۹۹

۲۵۴۔ محمد اختر مونکا، سفر تین در ویشوں کا، ص۲۳۵

۲۵۵۔ ایضاً، ص۲۳۵

۲۵۶۔ ایضاً، ص۲۳۵

۲۵۷۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، ص۸۱

۲۵۸۔ ایضاً، ص۹۱

باب پنجم:

ماحصل

الف: منتخب ایشیائی اردو سفرناموں میں تاریخی عناصر کا مجموعی جائزہ

برِاعظیم ایشیا سے تعلق رکھنے والے سفرناموں اور تاریخ کی کتب کا مطالعہ کرنے سے یہ وضاحت سامنے آتی ہے کہ سفرنامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں تہذیب کے متنوع عناصر، کلچر کے منفرد اور رنگا رنگ اجزا؛ ادبی محفلوں کا انعقاد؛ شاعروں کے مشاعروں کی چاشنی؛ لسانی تشکیلات کی انوکھے پہلو؛ فطرت کے حسین نظارے اور تاریخی عمارتوں کی قدامت اور وجاہت کے ساتھ ساتھ سفرنامے میں تاریخی واقعات کا ایک وسیع سلسلہ بھی موجود ہے۔ اردو سفرنامہ کو ادب میں وہ مقام ومرتبہ تو حاصل نہیں ہے جو ادب کی دوسری اصناف ناول، افسانہ، شاعری اور داستان وغیرہ، کو حاصل ہے۔ اگرچہ سفرنامہ میں ادبی اصناف کی تاثیریت، لطف اور چاشنی نہیں ہوتی تاہم حالات واقعات حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ سفرنامہ ادب میں طوالت کے لحاظ سے ناول سے مناسبت رکھتا ہے۔ ناول کا ایک مخصوص پلاٹ ہوتا ہے، کردار، قصہ در قصہ واقعات، زمانی ترتیب، آغاز اور اختتام اور مرکزی کردار ہوتا ہے۔ سفرنامے کا آغاز مسافر کے سفر سے ہوتا ہے۔ اس میں بھی ایک طرح کے کردار نمودار ہوتے ہیں۔ سفرنامے کا مخصوص زمانہ ہوتا ہے، تاریخ، تہذیب، معاشرت، کلچر اور مناظرِ فطرت سفرنامے کے بنیادی اجزا ہوتے ہیں۔ سفرنامے کا اختتام بھی مسافر کے سفر کے اختتام کے ساتھ ہی ہوتا ہے سب سے اہم بات یہ کہ سفرنامے کا مرکزی کردار بھی ہوتا ہے اور وہ خود سفرنامہ نگار ہوتا ہے۔ ادب میں سفرنامہ، داستان سے قریب تر ہے۔ لیکن داستان کا کینوس ناول سے وسیع ہوتا ہے۔ سفرنامہ ناول کی طرح تاریخ، تہذیب، معاشرت، کلچر وغیرہ، پر مشتمل ہوتا ہے۔ اردو ناول کے بعد سفرنامہ کسی بھی صنفِ نثر کے مقابلے میں تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے اردو ادب میں سفرنامے کا مقام ومرتبہ تو ہے لیکن ایک جدا حیثیت سے ہے۔

اردو سفرنامے کے کا احاطہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے چھ برِاعظم ایسے ہیں، جن پر انسان بستا ہے۔ ان برِ

اعظموں میں سیکڑوں ممالک ہیں۔ ان ممالک میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان سے لوگ سیر و سیاحت کے لیے نہ گئے ہوں۔ صرف برِ اعظم ایشیا کے چھے خطے ہیں، ہر خطے کی نوعیت دوسرے خطے سے مختلف ہے۔ اس طرح سفر نامہ میں دلچسپی کے اجزا وسیع پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ سفر نامے کے ساتھ چوں کی تاریخی عناصر کا متوازی مطالعہ ہے اس لیے اردو سفر نامہ اور تاریخ کو سمجھنے کے لیے ان کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے متعلق سمجھ بوجھ حاصل کی گئی ہے۔ پھر اردو سفر نامہ اور تاریخ کی تعریف کا مطالعہ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ خاص طور پر تاریخ کی ایک سے زیادہ زبانوں میں تعاریف کا مطالعہ کیا گیا ہے اور تاریخ کے مفکرین جیسے ویچو، کانٹ، ہرڈر، کارل مارکس، اسپنگلر، کوئٹے اور ابنِ خلدون کے تاریخی سے مطلق تصورات بھی زیرِ مطالعہ آئے لائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقالہ کی تسوید کے دوران سفر نامے کو تاریخی عناصر کی روشنی میں زیرِ تحقیق لایا گیا ہے۔ سفر نامے میں شعوری اور لاشعور طور پر بروئے کار لانے والے تاریخی واقعات کو تاریخ کے مقابل شواہد سے ثابت کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ اپنے موضوع کے الحاظ سے زمانی، مکانی اور مطالعاتی سطح پر وسعت رکھتا ہے۔ ایشیائی اردو سفر نامے میں تاریخی عناصر کی تلاش، پھر ان عناصر کی تاریخ کی رو سے بہ تحقیق، وضاحت، تجزیہ اور تنقیدی مطالعہ، مقالہ ہذا کا دائرہ کار رہا ہے۔

مقالہ ہذا کی تسوید، سفر نامے کے تاریخی عناصر کی بنیاد پر ہے۔ اس لیے ایشیائی اردو سفر نامہ کی مقالہ ہذا کی تحدید زمانے ابتدا سے ۲۰۱۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر یہ دو صدیوں کا عرصہ بنتا ہے۔ ایشیائی اردو سفر نامے میں ہر ملک، ہر خطے اور ہر نوعیت کے سفر نامے شامل ہیں۔ مراد بیرونِ ملک سفر کرنے کے کچھ نہ کچھ مقاصد ہوتے ہیں جن کے تحت سفر نامہ لکھا جاتا ہے۔ ادبی تقریبات میں شرکت؛ خالص سیر سیاحت؛ تعلیمی اور تدریسی؛ جنگی مقاصد اور کاروباری مقاصد کے پیشِ نظر لکھے جانے والے سفر نامے شامل ہیں۔ ایشیا کے مذکور نوعیت کے سفر ناموں میں کئی ایک دیگر عناصر کے علاوہ سیاسی اور سماجی تاریخ کے عناصر سامنے آتے رہے ہیں۔ انھیں متعلقہ خطے کی تاریخ کی روشنی میں مصدقہ قرار دینے کے لیے تاریخی مواد بھی زیرِ مطالعہ آیا ہے۔

موضوع کے انتخاب کے لحاظ سے ایشیائی اردو سفر نامے میں اگرچہ سفر ناموں کا تاریخی عناصر کے لحاظ سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ سفر ناموں کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ جہاں پر سفر نامے میں تاریخی عناصر کثرت سے موجود ہیں۔ خاص طور پر مذہبی سفر نامے جن کی بنیاد حج اور عمرہ پر تھی، ان سفر ناموں میں وہ تاریخی عناصر بھی زیرِ مطالعہ آئے ہیں جن کا تعلق مذہبی عناصر سے تھا۔ اس نوعیت کے سفر ناموں میں تاریخی عناصر میں تکرار ہونے کا امکان تھا۔ تکرار سے بچنے کے لیے اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخی عناصر کو زمانی ترتیب کے ساتھ تاریخی حوالہ جات کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ جس میں حتی الامکان کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ایشیائی اردو سفر نامے میں ایشیا کے پچاس کے قریب ملک

شامل ہیں جن میں برِاعظم ایشیا کا رقبہ اور آبادی دنیا کے دوسرے برِاعظموں سے زیادہ ہے۔ ایشیا کے مختلف خطے شمالی، مشرقی، وسطی، جنوبی، مشرقِ وسطیٰ اور مغربی ایشیا پر مشتمل ہے۔ ایشیا مشرق میں بیرنگ بحر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ شمالی ایشیا میں روس، شمالی چین اور منگولیا موجود ہیں۔ مغربی ایشیا جزیرہ نما عرب اور مشرق وسطی کے بیشتر ممالک پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ آرمینیا، آذربائیجان، بحرین، قبرص، جارجیا، ایران، عراق، اسرائیل، اردن، کویت، لبنان، عمان، قطر، سعودی عرب، فلسطین کی ریاست، شام، ترکی، متحدہ عرب امارات اور یمن شامل ہیں۔ وسطی ایشیا میں افغانستان، قازقستان، کرغزستان، تاجکستان، ترکمنستان اور ازبکستان کے ممالک شامل ہیں۔ مشرقی ایشیا میں چین، جاپان، کوریا (شمالی)، کوریا (جنوبی)، منگولیا اور تائیوان کے ممالک شامل ہیں۔ جنوبی ایشیا میں بنگلہ دیش، بھوٹان، ہندوستان، مالدیپ، نیپال، پاکستان اور سری لنکا شامل ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں برونائی دارالسلام، کمبوڈیا، انڈونیشیا، لاؤ، ملائیشیا، میانمار (برما)، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ، تیمورلیسٹی اور ویت نام شامل ہیں۔ برِاعظم ایشیا میں تہذیبی، تمدنی، لسانی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی لحاظ سے تنوع پایا جاتا ہے۔ اس خطے میں چار سپر پاور ممالک ہیں۔ مذہبی لحاظ سے اسلام۔ عیسائیت، ہندوازم، جین، بدھست، آتش پرست، دیریت اہم مذاہب ہیں۔ عربی، اردو، فارسی، ترکی، ہندی، چینی، روسی، جاپانی، ملائی، تھائی، کوریائی اور ویت نامی بڑی زبانیں ہیں تاہم سیکڑوں صوبائی اور علاقائی زبانیں رائج بھی ہیں۔

ایشیاء کے متنوع خطے میں جس طرح کئی ممالک، لاتعداد زبانیں اور تاریخی واقعات کی صورتِ حال مختلف تھی۔ اس طرح سے اردو سفرنامے کے تناسب کے لحاظ سے ایشیا کی تاریخ کی کتب اردو زبان میں دست یاب نہیں ہوسکیں۔ انھی وجوہات کی بنا پر ایشیا کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے انگریزی کتبِ تاریخ کا سہارا لینا پڑا۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ انگریزی حوالہ جات کا کچھ نہ کچھ مفہوم اردو زبان میں بیان کر دیا ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اردو کے مقالے پر انگریزی کا مقالہ ہونے کا گمان نہ رہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مقالہ ہٰذا کی تفہیم میں مشکل درپیش نہ ہو۔

مقالہ ہٰذا کی تسوید کے دوران سفرناموں کے مطالعہ سے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ خاص طور پر یوسف کمبل پوش کا ایک اور ایشیا سے تعلق رکھنے والا سفرنامہ سیر ملک اُودھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ مذکور سفرنامہ ڈاکٹر تحیبہ عارف صاحبہ کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مذکور سفرنامے میں اُودھ کی ریاست کے سیاسی حالات اور معاشرتی صورتِ حال علاوہ ریاستِ اودھ کے زوال کے اسباب کا تاریخی نکتہ نظر سے ذکر ہے۔ اس کے علاوہ سفرنامے اور تاریخ کے شواہد کی روشنی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے اسباب اور عوامل سامنے آئے ہیں۔ سرٹامس رو نے جس کوشش اور چاپلوسی کے ساتھ شہنشاہ جہانگیر سے ایسٹ انڈیا کی کمپنی کے لیے تجارت کا اجازت نامہ حاصل کیا اور کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔ مطالعہ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ایشیا کی تاریخ کے ابھی کتنے گوشے ایسے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہیں۔ درحقیقت

ایشیا کی تاریخ کا بہت کم حصہ اردو میں ترجمہ کی صورت میں ملتا ہے۔ ایشیائی ممالک کے اہم اہم تاریخی واقعات کا ذکر سفرناموں کے توسط سے ملتا ہے۔ حتیٰ کی چین پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے۔ لیکن چین کی سیاسی اور سماجی تاریخ ہمارے پاس اخباروں کے شہ سرخیوں کے سوا موجود نہیں ہے۔ ایشیا کے دیگر خطوں کا کیا ذکر کہ بنگلہ دیش کی تاریخ سے بھی بس ۱۹۷۱ء تک اصل واقفیت ہے۔ سفرناموں میں تاریخی عناصر، کسی تاریخ کی نوعیت کے مطابق نہیں ملتے بس تاریخ کے حوالے سے ذکر ملتا ہے۔ سفرناموں میں بعض اوقات بڑے بڑے واقعات کی رونمائی کے حساب سے تاریخ میں ذکر ملتا ہے۔ جیسے کالا پانی جزیرے میں وائسرائے کے قتل، پہلی جنگِ عظیم سے قبل ریشمی تحریک اور بنگلہ دیش کا پاکستان سے علیحدہ ہونے جیسے واقعات مطالعے میں آتے ہیں۔ بعض اوقات سفرنامہ نگار کسی تاریخ واقعہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتا ہے۔ اور اُس کے پس منظر میں تاریخ کا بڑا واقعہ چھپا ہوتا ہے۔ اس طرح کا تحریر انداز، مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین اور ابن انشا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ جیسے کہ کسی جگہ انشا کا تھائی لینڈ سے کہیں گزر ہوا تو انھوں نے لکھ دیا ''یہاں پر کسی زمانے میں سیام ہوا کرتا تھا اب تھائی لینڈ واقع ہے۔'' تو مراد یہ ہے آزادی سے پہلے کے حالات اور بعد کی صورت حال دونوں میں تبدیلی آ گئی ہے۔ اِن بات کے پس منظر میں جا کر چند ایک ضروری تاریخی واقعات کا تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل بیان کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ایشیائی اردو سفرنامے کے مطالعہ کے دوران مغربی ایشیائی ممالک کی سیاسی اور سماجی تاریخی صورتِ حال دوسرے ممالک سے کافی حد تک مختلف تھی۔ چوں کہ مغربی ایشیائی میں زیادہ تر ممالک عرب ہیں۔ عرب ممالک کی تاریخ میں بہت زیادہ اُتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں۔ خاص طور پر ایران، عراق، شام، فلسطین، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات ایسے ممالک ہیں جو جنگ عظیم دوم میں بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اردو سفرنامے کے توسط سے مطالعے میں یہ بات آئی ہے کہ رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایران کے مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حالات کی ابتری کی بنا انقلاب آیا۔ عراق پر صدام حسین کی فوجی حکومت نے جہاں ملک کے لیے مثبت اثر ڈالا وہاں پر سامراجی طاقتوں کو صدام حسین کی عراق پر اجارہ داری بالکل پسند نہ آئی۔ جس کے نتائج ایران وعراق جنگ اور بعد میں امریکا کے عراق پر حملہ مسلط کرنے کی صورت میں آشکار ہوئے۔ شام پر روس کے اثرات زیادہ تھے تاہم بشار الاسد کی بادشاہت قائم ہونے کے ساتھ امریکا کو خطرات لاحق ہوئے۔ فلسطین پر اسرائیل کو ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیا گیا تھا۔ جنگِ عظیم کے خاتمے پر برطانوی استعمار نے یہویوں کو فلسطین میں آباد ہونے کے لیے سبز جھنڈی دیکھا دی تھی۔ جس کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کو اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔ عرب امارات کی جہاں تک بات ہے تو ان کے حالات واقعات محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کے ساتھ وابسطہ ہیں۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ حجاز ونجد کی سر زمین پر ترکی کی حکومت تھی۔ لیکن مطالعے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کس طرح حجاز میں پھیلی۔ آل سعود انگریزوں کی معاونت سے شریف حسین کی حکومت کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ برطانیا، عرب اور

مصر سے ترکی بساط لپٹنے میں آل سعود کی مدد سے آخر کار کامیاب ہو ہی گیا۔ لیکن اس سے پہلے برطانیا کے جاسوس جان برکاٹ اور لارڈ آف عربیہ، ایلن نبی اور دیگر بہت سے بیرونی و اندرونی جاسوس بھی تھے جو برطانیا کے مفادات کے لیے کام کر رہے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے تابوب میں آخری کیل ٹھونکنے کا سامان کر رہے تھے۔ اسی دور میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن حجاز میں ترکی کے گورنر غالب سے ملاقات کے لیے گئے تاکہ ترکی، ایران اور افغانستان میں اتحاد پیدا کیا جاسکے۔ لیکن اُس دور میں حجاز میں شریف حسین کی حکومت تھی، اُس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو انگریزوں کے حوالے کردیا جنھیں پانچ سال تک جزیرہ مالٹا میں قید کاٹنی پڑی۔ اس طرح ریشمی رومال تحریک کی ساری کہانی ختم ہو کر رہ گئی۔ اگر ریشمی رومال تحریک کامیاب ہو جاتی تو آج برِصغیر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا جس کی کامیابی میں علمائے ہند کا نام سرِفہرست ہوتا۔

ریشمی رومال تحریک کی ناکامی اور پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر ترکی کی ساخت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ترکی کی وسیع سلطنت کو امریکا، فرانس اور برطانیا نے آپس میں بانٹ لیا۔ بلقانی ریاستیں پہلے ہی آزادی حاصل کر چکی تھیں۔ دنیا کے دیگر ممالک میں آزادی کی تحریکیں بیدار ہو چکی تھیں۔ جس میں ہندوستان پیش پیش تھا۔ عرب ممالک میں وہ جوش اور ولولہ تو نہ تھا لیکن پھر بھی عوام کے اندر کہیں نہ کہیں آزاد حاصل کرنے کے محرکات اجاگر ہو چکے تھے۔ ایران اور افغانستان ایک طرف روس کے زیرِ اثر تھے اور دوسری طرف ہندوستان کے ساتھ سرحدیں جڑی ہوئی تھیں۔ جس میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریزوں کے روس کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ جس کی وجہ سے افغانستان اور ایران کے درمیان میں پستے رہتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی اور جاپان آپس میں اتحادی بنا کر تمام طاقتور سامراجی ممالک کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ جنگ میں جاپان کو تباہی کے ساتھ شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ یورپ میں جرمنی ایک مرتبہ پھر شکست سے دوچار ہوا۔ جاپان کی شکست کے ساتھ دوسری عالمی جنگ کا کھیل اختتام پذیر ہوا۔ انگریزوں نے اپنی فتح سے مشروط ایشیائی اقوام سے آزادی کے وعدے کیے تھے۔ اب انھیں پورا کرنے کے وقت آ گیا تھا۔ ایک طرف آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں دوسرا سامراجی ممالک پر امریکا کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ اس طرح ایشیائی مماک میں جہاں دوسرے ممالک کو آزادی جیسی نعمت سے خوشی کا احساس بڑھا وہاں پر ہندستان کی آزادی نے ہجرت اور قتل و غارت گری کے واقعات سے تاریخ رقم کی۔ دنیا کے درجنوں ممالک برطانیا، امریکا، فرانس وغیرہ سے آزاد ہوئے ہیں لیکن اس طرح آپس میں قتل و غارت گری کی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی۔ تاہم ایشیا میں مغربی ایشیا سے لے کر مشرقِ بعد تک کے ممالک شمال میں چین سے لے کر جنوبی ایشیا تک ۵۰ء کی دہائی میں آزاد ہوئے تو ان کے یہاں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ عوامی کی نئی امیدیں اور امنگیں جاگ اُٹھیں۔ صرف ملائیشیائی اور ہانگ کانگ کو آزاد سے دیر بعد آشنا ہونا پڑا، ملائیشیا ۶۶ء اور ہانگ کانگ ۹۲ء کے قریب قریب آزاد ہوئے۔

ایشیائی ممالک کی آزادی کے بعد ایشیا ایک نئی غلامی میں جانے والا تھا۔ یہ غلامی امریکا کی طرف سے بیرونی اور بین الاقوامی فنڈنگ اور قرضہ جات کی صورت میں تھی۔ اسی امداد اور معاونت کے پسِ پردہ امریکا نے ایشیا میں نیو ورلڈ آرڈر کا کھیل کھیلا تھا جو آج تک جاری ہے۔ ایشیائی ممالک میں اپنی مرضی کی انتظامیہ لانا اور اپنی مرضی کی تحریکیں چلانا امریکا کی دلچسپی کا باعث بنیں۔ اسی بنا پر امریکا نے ایشیا کے عرب ممالک اور جنوبی ایشیا میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس دنیا کی دوسری سپر طاقت بن کر امریکا کے سامنے آ گیا۔ جو بات امریکا کو بالکل ناگوار گزری۔ روس کے افغانستان پر فوج کشی کی مشق کے موقعہ پر بلاواسطہ روس کے خلاف ہو گیا۔ افغان جہاد کے لیے جہادی گروپس تیار کیے۔ روس کو شکست دینے کے بعد امریکا پھر جہادی گرہوں کو ختم کرنے کے لیے افغانستان پر حملہ آور ہوا۔ امریکا ایک طرف یہ کھیل بیس سال تک کھیلتا رہا دوسری طرف لیبیا اور عراق کی آمرانہ حکومت کو ختم کرنے کے بعد شام اور ایران پر حملے کے لیے پر تولتا رہا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے اعلامیہ کی بنا پر امریکا ایشیا کے بہت سے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ عرب ممالک اسی وجہ سے سہمے ہوئے ہیں۔ لیکن اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ امریکا کی اجارہ داری بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اب دنیا کی دوسری بڑی طاقت چین بن کر ابھر رہا ہے اور اس بات کا اظہار اُس نے کئی ایک انداز سے کیا ہے۔ چین، امریکا میں بیماریاں پھیلا کر، موسمیاتی تبدیلیوں پر قابو پا کر اور خلا میں اپنی جنگی اور فوجی چھاونی قائم کر کے بتا رہا ہے کہ وہ سپر طاقت ہے۔

اردو سفر نامہ گزشتہ دو دہائیوں سے جامعات میں توجہ کے لائق سمجھا جا رہا ہے۔ محققین اور ناقدین نے سفر نامے میں بھی تحقیق کی کئی ایک پہلو تلاش کر لیے ہیں۔ بصورتِ دیگر اس سے قبل تو اردو شاعر، افسانہ، ناول، داستان اور خود تنقید اور تحقیق کے موضوعات پر کام کرایا جاتا تھا۔ ان سیدھے سادے موضوعات کے علاوہ پیچیدہ اور تکنیکی لحاظ سے تجزیاتی نوعیت کے موضوعات کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ جن میں ماڈرنازم اور پوسٹ ماڈرنازم کے موضوعات ہیں۔ ان تمام تر جوازات کے باوجود اردو سفر نامے کی اپنی ایک مخصوص اہمیت ہے۔ موجودہ دور میں سفر نامے سے چند ایک کتابیں چھپ چکی ہیں جو سفر نامے کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اسلام آباد ۱۹۸۷ء

اردو ادب میں سفر نامہ، از ڈاکٹر انور سدید، لاہور، ۱۹۸۷ء

اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، از ڈاکٹر قدسیہ قریشی، دہلی ۱۹۸۷ء

الزبیر سفر نامے، سہ ماہی ۹۸-۱۹۹۷ء، سفر نامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶، ۳۷، مدیر: شاہد حسن رضوی اردو اکادمی بہاولپور، ۱۹۹۸ء

اردو سفرناموں کے تنقیدی مطالعہ، از خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

آزادی کے بعد اردو سفرنامہ، از سعید احمد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۲ء

مذکورہ بالا کتب میں دو کتابیں پاکستان میں شائع ہوئیں ہیں اور تین بھارت میں۔ بھارت میں سفرنامے پر شائع ہونے والی کتابیں ایم فل اور پی ای ڈی کے مقالہ جات تھے۔ ایک رسالہ الزبیر ہے جس میں سفرنامے پر متعدد مضامین ہیں۔اس کے علاوہ موجودہ دور میں پاکستان کی جامعات میں سفرنامے کی طرف توجہ مبذول ہوئی ہے۔اس سلسلے میں علامہ اقبال یونی ورسٹی پیش پیش ہے جس نے اردو سفرناموں پر اب تک ایم فل کے پانچ مقالات مکمل کرا دیے ہیں، ان مقالہ جات کی فہرست مع مقالہ نگار ذیل میں ہے:

اردو میں خواتین کے سفرنامے، از بشریٰ علم الدین، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

پاکستان میں حج کے سفرناموں کا جائزہ، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء، از جاوید محمود سہو، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اندلس کے اردو سفرنامے، تحقیق وتنقیدی مطالعہ، از ذوالفقار احمد، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو ادب میں ایران کے سفرنامے، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، از شبیلہ کوثر، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کتب سفرنامہ کا توضیح اشاریہ + ضمیمہ، از سید قمر عباس، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

سفرنامے پر تحقیقی کام پی ایچ ڈی کی سطح پر نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد میں دو پی ایچ ڈی کے مقالات اور ایک عدد پی ایچ ڈی پر مقالہ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں میں مکمل ہو چکا ہے۔اور دوسرا مقالہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ان مقالات کی فہرست ذیل میں ہے:

''پاکستانی اسفار پر مبنی اردو سفرنامہ'' تحقیقی وتنقیدی جائزہ، از محمد ساجد نظامی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد ۲۰۱۲ء

''اردو سفرنامے میں تہذیبی شعور، ۲۰۱۰ء تک''، از شازیہ ارم، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

''نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفرناموں'' سیاسی وسماجی مطالعہ از مسز روبینہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۲۰ء

امکان ہے کہ مذکورہ بالا تحقیقی کام کے علاوہ بھی سفرنامے پر کام ہوا ہو جو مقالہ نگار کے علم میں نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پاکستان اور بھارت کی جامعات میں سفرنامے کے کسی پہلو پر کام کرایا جا رہا ہے جو تھوڑے وقت کے بعد منظرِ عام پر آ جائے۔مقالہ نگار کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سفرنامے پر تحقیقی وتنقیدی کام کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

ہر ایک برِ اعظم، براعظم کے کسی ایک خطے کے سفرناموں پر موضوعات کو ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ وطنِ عزیز اور ہمسایہ ملک کی جامعات میں کئی ایک موضوعات پر کام کیا جا چکا ہے۔ لیکن سفرنامے کو ابھی تک اردو ادب میں وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جو ملنا چاہیئے تھا۔ حالاں کہ سفرنامہ بھی دوسری اصناف طرح بہت وسیع ہے۔ نقاد اور محققین کی توجہ کا مرکز نہیں بنا اس لیے ادب کی صف میں شامل نہیں ہو سکا ہے۔ سفرنامے کے قاری کا یہ اصرار ہے کہ سفرنامہ ایک ادبی صنف ہے۔ مگر سفرنامے کا ادبی صنف ہونے کے لیے اس کا مقام و مرتبہ ایک نقاد اور محقق ہی بتا سکتا ہے سفرنامے کے ادبی صنف ہونے کے کون کون سے مدارج اور معیارات ہیں۔ تحقیق کے ذریعے اصول اور مراحل مقرر کیے جائیں کہ سفرنامہ ادب میں کس طرح سے اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

ب: نتائج وسفارشات

ایشیائی اردو سفرنامہ اپنے لحاظ سے ایک وسیع تر موضوع ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ابھی بات صرف ایشیا کے اردو سفرنامے پر ہوئی ہے۔ ایشیا میں درجنوں ممالک ہیں جن کی اپنی اپنی زبان سفرنامے لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن ان کی تفہیم مشکل ہے۔ جب تک عالمی زبان انگریزی یا پاکستانی زبان اردو میں ترجمہ نہیں ہوتے انھیں پڑھنا اور سمجھنا مشکل ہے۔ تاہم یہ ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ جہاں تک ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کی تحقیق کا تعلق ہے تو یہ منتخب سفرناموں کے تاریخی عناصر کے متوازی تحقیق ہے۔ اردو سفرنامے پر تاریخی عناصر کے حوالے سے تحقیق کرتے ہوئے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اردو میں ہندوستان اور پاکستان کی مستند تحقیق موجود ہی نہیں ہے۔ منشی ذکاءاللہ دہلوی کا تاریخ نگاری پر کام دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن انھوں نے بھی انگریزی اور اردو سفرناموں کے تاریخی مواد سے تاریخ کا پیٹ بھرا ہے۔ تاریخ اودھ از نجم الغنی میں بھی سفرنامے سے کافی حد تک مدد لی گئی ہے۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت از ہاشمی فرید آبادی کی تاریخ میں بھی زمانے کی ضرورت کے مطابق سفرنامے کے مواد کو تاریخ نگاری کے لیے شامل کیا گیا۔ مطالعہ کے دوران ہندوستان اور پاکستان میں تاریخ، تاریخ نگاری کے مرتبے سے کم درجہ پائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند انگریزی کتب اور آئین ٹالبوٹ کی تاریخِ پاکستان کا ترجمہ شامل مطالعہ رہا ہے۔ تاہم یوسف خان کمبل کے تاریخی واقعات کی مماثلت تاریخ اُودھ کے ساتھ ہو بہو پائی گئی ہے۔ پھر بھی یوسف خاں کمبل پوش نے کچھ تاریخی واقعات ایسے بیان کیے جن کا تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔

زیرِ نظر تحقیقی کام حرفِ آخر تو نہیں ہے مگر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ سفرنامے میں تاریخی عناصر موجود ہیں جو مطمعٔ نظر بن سکتے ہیں۔ منتخب ایشیائی اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر پر تحقیق اور تنقید سفرنامے میں تاریخی عناصر کے حوالے سے پہلی اینٹ ہے۔ دنیا کے ابھی تک لاتعداد سفرنامے ایسے ہیں جن پر کسی ایک ملک، خطے یا پورے براعظم کے سفرناموں پر تاریخی عناصر پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سفرنامے کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ سفرنامے کی

خدمت میں صرف ایک بندہ کی اجر اور صلے کے بغیر مصروف ہے۔ وہ عبدالحمید کھوکھر ہے۔ راول پنڈی کنٹونمنٹ کی لائبریری میں سفرنامے پر چار سے پانچ سو تک کتب موجود ہیں۔ میونسپل لائبریری راولپنڈی میں خاصی تعداد میں سفرنامے کی کتب موجود تھیں۔ لائبریری کی نئی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں کتب کی منتقلی کے دوران، لانے اور لے جانے کے وقت سیکڑوں کتب چوری ہوگئی ہیں جن کا پُرسان حال کوئی نہیں۔ نیشنل لائبریری، اسلام آباد میں سفرنامے پر نایاب قسم کی کتب موجود ہیں۔ وہاں آسانی سے آنا جانا نہیں ہوسکتا۔ جڑواں شہروں کی دیگر لائبریریوں میں بھی کتب موجود ہیں لیکن اس قدر بڑی تعداد میں نہیں ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صاحب ذوق اور صاحب ثروت احباب کے اہم کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایشیائی اردو سفرنامے میں سیاسی، سماجی، ادبی تاریخی کا ذخیرہ موجود ہے۔ زیرِ مطالعہ تمام ایشیائی ممالک کے اردو سفرنامے سے تاریخی عناصر تلاش کر لیے گئے ہیں۔ اب ایشیا کے سفرناموں کی ایک بڑی تعداد ہے جن پر کام کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ زیرِ بحث کام منتخب سفرنامے پر ہے۔ جن کے تاریخی عناصر پیش کے لیا یسے سفرناموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو کسی ادیب، شاعر، آپ بیتی نگار، سوانح نگار یا محقق نے نہیں لکھے لیکن ان سفرناموں میں بھی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور نظام تعلیم کے متعلق عناصر موجود ہیں۔

اردو سفرنامہ نہ صرف سفرنامہ ہے بلکہ معلومات کا بہت بڑا علمی اور ادبی مجموعی ہے۔ ایشیا کی تاریخ و سفرنامے کے مطالعات کے پیشِ نظر یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اردو زبان میں ایشیا کی تاریخ کا مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جنوبی ایشیا کے ممالک میں سے افغانستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال اردو بوٹان کی تاریخی کی کتب انگریزی زبان میں موجود ہیں۔ مشرقِ بعید کی تاریخی کی کتب پاکستان میں بہت دقت کے بعد اور چند ایک انٹرنیٹ کے وسیلے سے ملی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخی کتب کا مواد بھی تیس فی صد تک سفرنامے سے ماخذ ہے۔ منتخب سفرناموں پر تحقیق سے معلوم ہوا کہ اردو سفرنامہ ادبی مقام و مرتبہ اسی طرح رکھتا ہے جس طرح اردو کی دیگر اصنافِ ادب ہیں کا ہے۔

اردو سفرنامے میں تاریخی عناصر کی تلاش و تحقیق کے بعد چند ایک سفارشات پیشِ نظر ہیں۔ جامعات میں اردو سفرناموں کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی کام کرایا جائے۔ یورپ کے اردو سفرناموں میں تناظر میں؛ افریقی ممالک کے اردو سفرنامے اور تہذیب، ثقافت، سیاست اور تاریخی عناصر؛ مشرقِ وسطیٰ کے اردو سفرنامے میں معاشی اور سیاسی صورتِ حال؛ اردو سفرنامے میں مشرقِ بعید کے ممالک کی تہذیبی، ثقافتی اردو معاشی ترقی کی وجوہات کے موضوعات پر منظم تحقیقی کام کرانے کی اشد ضرورت ہے۔

موجود دور میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے ممالک کا سفر اختیار کیا جائے جن میں پہلے کسی نے سفر نہ کیا ہو یا سفر کے بعد سفرنامہ نہ لکھا ہو۔ سفر کے دوران دوسرے ملکوں کے تعلیمی نظام کو پرکھا جائے اور اس کی تفصیلات اکٹھی کی

جائیں۔تاکہ اپنے ملک میں اچھی تعلیم وتربیت کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔اس طرح دوسری ممالک کے سفر کرکے ان ممالک کی تہذیب و معاشرت کو پرکھنے کے بعد اس کے مثبت پہلو متعارف کرائے جائیں۔سفر نامہ نگار کو چاہیے کہ وہ دوسرے ممالک کی معاشی نظام کی مضبوطی کی وجوہات تلاش کرکے سفرنامے کا حصہ بنائے۔دوسرے ملکوں کی اقوام کے معاشرتی اور تہذیبی رویوں کے مثبت پہلو متعارف کرائے جائیں۔جہاں تک سفرنامے پر کام کرنے کے موضوعات اور دائرہ کار کی بات ہے تو اب بھی سفرنامے کے بہت سے گوشے اسے ہیں جن پر تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔سفرنامہ میں جغرافیائی مباحث، تاریخی عوامل، تہذیبی وثقافتی عناصر، معاشی اور تعلیمی عوامل اردو سفرنامین۔یورپ کے سفرنامے، افریقہ کے سفرنامے، آسٹریلیا کے سفرنامے، چین کے سفرنامے یا مجموعی طور پر کسی ایک براعظم کے سفرناموں پر تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔آخر پر یہ کہ سفرنامے کے تحقیقی کام میں رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا ضروری ہوا مگر ثابت قدمی کے حوصلہ پست نہیں ہونے دیا۔یہی وجہ ہے کہ ایک منفرد تحقیق کام قارین و محققین کے پیش نظر ہے۔

کتابیات

۱۔ ابن انشا، چلتے ہو تو چین کو چلیے، لاہور اکیڈمی، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۶۷ء، اور پانزدہم، ۱۹۸۹ء

۲۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء

۳۔ ابوالحسان قادری، مکمل تاریخ وھابیہ، قادری یونانی دواخانہ سنجھورو، ۱۹۷۶ء

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، (مرتبہ)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۵۔ ابوالکلام آزاد، مولانا، ہندو آزاد ہو گیا، نعیم اللہ ملک، مترجم، نشریات، لاہور، ۲۰۱۰ء

۶۔ احمد دہلوی، سید، مولوی، (مرتب) فرہنگ آصفیہ، (جلد دوم) لاہور، اردو بورڈ گلبرگ ۱۹۷۷ء

۷۔ اشفاق احمد، سفرِ مینا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء

۸۔ امجد اسلام امجد، چلو جاپان چلتے ہیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۹۔ امجد اسلام امجد، ریشم ریشم، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۰۔ انتظار حسین، نئے شہر پرانی بستیاں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۱۔ انتظار حسین، زمین اور فلک اور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۰۹ء

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء

۱۳۔ الزبیر، ''سفرنامے''، سہ ماہی ۹۸۔۱۹۹۷ء، سفرنامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶، ۳۷، مدیر: شاہد حسن رضوی اردو اکادمی بہاولپور، ۱۹۹۸ء

۱۴۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخِ پاکستان، طاہر منصور فارق، مترجم، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۵۔ اے حمید، رنگون سے فرار، غالب پبلیشرز، لاہور: ۱۹۹۶ء۔

۱۶۔ ایم ایم سیروائی، تقسیم ہند حقیقت یا افسانہ، ڈاکٹر صفدر محمود، ترجمہ، جنگ پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۷۔ ای مارسڈن، تاریخِ ہند، ترجمہ، لالہ جیارام/خلیفہ عماد الدین، بک ہوم، لاہور ۲۰۰۵ء

۱۸۔ بنیاد، شمارہ، ۲۰۱۴ء، جلد نمبر ۵، لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور، ۲۰۱۴ء

۱۹۔ بنیاد، شمارہ، ۲۰۱۵ء، جلد ۶، لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور ۲۰۱۵ء

۲۰۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، حق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

۲۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

۲۲۔ جان لوئیس برکھاٹ، سفر نامہ حجاز، مرتب، مولوی شبیر حسین، مطبوعہ، تاج پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۴۴ء
۲۳۔ جواہر لال نہر، میری کہانی، تخلیقات، لاہور، س ن
۲۴۔ جواہر لال نہرو، پنڈت، تاریخ عالم پر ایک نظر، جلد سوئم، ترجمہ تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء
۲۵۔ جواہر لال نہرو، پنڈت، تاریخ عالم پر ایک نظر، ترجمہ، طاہر منصور فاروقی، جلد دوم تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۱ء
۲۶۔ جواہر لال نہرو، پنڈت، تاریخ عالم پر ایک نظر، ترجمہ، طاہر منصور فاروقی، جلد سوئم، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۱ء
۲۷۔ حارث بشیر، آر ایس ایس، کوسمس بکس، نیو دہلی، بھارت، اشاعتِ سوم ۲۰۰۹ء
۲۸۔ حامد بیگ، مرزا، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اورینٹ پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء
۲۹۔ حسن نظامی، خواجہ، قدیم و جدید افغانستان کے دو سفر نامے، خواجہ برقی پریس، دہلی، ۱۹۳۳ء
۳۰۔ حسین احمد مدنی، مولانا، اسیرانِ مالٹا، سید محمد میاں، مرتب، جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
۳۱۔ حمید اللہ، صاحبزادہ، پروفیسر، مختصر تاریخِ افغانستان، غزنوی پبلشرز، جناح روڈ، کوئٹہ، ۲۰۰۸ء
۳۲۔ سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفرنامہ، (تنقید و تجزیہ) عرشی پبلشرز، دہلی، ۲۰۱۲ء
۳۳۔ سعید احمد، مولانا، سفر نامہ حجاز، طارق اکیڈمی فیصل آباد، ۲۰۰۴ء
۳۴۔ سلمان ندوی، سید، سیر افغانستان، نفیس اکیڈمی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۵ء
۳۵۔ شفیق الرحمٰن، دجلہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
۳۶۔ شورش کاشمیری، شب جائے کہ من بودم، مطبوعاتِ چٹان، لاہور، ۲۰۱۰ء
۳۷۔ شہاب الدین، سید، دسنوی فہمیدہ بیگم، (مرتبین) اردو جامع اللغات، جہلم، بک کارنر شوروم، س ن۔
۳۸۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، دار التحقیق برائے علم و دانش، کراچی، ۱۹۷۷ء
۳۹۔ صدیق سالک، ہماں یاراں دوزخ، لاہور، ۱۹۷۴ء، Urdu4U.com
۴۰۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، (جلد اوّل و دوم) نفیس اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۳ء
۴۱۔ عبدالرحمٰن امرتسری، سیاحتِ ہند، مطبع سٹیم رفاہ عام، لاہور ۱۹۰۹ء،
۴۲۔ عبداللہ لغاری، مولانا، مولانا عبید اللہ سندھی کی سر گزشتِ کابل، قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ و ثقافت اسلام آباد، ۱۹۸۰ء
۴۲۔ عشرت علی صدیقی، ممالکِ اسلامیہ کی سیاست، مکتبہ جامعہ، دہلی، لاہور، ۱۹۴۰ء
۴۳۔ علی سفیان آفاقی، دورانِ سفر، سارنگ، لاہور، ۱۹۹۲ء
۴۴۔ غلام رسول مہر، سفر نامہ حجاز، مرتب، ابو سلیمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر، عبدالحمید کھوکھر لائبریری، گجرانوالہ، ۲۰۰۹ء

۴۵۔ غوث علی شاہ، تذکرہ غوثیہ، مرتب، مولانا گل حسن شاہ، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۰ء

۴۶۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نصرت پبلشر دہلی ۱۹۸۷ء

۴۷۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، ترجمہ، احمد سلیم، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۲ء

۴۸۔ کریم خاں، نواب، سیاحت نامہ، مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی ادارہ ادب وتنقید، لاہور، ۱۹۸۲ء

۴۹۔ محمد آدم خان، منشی، سفرنامہ افغانستان حالاتِ سفر ہندستان، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۰۹ء

۵۰۔ محمد اجمل نیازی، مندر میں محراب، پاکستان بکس، لاہور، ۱۹۸۷ء

۵۱۔ محمد اختر ممونکا، سفر تین در ویشوں کا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

۵۲۔ محمد جعفر تھانیسری، مولانا، کالا پانی، مرحوم، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۲ھ

۵۳۔ محمد حسین آزاد، وسط ایشیا کی سیاحت، مرتب، آغا محمد اشرف، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۹ء

۵۴۔ محمد حیات، تاریخِ وسط ایشیا، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، س ن

۵۵۔ محمد خالد، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۱۱ء

۵۶۔ محمد حنیف ندوی، مولانا، افکارِ ابن اخلدون، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور: ۱۹۹۵ء۔

۵۷۔ محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، غالب پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء

۵۸۔ محمد ذکاء اللہ منشی، تاریخ ہندوستان، جلد ششم، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۱۷ء

۵۹۔ محمد سعید، حکیم، ماہ وروز، روزنامچہ سفرروس، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۰ء

۶۰۔ محمد سعید، حکیم، ایک مسافر چار ملک، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۱ء

۶۱۔ محمد سعید، حکیم، ماوراء البحار، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۰ء

۶۲۔ محمد سعید، حکیم، کوریا کہانی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۰ء

۶۳۔ محمد صادق علی گل، ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی ہومر سے ٹائن بی تک، ایمپوریم پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۶۴۔ محمد عبدالقیوم، مفتی، تاریخ نجد و حجاز، رضا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۸ھ

۶۵۔ محمد علی التھانوی علامہ، کشافِ اصطلاحات الفنون و العلوم علی دحروج (مرتب) (جز واول) مکتبہ لبنان ناشرون، ۱۹۹۶ء

۶۶۔ محمد میاں، سید، اسیرانِ مالٹا، مرتبہ، جمعیۃ پبلی کشینز، لاہور، ۱۹۹۹ء

۶۷۔ محمود الحسن، مولانا، سفرنامہ اسیر مالٹا، مولانا حسین احمد مدنی، مرتب، مکی دار الکتب، لاہور، ۱۹۹۴ء

۶۸۔ محمود نظامی، نظر نامہ، گوشۂ ادب، لاہور،۱۹۶۳ء

۶۹۔ مختار حسین فاروقی، انجینئر، جنوبی ایشیا میں مسلم بیداری کے سو سال، ۱۹۱۰ء تا ۲۰۱۰ء، قرآن اکیڈمی، جھنگ، ۲۰۱۲ء

۷۰۔ مرتضیٰ انجم، بیسویں صدی کے اہم واقعات، یو پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء

۷۱۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۴ء

۷۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۴ء

۷۳۔ منشی اسماعیل، تاریخ جدید، مرتب، ڈاکٹر نجیبہ عارف، ترجمہ، ڈاکٹر جواد ہمدانی، مشمولہ، بنیاد، جلد ۵، شمارہ ۲۰۱۴، ۲۰۱۴ء

۷۴۔ میر شیر علی افسوس، آرائشِ محفل، مجلسِ ترقی ادب اردو، لاہور، ۱۹۶۳ء،

۷۵۔ وحید الدین، خان مولانا، سفر نامہ: غیر ملکی اسفار، پبلیشرز اسلامک سنٹر، ۱۹۹۲ء

۷۶۔ نجم الغنی، مولانا، تاریخ اودھ، جلد ۲، منشی نول کشور، اودھ، ۱۹۱۹ء

۷۷۔ نجم الغنی، مولانا، تاریخ اودھ، جلد ۳، منشی نول کشور، اودھ، ۱۹۱۹ء

۷۸۔ نجم الغنی، مولانا، تاریخ اودھ، جلد ۴، منشی نول کشور، اودھ، ۱۹۱۹ء

۷۹۔ نواب کریم خاں، سیاحت نامہ، مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی ادارہ ادب وتنقید، اہور، ۱۹۸۲ء

۸۰۔ وحید الدین خان، مولانا، سفر نامہ: غیر ملکی اسفار، پبلیشرز اسلامک سنٹر، ۱۹۹۲ء

۸۱۔ ولیم ایل لینگر، انسائیکلوپیڈیا تاریخِ عالم، تالیف، غلام رسول مہر، مترجم، جلد اوّل، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۸۲۔ ولیم ایل لنگر، انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم، مولف، مولانا غلام رسول مہر، مترجم، جلد سوم، الوقار پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۸۳۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد اوّل، انجمنِ ترقی اردو، کراچی، اشاعت سوم ۲۰۰۳ء

۸۴۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، تاریخِ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت سوم ۲۰۰۳ء

۸۵۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، بک کارنر پبلشرز اینڈ بک سیلرز، جہلم، ۲۰۱۶ء

۸۶۔ یوسف خاں کمبل پوش، سیرِ ملک اُودھ، مرتب، ڈاکٹر نجیبہ عارف، مشمولہ، بنیاد، جلد ۶، شمارہ، ۲۰۱۵، ۲۰۱۵ء

۸۷۔ Advanavced Learner's Dictionary, Oxford University press Great clareden

street Oxford,(unknown date)

۸۸۔ A Frequency dictionary of Arabic Routledge Taylor and Francis Group, Landon and New York 2011

۸۹۔ Hedley V. Cooke, *Israel A Blessing and Curse*, Stevens and Sons Limited, London 1960

۹۰۔ Kenneth Scott LaTourette, *A History of the Far East*, 4th Ad, The Macmillan company Ltd. London, 1969.

۹۱۔ Maung Htin Aung, A History of Burma, Columbia University Press New York, and London, 1867

۹۲۔ Robin Jaffrey, *Asia the Winning the independence,* The Macmillan Press, London,1981

۹۳۔ S Mahamud Ali, *Understanding Bangladesh,* Hurst & Company, London,2010.

۹۴۔ S.M.Imamddin, A Modren History of The Middle East and North Afriqa, Vo.1,Najmahsons Dacca,1960

۹۵۔ Thames and Hunson, *China Lois Mitchison*, Thames and Hunson ltd, London, 1966.

۹۶۔ THE HISTORY OF INDIA, THE EAELIEST PERIOD TO THE CLOSE OF LORD DALHOUSIE'S ADMINISTRATION. JOHN CLAKK MARSHMAN. VOL.II.LONDON: LONGMANS, GREEN, READER,1867

۹۷۔ Vincent A.Smith,The Oxford History of India From the Earliest Times to The End of 1911, Oxford Clarendon,1919

۹۸۔ Webster's Comprehensive Dictionary, Tredent press International(USA)1996

Internet Sitesانٹرنیٹ سائٹس

۹۹۔ https//:en.wikipedia.org›wiki›List_of_continent

۱۰۰۔ https://www. tripsavvy.com›Destinations›Asia

۱۰۱۔ https:// www. ldoceonline.com/dictionary/ travelogue

۱۰۲۔ https://www.lexico.com/definition/travelogue

۱۰۳۔ http//www.collins dictionary.com/dictionary/english/travelogue

۱۰۴۔ https://ur.wikipedia.org/wiki/

۱۰۵۔ Offline Urdu Lughat,Urdu to Urdu Dicyionary,intrernet

۱۰۶۔ https://www.history.com/this-day-in-history/

۱۰۷۔ https://www.daily-sunils//Poet-Nazrul

۱۰۸۔ https://irak.pk/tag/iran-iraq-war/

۱۰۹۔ https://reliefweb.int/report/afghanistan/a

۱۱۰۔ https://en.wikipedia.org/wiki/A._A._K._Niazi

CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD